ماہنامہ پیام ادب

ادارۂ تحریر

سید عبدالوہاب

(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری

ادارۂ اشاعت اردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

مئی | رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸ | جلد (۲)

سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر (۳)

مندرجات

چندہ سالانہ چھ روپے کلدار | فی پرچہ آٹھ آنے کلدار

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدر آباد دکن

نظرات

محمد اقبال سلیم گاہندری

ماہ اپریل میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس جبلپور میں منعقد ہوا، اور حسب دستور مختلف شعبوں میں تقاریر وخطبات کا مظاہرہ ہوا۔ ہم اس قدیم ادارہ سے مایوس نہیں ہیں، ہمیں اب بھی اس سے بڑی امیدیں ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ اس میں کچھ نئے کام کرنے والوں کا اضافہ کیا جائے، بزرگان جہاں دیدہ کے تجربات اور ان کی مہارت ہمارے لئے شمع راہ تو بن سکتی ہے لیکن یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم مضبوط پیروں کی توانائی سے بے نیاز ہو کر تعلیمی مہم کو سر کر سکیں۔ ضرورت ہے کہ کچھ نئے کام کرنے والے ہمدرد و پر عزم جوانوں کو ان بزرگوں کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع دیا جائے تجاویز مرتب فرمانا یقیناً بڑا اہم کام ہے، ہمیں انکار نہیں۔ مگر ان تجاویز کو رو بہ عمل لانے کے لئے پر عزم دل اور توانا جسم کی ضرورت ہے۔

انگریزوں نے ڈیڑھ سو سال تک مسلسل کوشش کی کہ ہندوستان کی عام زبان انگریزی ہو جائے مگر انھیں اس میں بری طرح ناکامی ہوئی اور ۱۹۴۱ء کی رپورٹ مردم شماری سے تو ظاہر ہے کہ اس طویل عرصہ کی کوشش کا ثمرہ صرف پونے دو فیصد انگریزی دان ہیں۔ اور بس ظاہر ہے کہ پونے دو فیصد آبادی کا انگریزی حروف سے واقف ہونا، انگریزی مقصد تعلیم کا فقدان ہے۔

انگریزی کی اس ناکامی کے بعد اب ہمیں خود اپنے ملک کے لئے یہ سوچنا باقی رہ جاتا ہے کہ عام زبان کیا ہو۔ غالباً اس بارے میں اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہا ہے کہ وہ زبان وہی ہو جو شمالی ہند (یو۔پی، اور بہار) میں ہر جگہ اور ہندوستان بھر کے شہروں اور بڑے بڑے قصبات میں بولی جاتی ہے۔ جھگڑا صرف نام کا ہے، بعض حضرات اسے ہندی اور بعض اردو کہتے ہیں۔ گاندھی جی نے اسے ہندی، ہندوستانی کا نام دیا ہے اور تعریف یہ کی ہے کہ یہ زبان اردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے۔ بہر حال یہی زبان ہے جو ہندوستان کی عام زبان بننے کا حق رکھتی ہے اور اس کے لئے اردو یا ہندی، یا دونوں خط مستعمل ہیں۔

آج کل سپاہیوں کے لئے جو رسائل طبع ہو رہے ہیں ان میں سے بعض رومن رسم الخط میں چھاپے جاتے ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ اردو اور ہندی دونوں خطوط کو چھوڑ کر ہندوستان کی عام زبان کا رومن خط اختیار کر لیا جائے۔ ہمارے بعض ہندوستانی بھائی بھی اس کوشش میں پیش پیش ہیں۔ یہ نقالی و طوطی صفت حضرات اتنا نہیں غور کرتے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان کو عام زبان کا مقام دینے میں جو ناکامی ہوئی ہے، رومن خط کی ترویج اس ناکامی کو مبدل بہ کامیابی کرنے کی ایک ترکیب ہے۔ اور تسلی کے لئے یہ "گڑ کا مالیدہ" بھی کافی سمجھا رہا ہے کہ زبان نہ بدل سکے تو کم از کم خط بدلنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

ڈاکٹر محمد حامد علی خاں صاحب وظیفہ یاب افسر صحت عامہ نے اپنی تمام عمر کا اندوختہ جو نو لاکھ روپیہ کی خطیر رقم ہے۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اتنا بڑا ایثار ہے جس کی نظیر بہت ہی کم نظر آتی ہے۔ پچھلے دنوں شہر حیدر آباد میں ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرنے کے لئے انجمن اشاعت تعلیم نے ایک جلسۂ عام معزز صدر المہام مالیہ کی صدارت میں

منعقد کیا تھا۔ جلسہ میں مختلف مقررین نے اپنے اپنے تاثرات بیان کئے۔ اِس جلسہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ وقف کسی فوری جذبہ سے متاثر ہو کر نہیں کیا، اور نہ یہ دولت ڈاکٹر صاحب کو اتفاقی طور پر کسی تجارتی منافعہ کے ذریعہ مل گئی تھی بلکہ وہ اپنے زمانہ طالب علمی سے اِس مقصد کے لئے اپنی آمدنی کا ایک حصہ انتہائی کفایت شعاری کے ساتھ جمع کرتے رہے ہیں۔ اور اب اپنی پیرانہ سالی میں اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ اِس رقم کو وقف کر کے قوم کے ثقہ حضرات کو امین بنادیں۔ رقم نو لاکھ ہوتی یا نو روپیہ، رقم کی کمی یا زیادتی اتنی اہم نہیں جتنا ڈاکٹر صاحب کا ایک مدت دراز تک جو غالباً چالیس پنتالیس سال کے طویل و عریض اور سرد و گرم زمانہ پر مشتمل تھی ایک مقصد اور بہترین مقصد کے لئے مستقل مزاجی کے ساتھ کوشاں رہنا، ہم سب کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

زندگی بھر میں کیسے کیسے وقت آتے ہیں، کیا کیا نہ ضروریات و حوادث پیش آتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا خلوص اور اس اخلاص پر یہ استقلال دیکھئے کہ کسی وقت اُنھوں نے اپنے مقصد کو نہیں چھوڑا۔ بچوں کی شادیاں کیں، بیماریاں ہوئیں، مکان بنائے، لیکن ہر جگہ کفایت کے ساتھ عمل ہوتا رہا تاکہ کچھ نہ کچھ اس مقصد عظیم کے لئے پس انداز ہو سکے۔

اُردو زبان کے قدیم کرمفرما جناب پنڈت سمپورنانندجی سابق کانگریسی وزیر یوپی پچھلے ماہ حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ اُنھوں نے ایک تقریر کے دوران میں بڑی معقول بات کہی۔ فرماتے ہیں:۔

اِس ملک کے عوام بالخصوص ہندو اور مسلمان مشترکہ طور پر ایک زبان کے ارتقا کی کوشش کریں خواہ اُس کا نام کچھ ہی ہو لیکن یہ اِس ملک کے عوام کا لحاظ کرتے ہوئے ایسی ہو کہ سب اسے سمجھ سکیں اور سب کیلئے یہ آسان ہو"

اگرچہ اس میں لفظ "کچھ ہی ہو" پنڈت جی کی روحانی تکلیف کو کسی حد تک ظاہر کر رہا ہے لیکن ہمیں حیرت ہوتی اگر اُردو کا نام لیکر پنڈت کچھ گل افشانی نہ فرماتے۔ بھلا پنڈت جی کہیں چوکتے ہیں اپنی تقریر میں اس کے بعد ہی دو اعتراضات اُنھوں نے ہم سب حیدرآبادیوں پر جڑ دیئے۔

(۱) آج کل جس قسم کی اُردو تعلیم یافتہ لوگ بولتے ہیں اور لکھتے ہیں اس کو عوام نہیں بلکہ بعض مقامات کے مسلمان بھی اس کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔

(۲) جامعہ عثمانیہ میں تلنگی، مرہٹی اور کنڑی کی بجائے اُردو کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

ان اعتراضوں کے متعلق ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ پنڈت جی شاید جانتے ہوں کہ دنیا میں کسی جگہ کی عوامی بولی، اور علمی زبان بالکل یکساں ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم ہے۔ اور — دنیا کی کسی ایک جامعہ میں چار زبانیں کسطرح ذریعہ تعلیم بنائی جائیں یہ بھی وہ معمہ ہے جسے کوئی کانگریسی وزیر ہی حل کر سکتا ہے۔ ہمارے بس کی بات نہیں۔

اِس تقریر میں پنڈت جی نے ایک اعتراض مسلمانوں پر کیا ہے کہ وہ یوم کراجیت میں کیوں شریک نہیں ہوتے۔ بڑے بڑے مسلمان، اس کا جواب دیں، ہمیں مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل نہیں۔ دوسرا دعویٰ یہ کیا ہے کہ تلنگی کنڑی اور ملیالم سنسکرت سے بنی ہوئی زبانیں ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ تلنگی اور ملیالم سے سنسکرت بنی تھی یا سنسکرت سے یہ زبانیں بنی ہیں۔ ماہرین کی رائے تو یہ ہے کہ سنسکرت کہیں، کسی زمانہ میں بھی عام بولی نہ تھی بلکہ ہندوستان کی اِن ہی قدیم زبانوں سے الفاظ لے کر ایک فرضی مقدس زبان بنائی گئی تھی جو ادب عالیہ اور مذہب و فلسفہ کے لئے مستعمل تھی۔

بہرحال؛ ہمیں اِن اُمور سے متعلق کچھ کہنا نہیں۔ بات میں بات نکل آئی۔ اِس لئے ذکر کر دیا گیا۔

ماہر القادری

عقیدت کے پھول

صدقے ترے آئینۂ ہستی کو نکھارا
قربان ترے گیسوئے فطرت کو سنوارا

اللہ رے! تری شوکت و اجلال کا عالم
قدموں پہ ترے لوٹ گئی سطوتِ دارا

آتے ہی ترے دوڑ گئی خنکئی توحید
تھمتا ہی نہ تھا کفر کا چڑھتا ہوا پارا

تو نے ہی محبّت کے سفینہ کو ترایا
ملتا ہی نہ تھا حسن کے دریا کا کنارا

تاریخ کے صفحات کو بھی ناز ہے جس پر
اک گرتی ہوئی قوم کو اس درجہ ابھارا

چلتی ہی رہے گی ترے احکام کی کشتی
بہتا ہی رہے گا ترے الطاف کا دھارا

اُس وقت کہ مٹھی میں تری سارا عرب تھا
کہتے ہیں ترا نانِ جویں پہ تھا گزارا

اُس وقت بھی تھی تیری نبوت کی خدائی
آدمؑ کی بھی تقدیر کا چمکا نہ تھا تارا

اب بھی تری عظمت پہ کٹا دیتے ہیں سر کو
اب بھی ہے ترا نام ہمیں جان سے پیارا

اب بھی ہیں تری نام کی عظمت کے فدائی
بغداد، فلسطین، سمرقند، بخارا

اے وہ کہ ترے ذکر میں تسکین دل و جان
اے وہ کہ تری ذاتِ دو عالم کا سہارا

اے وہ کہ ترے نام سے ٹلتی ہے مصیبت
ماہر کی چشمِ عنایت کا اشارا

صلاح الدین اَحمد

کہنے کی باتیں

"ادبی دنیا" کے ایڈیٹر نے جو نیائے اَدب میں اپنی بلاغ نظری اور ژرف نگاہی کے لئے کافی شہرت رکھتے ہیں اس مضمون میں خواجہ احمد عباس کے ایک افسانہ "بارہ گھنٹے" پر اپنی جوہر شناس نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ سنگپاروں کو یہ دہوکہ باز کاروباری کس طرح جوہر بتا کر پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں. خواجہ احمد عباس ترقی پسند اَدیب ہیں۔ اور ترقی پسندی کا مفہوم چونکہ صرف اسی قدر ہے کہ جنسی بے راہ روی اور شہوانی نراج کی تبلیغ واشاعت کی جائے اور اس بھونڈے پن سے کی جائے کہ بڑے سے بڑا سیاہ کار بھی شرما جائے. خواجہ صاحب بھی اسی مقصد کے لئے لکھتے ہیں۔

صلاح الدین صاحب نے ان کی اِس اشتہار بازی کو اچھی طرح واضح کیا ہے ۔ "اَدارہ"

ہمارے اَفسانہ نِگاروں میں جتنے اچھے لکھنے والے آج آپ کو نظر آتے ہیں، اُن میں سے بیشتر "ترقی پسندی" کا خوشنما لیبل اِیجاد ہونے سے پہلے بھی لکھا کرتے تھے. اور ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ اُن کے فن پر نام نہاد "ترقی پسند" مقاصد اثر انداز نہیں ہوئے. جو موضوعات آج سے دس برس پہلے اُن کے سامنے تھے وہ آج بھی موجود ہیں۔ اور جس داخلی تحریک سے مجبور ہو کر وہ پہلے قلم اُٹھاتے تھے، وہ آج بھی اُنہیں بے چین کر سکتی ہے اور کرتی رہتی ہے۔ لیکن آپ کو اُن میں ملے جُلے بعض ایسے لوگ بھی نظر آئیں گے، جنھوں نے فن کو فن کا مقدس مرتبہ نہیں دیا۔ اور اُس کی قربان گاہ پر کوئی بھینٹ نہیں چڑھائی۔ اُنھوں نے افسانہ نگاری کو اخبار نویسی کی طرح چند مقاصد کے نشر کا ایک ذریعہ قرار دیا اور جس طرح اُن سے بن پڑا اُسے اِستعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا. ان لوگوں میں خواجہ احمد عباس کا نام نامی ایک اِمتیازی درجہ رکھتا ہے۔

حال ہی میں اخبار "معنور" بمبئی کے ماہوار ایڈیشن میں آپ کا ایک ڈراما اور ایک افسانہ چھپا ہے۔ ڈراما تو خیر اپنی اِنتہائی ناپختگی اور اشتہاری کیفیت کے باعث اِس قابل نہیں کہ اس کا نوٹس لیا جائے. لیکن افسانہ جس کا نام "بارہ گھنٹے" ہے اپنی بعض خصوصیات کے اِعتبار سے خاص طور پر قابل توجہ ہے. یہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں "ترقی پسندی" اور کمیونزم کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور وہ حضرات جو اپنے عقائد کے لحاظ سے کمیونسٹ واقع ہوئے ہیں، فنی تخلیقات کو بھی اپنے مخصوص مقاصد کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں. خواجہ احمد عباس، جہاں تک ہمیں معلوم ہے۔ ایک بڑے جیتے جاگتے کمیونسٹ ہیں اور اُن کی اکثر تحریروں اور "فن پاروں" پر ایک گہرا اِشتراکی رنگ چڑھا رہتا ہے۔ اُن کی موجودہ تخلیق کا ہیرو بھی ایک اِنقلاب پسند نوجوان ہے ۔ "کامریڈ وجے سنگھ" جو سولہ برس کے بعد (یاد رہے کہ عمر قید بھی چودہ برس سے زائد نہیں ہوتی اور وہ بھی کٹ کٹا کر دس گیارہ برس رہ جاتی ہے) جیل سے رہا ہو کر آیا ہے، اور پارٹی کے صدر مقام میں پہنچنے سے پہلے پارٹی کے سکریٹری کی ہدایت کے مطابق راستے میں ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر اُتر جاتا ہے. جہاں پارٹی کی ایک خاتون ممبر بنیا اُس کی "میزبانی" کے فرائض انجام دیتی ہے. سکریٹری صاحب کو خدشہ ہے کہ وجے سنگھ کو صدر مقام پر پہنچتے ہی

پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ اِس لئے وہ بینا کو لکھتے ہیں کہ "ہم چاہتے ہیں کہ دوبارہ جیل خانے سے پہلے وہ کم از کم بارہ گھنٹے تو آزاد رہے۔" اور اُس کے بعد رات کے ان بارہ گھنٹوں کی سرگذشت شروع ہوتی ہے جو دراصل کہانی کی جان ہے۔

ہم نے جب تک یہ افسانہ نہیں پڑھا تھا ہم اُن لوگوں کی بات پر اِعتبار نہیں کرتے تھے۔ جو کہا کرتے ہیں کہ ہمارے بعض "ترقی پسند" دوست عورت کی عصمت اور سوسائٹی میں اس کی قدر کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن یہ افسانہ پڑھ کر جو بجائے خود پراپیگنڈے کا ایک شاہکار ہے، ہم بادلِ ناخواستہ اپنی رائے پر نظرِ ثانی کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔

فن برائے فن کے اُصول کا رس ایک بڑی جیت یہ ہے کہ فنکار کسی چیز کی تبلیغ نہیں کرتا۔ وہ زندگی کو جس طرح دیکھتا ہے، اس طرح پیش کر دیتا ہے۔ لیکن جس فن کے ہمارے "ترقی پسند" دوست قائل ہیں وہ فن "برائے زندگی" ہے اور اپنے اندر ایک زبردست تبلیغی مقصد رکھتا ہے۔ اِس لئے ان افسانوں میں جو محض فنی نقطۂ نگاہ سے لکھے جائیں، اور اُن میں، جو کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھے جائیں، ایک بہت بڑا فرق یہ پڑ جاتا ہے کہ افسانے کے "پیغام" کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والے پر عائد ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ فن کو ہر قسم کی تبلیغ و اشاعت سے پاک رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارے اِصلاح پسند دوست ایک طرف اور ترقی پسند احباب دوسری جانب اَسپ تازی سے گدھے کا کام لینا چاہتے ہیں اور اپنے اپنے بوجھ اِس طرح اس پر لادتے چلے جاتے ہیں کہ حیرت ہے کہ یہ اب تک زندہ کیونکر ہے۔ گر یہ بھی کوئی دن کی بات ہے، ہمیں صاف نظر آ رہا ہے کہ یا تو یہ گدھا نہیں رہے گا یا خود لادنے والے ختم ہو جائیں گے۔

ہم تو سچی بات ہے، فن میں اُن رجحانات کے بھی مخالف ہیں جنہیں عام طور پر اِصلاحی کہا جاتا ہے۔ ہم ہرگز اُس تخلیق کو فنی تخلیق نہیں کہیں گے جو محض کسی معاشرتی یا اخلاقی نقطہ نظر سے معرضِ وجود میں لائی گئی ہو، چہ جائیکہ ایسی تحریروں کو فن میں جگہ دیجائے جو صریحاً تخریبی عناصر کی حامل ہوں۔ اگر آپ سوسائٹی کے جسم کے پھوڑے ہمیں دکھانا چاہتے ہیں تو شوق سے دکھایئے۔ جب تک آپ کے دکھانے کا انداز فنکارانہ ہے۔ کسی کو یارا نہیں کہ وہ آپ پر حرف گیری کر سکے۔ لیکن اگر آپ سوسائٹی کے چنگے بھلے جسم میں خیالی پھوڑے پیدا کر کے اُن پھوڑوں کے فوائد کا پراپیگنڈا کرتے ہیں تو ہم میں سے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ آپ کو فنکاروں کی محفل میں آنے سے روک دے اور اگر آپ کسی طرح گھس آئے ہیں تو آپ کو دروازے کا راستہ دکھا دے۔

زیرِ نظر افسانے کے مصنف نے اپنے نظریئے کو صاف صاف پیش کرنے سے پیشتر اپنا راستہ آہستہ آہستہ یوں صاف کیا ہے:۔

اِن حالات میں ایک غیر مرد کا اکیلے مکان میں اُس کے ساتھ رات گذارنا ...... لوگ کیا کہیں گے ..... قدرت نے از خود اس کے بدن میں ایک عجیب سی گدگدی، ایک عجیب سی جھجھن ایک میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا تھا (الحق) وہ جانتی تھی کہ اس کی ایک ہی دوا ہے مگر شادی سے پہلے اِس دوا کی خوراک پینا، یہ بھی تو اتنا آسان نہ تھا!"

"آسان" کی بھی خوب رہی، مگر ذرا آگے چلئے:۔

"بینا نے پارٹی کے دفتر میں لگی ہوئی دبے سنگھ کی تصویر دیکھی تھی شاندار وجیہہ جوان چوڑا چکلا سینہ اونچی پیشانی۔ خوبصورت آنکھیں۔ ناممکن تھا کہ کوئی ان آنکھوں کو دیکھے اور اُن کا شکار نہ ہو جائے بینا نے ان آنکھوں سے اِنقلاب کا سبق سیکھا تھا (شاباش) اپنے اُصولوں کے لئے مرمٹنے کی تمنا اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی حسرت سب کچھ جان۔ مال

عزت۔ ہاں عزت بھی (آدم برسرِ مطلب!) ان میں ایک حیوانی کشش بھی تھی۔ ایک جنون انگیز شرارہ۔ ممنوعہ لذتوں کا ایک اِشارہ۔ اُس دلفریب دنیا کی ایک جھلک جس کا دروازہ سماج نے بینا جیسی غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے بند کر رکھا تھا۔ مگر یہ دروازہ توڑا بھی جا سکتا ہے۔ بینا اپنی پارٹی ہی میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی جنہوں نے اس خیالی دروازے کو توڑ کر آزاد جنسی تعلقات کی سرزمین میں قدم رکھا تھا۔ کیا آج کی رات وہ بھی وجے سنگھ کی مدد سے . . . . . ؟" (جی ہاں کیوں نہیں)۔

اور اِس طرح اپنی زمین کو ہموار کرتا ہوا، افسانہ نگار بڑھتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جب بینا ایک کمرے میں اور وجے سنگھ جو سولہ برس کی قید کاٹنے کے بعد شکل وصورت کے لحاظ سے بہت کچھ بدل چکا ہے، دوسرے کمرے میں بظاہر سو رہے ہیں لیکن دراصل ایک جنسی اضطراب میں مبتلا ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وجے سنگھ کے ایک داڑھی بھی اُگ آئی ہے جو آدھی کالی ہے اور آدھی سفید۔ اور اُس کے دانت بھی زرد ہیں اور ناخن بھی میل سے بھرپور ہیں (ہمارے ایک دوست کے قول کے مطابق بعض "ترقی پسند" حضرات جسم کی ظاہری صفائی کا ایسا ہی معیار اپنے سامنے رکھتے ہیں) اور یہ بھی سچ ہے کہ اس نے بینا کے کہنے کے باوجود اپنی طرف کی چٹخنی نہیں لگائی اور بینا کی طرف تو چٹخنی ہی نہیں اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ بینا ابھی ابھی اُسے بولتا سینما دکھا کر لائی ہے۔ جس نے اس کے سوئے ہوئے جذبات بیدار کر دیئے ہیں۔ مگر

"بینا کے حساس ہمدرد دماغ نے اسی صورت حال کو دوسری طرح یوں پیش کیا "بے شک وجے سنگھ قبل از وقت بڈھا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرے پر خوفناک ڈاڑھی ہے۔ اس کی پیشانی پر جھریاں ہیں اُس کے منہ سے زرد اور گندے دانت جھانک رہے ہیں۔ مگر کیوں؟ بینا؟ سوچ۔ سولہ برس ہوئے یہی وجے سنگھ ایک خوبصورت کڑیل جوان تھا . . . . . . وہ کیوں اپنی جوانی، اپنا حسن اپنی تندرستی کھو بیٹھا؟ اِنقلاب کے لئے۔ بینا اِنقلاب کے لئے اسی اِنقلاب کے لئے جس کی خاطر تو جان دینے کو تیار ہے مگر تو تو باتیں بناتی ہے۔ اس نے تو کر دکھایا . . . . . اور تو! تیرا دل اِتنا چھوٹا ہے کہ آج تو اس وجے سنگھ کی داڑھی۔ اس کی جھرّیوں اور اس کی پھنسیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے ــــ لعنت ہے تجھ پر . . . . . وہ حساس ہے۔ اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ تجھے چھیڑنے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اگر تو اس کے کمرے میں نہیں جائے گی۔ تو وہ رات بھر ٹہل کر گذار دیگا۔ اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر پھر جیل چلا جائیگا ــــ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہیں کر سکے گی اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی . . . . . وجے سنگھ اپنی پیاس کو ساتھ لئے واپس چلا جائیگا۔ وہ جس نے اپنی جان قوم کی آزادی اور انقلاب کے لئے قربان کر دی تھی۔ اس کے واسطے ایک عورت چند گھنٹے کے لئے اپنا جسم بھی دینے کو تیار نہ ہو گی ــــ نہیں وہ ایسا نہ ہونے دے گی۔ اُس نے اپنی جان انقلاب کے لئے وقف کر دی تھی۔ اپنی جان اور اپنا جسم اور اپنی عصمت بھی۔ وجے سنگھ کی قربانیوں کے سامنے اس کے حقیر جسم کی کیا وقعت تھی۔ اس کے بدن میں وجے سنگھ کو چند لمحوں کے لئے ہی سہی، پھولوں کی بہار، بچوں کی آواز۔ ماں کی ممتا۔ موسیقی کی جھنکار۔ غروب آفتاب کی رنگینی برسات کی رم جھم سب کچھ مِل جائیگا۔ اور آئندہ زمانے میں . . . . . جب وہ جیل کی سختیوں سے تنگ آکر دنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگے گا تو اُن سے چند گھنٹوں کی یاد آئے گی۔ ایک لڑکی کی یاد، ایک نوجوان جسم کی یاد ــــ

اور وہ اپنے جسم اور دماغ اور دل کو زندہ رکھے گا ہندوستان کی خاطر، انقلاب کی خاطر، اور پھر جب ملک آزاد ہو جائیگا ..... تو اس وقت شاید وجے سنگھ بینا کا نام بھی بھول جائیگا۔ انقلابی حکومت کو چلانے کے کام میں اس کو ایک گمنام لڑکی کو یاد کرنے کی کب فرصت ہوگی مگر اس وقت بینا کا وہ احساس فتح نصیب ہوگا جو ایک آرٹسٹ کو اپنا شاہکار دیکھ کر نصیب ہوتا ہے ــــ بینا اٹھی دروازہ کھولا اور (وجے سنگھ کے) کمرے میں چلی گئی۔"

جگہ کی کمی کے باعث ہم ترغیب و تحریص کے اس شاہکار کا مفصل اقتباس پیش نہیں کر سکے، مگر آپ نے دیکھ لیا کہ جب کوئی شخص اپنی سی کرنے پہ تُل جاتا ہے تو کیا کچھ نہیں کر گذرتا۔ اے آزادی! اور اے ادب! وہ کونسے مظالم تھے جو تمہارے نام پر نہیں توڑے گئے اور وہ کونسی بدلگامیاں تھیں جو تمہارے نام پر اختیار نہیں کی گئیں۔

عورت کا جوہر عصمت جو شرف انسانی کا سب سے بڑا نشان اور سماج کا سب سے بڑا سہارا ہے آج اس قدر ارزاں سمجھا جانے لگا کہ اسے ایک طبقے کی سیاسی تحریک میں عورت کی طرف سے ایک ناچیز ہدیے بلکہ "چندے" کا درجہ دیا جا رہا ہے اور قوم کی نوجوان لڑکیوں کے شعور پر یہ نقش ثبت کرنیکی کوشش کیجا رہی ہے کہ عصمت و عفت بالکل خیالی چیزیں ہیں اور اس "دلفریب دنیا کا دروازہ جسے سماج نے غیر شادی شدہ لڑکیوں کے لئے بند کر رکھا ہے" قومی کام کرنے والے نوجوانوں کی "مدد سے" نہایت آسانی سے "توڑا جا سکتا ہے"۔ اور توڑا جانا چاہیئے کیونکہ اس سے گزر کر وہ "آزاد جنسی" تعلقات" کی جنت میں قدم رکھ سکیں گی۔ اور وجے سنگھ جیسے شاہکار تیار کرنے میں مدد دے سکیں گی۔

اخلاقی بدلگامی کے اس ترغیب نامے کو جسے افسانہ کہنا افسانہ نگاری کی توہین ہے، اگر خالص فنی نقطہ نظر سے بھی جانچا جائے تو اشتہاریت کے اس گھناؤنے عنصر کے علاوہ اس میں صناعت کی بھی نہایت مضحکہ خیز کمزوریاں ہیں کامریڈ وجے سنگھ کو جیل سے باہر صرف ایک رات بسر کرتی ہے اور وہ اسی رات میں اپنی سولہ برس کی جنسی پیاس بجھانا چاہتا ہے۔ اس نے بینا کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس لئے عشق و عاشقی کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ ایک عورت چاہتا ہے، صرف ایک عورت۔ بلکہ عورت کا جسم ــ بینا کے جسم سے اسے کوئی خصوصیت نہیں۔ اسے ایسی افلاطونی محبت درکار نہیں جو اس کے کسی قدر دان کے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بینا اگر اسے دیوتا سمجھ کر پوجتی اور ماں کی طرح چاہتی تب بھی اسکی جنسی پیاس میں رتی بھر کمی نہ ہوتی۔ پھر اس کے لئے کیا ضرور تھا کہ وہ اسے بجھانے کے لئے ایک ناکتخدا شریف زادی کا جوہر عصمت طلب کرتا اور اس کی یادگار میں اسے ایک حرامی بچہ دے جاتا۔ اس کے لئے یہ ایک نہایت آسان بات تھی کہ چپکے سے نکل کر چکلے میں چلا جاتا اور وہاں بینا کے جسم سے کہیں بہتر جسم سے وہ چیز حاصل کر لیتا جس کی درحقیقت اسے ضرورت تھی۔ آخر وہ قصبہ جہاں ایک سینما ہو سکتا ہے، وہاں ایک پانچ روپے والی رنڈی بھی مل سکتی ہے۔ مگر افسانہ نگار یہ ممکنات نہایت آسانی سے نظر انداز کر جاتا ہے کیونکہ اس کی نظر فن پر نہیں بلکہ جنسی بے راہ روی کے اشتہار پر ہے۔ خواجہ صاحب کا یہ اجتہادی افسانہ پڑھکر ہمیں قدیم کلیسائے روما کی وہ کنواریاں یاد آجاتی ہیں جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو "خادمان دین" کی جنسی خدمت کے لئے وقف کر دیتی تھیں یا پھر جنوبی ہند کی وہ دیوداسیاں جو مندروں پر اس لئے چڑھا دی جاتی تھیں کہ تمام عمر "مردان راہِ خدا" کے کام آئیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ "پولٹیکل دیوداسیوں" کا یہ نیا تصور ہمارے "ترقی پسند" حلقوں میں کیا رنگ لاتا ہے۔

علی اختر

پیامِ اقبال

شبِ گزشتہ، نظر آئے حضرتِ اقبال
وہی شگفتہ مزاجی، وہی جمال اُن کا
کہا یہ میں نے کہ اے آشنائے سرِ عمیق
جو تو نے مطربِ پاکیزہ لحن چھیڑی تھی
خزاں پرستیِ اربابِ دہر کیا کہیئے
کسی کو وہم کہ موضوع ہے ترا مذہب
گماں کسی کو کہ تیری زبان ہے بے تاثیر

حریف ہوش و خرد تھا مرا یہ عالمِ خواب
وہی نگاہ، وہی دل پذیر طرزِ خطاب
تری نگاہ، حقیقت شناسِ خوب و خراب
ہنوز تازہ ہے وہ سرمدی نوائے رباب
کھٹک رہا ہے نظر میں ترے چمن کا گلاب
ترا خیال ہے مسلم کے عہدِ رفتہ کا خواب
عروسِ فکر کے رخ سے ہٹا نہیں ہے نقاب

میں تیری فکر کا محرم سہی مگر دنیا
تجھی سے چاہتی ہے نکتہ چینوں کا جواب

سنا یہ مجھ سے تو اقبال مسکرانے لگے
یہ پیرِ مکتبِ ناآگہی کے حلقہ بگوش
مجھے نقیبِ حرم کہہ رہے ہیں وہ ناداں
مرے جہاں کا ہر ذرہ، عالمِ انوار
مقامِ نور و سرور و حضور کیا جانیں
وہ جلوہ پردۂ فاؤسٹ میں نہیں ملتا
مرا بیاں ہے حقیقت کا ترجماں لیکن
حقیقتِ ابدی ہے تہِ نقاب ہنوز
مگر بساط اُلٹنے کو ہے زمانے کی

پھر اپنی خاص اداؤں میں مجھے دیا یہ پیام
سمجھ سکیں گے ابھی کیا مری خودی کا مقام
دماغ بتکدہ جن کے، تصوراتِ اصنام
یہ آب و خاک میں سمجھے ہیں زندگی کا نظام
یہ دانش کے پرستار، نیطشے کے غلام
دیا ہے عارفِ رومی نے جس کو منظرِ عام
مری زباں ہے نا آشنائے نطقِ عوام
تہی پڑے ہیں بہت دن سے ظرفِ بادہ و جام
نئے نظام کی تمہید ہے کشاکشِ عام

فضائے دہر میں طوفاں کی آمد آمد ہے
کہ بطنِ موج میں تازہ ہوا ہے ذوقِ خرام

مُسلم ضیائی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

اِسکول ماسٹر

اَدھیڑ عمر کے ایک رئیس نے برآمدے میں بیٹھے بیٹھے گاڑیبان کو پکارا جو اُس کے مکان کے سامنے سے پن گاڑی مئے چلا جا رہا تھا۔

"اے! اے۔ پرو کوئی! پرو کوئی!"

گاڑی ٹھہر گئی۔

"بہرا ہے کیا؟"

گڑی گڑی ناؤرِ مچ! پہیوں سے ایسی آوازیں نکلتی ہیں، کہ سنائی ہی نہیں دیتا کچھ۔ اُنھیں تیل کی ضرورت ہے اُن کو۔"

"اوہ۔ بالکل ٹھیک ہے۔ وہ گاڑی میں کیا ہے؟ پانی؟"

"جی ہاں"

"تالاب سے لائے ہو؟"

"جی"

"اچھا" رئیس نے ذرا دیر بعد کہا "جا سکتے ہو"

ایک سپاہی نے برآمدے تک آکر کہا "سرکار کی خدمت میں آداب عرض کرتا ہوں"

"کون ہو تم"

"فرخو ضلع مرکو لوفسکی سے آیا ہوں آپ تو جانتے ہوں گے؟ —— دریائے کوسترا کے کنارے"

"کیا چاہتے ہو؟"

"نوکری کی تلاش میں ہوں بطور دربان یا قرق امین"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے؟"

"فوج میں ملازم تھا۔ سپہ سالار کا کوچوان۔ اس کے بعد سورانکی میں مجسٹریٹ صاحب کا باورچی رہا سرکار میں ہر فن مولا ہوں —— مالی، کتوں کا نگہباں، باورچی —— جو خدمت آپ لینا چاہیں"

"کیا پتھر توڑ سکتے ہو"

"نہیں۔ مجھ سے ایسا کام نہیں ہو سکتا"

"کیوں؟"

"حضور بات یہ ہے کہ فوجی زندگی انسان کا کس بل نکال لیتی ہے۔ میں فوج کے ہراول میں تھا؛ عقبی فوج میں نہیں تھا"

"اچھے خاصے صحت مند ہونے پر بھی ایسے اَدنیٰ کام کیوں کرنا چاہتے ہو"

بھلا سوچو تو کہ قرق اَمینی اور کتوں کی نگہبانی بھی کوئی کام ہے؟"

"لیکن سرکار پتھر توڑنے سے تو بہتر ہے"

"میرے خیال میں تو پتھر توڑنا بہترین کام ہے . . . . خیر . . . . کیا تمہارے پاس سرٹیفکٹ ہیں"

"جی نہیں حضور"

"بلا سرٹیفکٹ کے میں تمہیں ملازم نہیں رکھ سکتا"

"دُرست ہے سرکار"

"تم بالکل نکمّے اور ناکارہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔

چور یا شرابی ......"

"جی سرکار"

"تمہیں سرٹیفکٹ لانا چاہیئے"

"جی سرکار"

"آداب عرض"

سپاہی چلا گیا۔ اِتنے میں داروغہ نے حاضر ہو کر کہا۔

"سرکار جس وقت آرام فرما رہے تھے ایک اجنبی آیا تھا۔ کسی گاؤں کے مدرسے میں پڑھاتا ہے"

"اب کہاں ہے"

"دفتر میں بیٹھا ہوا ہے"

"حاضر کرو"

تقریباً چالیس سالہ شخص برآمدے میں داخل ہوا رئیس نے بیٹھنے کے لئے کرسی کی طرف اِشارہ کیا۔

"کون ہو تم"

"بزوبوٹ ضلع پوبیرا کا اِسکول ماسٹر۔ حضور کی خدمت میں ایک گذارش ہے۔ کیا حضور کے پاس ملازمت مل سکتی ہے۔"

"مجھے کسی اِسکول ماسٹر کی ضرورت نہیں" رئیس نے کہا۔

"میں کوئی دوسری خدمت بھی انجام دے سکتا ہوں سُنا ہے کہ حضور کو ایک منشی کی ضرورت ہے"

"بزوبوٹ میں تم نے ملازمت کیوں چھوڑ دی"

"اِسکول میں آگ لگ گئی اور جل کر خاک سیاہ ہو گیا"

"عرصہ ہوا کیا؟"

"یوم اولیاء کے موقع پر۔ آگ لگنے کا سبب نہیں معلوم ہو سکا ــــ سارا گاؤں جل گیا"

"ہاں آج کل مسلسل آگ لگنے کی خبریں آ رہی ہیں۔ یہاں سے قریب ہی ایک گاؤں کے جل جانے کی اِطلاع آئی ہے"

لیکن یہ تو بتائیے کہ جناب مدرس کیوں کر بن گئے؟

"تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ رہا۔ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ بھائی میری کفالت کرتے تھے۔ اس کے بعد ایک رئیس کے پاس دو روبل ماہانہ پر نوکر ہو گیا۔ مگر وہاں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکا۔ جب تک نوکر رہا کوچوانی کے فرائض انجام دیتا رہا ......"

"لیکن یہ کیوں؟"

بات یہ تھی کہ میرے شاگرد کو پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں تھا۔ اُس کے ماں باپ نے اسے آزاد چھوڑ رکھا تھا اِس لئے اُنھوں نے مجھ سے عارضی طور پر کوچوانی کا کام لیا"

"خوب!!"

"میں کام اچھی طرح کرتا تھا۔ مجبور تھا کیونکہ کوئی دُوسرا ......"

ملتا کیا تھا؟

"کچھ نہیں۔ صرف رہنا کھانا یا ایک اترا ہوا ڈریسنگ گون جو رئیس نے عنایت کیا تھا۔ یہی ڈریسنگ گون پہنے ہوئے میں اپنے بھائی کے پاس گیا لیکن اُنھوں نے کہا "یہاں کیا کرنے آئے ہو۔ نکھٹو کہیں کے۔ کوئی کام کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ گانا ہی ــــ ممکن ہے کسی وقت "اُستاد" ہو جاؤ"

میں نے گانا سیکھنا شروع کیا لیکن بھائی نے میرے گانے سے بیزار ہو کر ایک دن کہا "اُفوہ! ۔ بیزار ہو گیا ہوں۔ ناقابلِ برداشت ہے تمہارا گانا۔ بہتر ہے تم اَبا جان کے پاس چلے جاؤ"

گھر پہنچا تو سب نے بُرا بھلا کہنا شروع کیا "بیکار نکما وغیرہ" بھلا آپ ہی بتائیے سرکار۔ ملازمت ہی نہ ملے تو میں کیا کروں؟ میں نے ایک مرتبہ یہ بھی سوچا کہ رہبانیت اختیار کر کے کسی خانقاہ میں جا رہوں لیکن اُسی زمانے میں ایک خط میرے بھائی کے پاس سے

آیا جس میں مجھے اپنے پاس بلایا تھا۔ میرے جانے پر اُنھوں نے کہا "شاہزادہ کا داروغہ ایک سنگیت پارٹی قایم کرنا چاہتا ہے۔ تم "اُستاد" کی حیثیت سے ملازم ہو جاؤ"۔ میں نے کہا "آپ جانتے ہیں میں گانا نہیں جانتا پھر کیونکر اُستاد بن سکتا ہوں"۔ لیکن بھائی نے کہا "گھبراؤ نہیں۔ تم اپنی جماعت کو تعلیم دینا سیکھ جاؤ گے"۔ میں نے ملازمت اختیار کر لی۔

اُنھوں نے مجھے ــــــ"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اُس وقت آپ ڈریسنگ گون پہنے ہوئے تھے؟"۔

"جی نہیں۔ میں اپنی ماں کا کوٹ پہنے تھا۔ ڈریسنگ گون پھٹ چکا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک چھوٹا کوٹ تھا ۔ ۔ ۔ گھر کا بنا ہوا ۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا۔ پھر؟"

"کام اچھا ہو رہا تھا۔ سنگیت میں کافی تعداد تھی میرا بھائی اُونچے سروں میں گاتا اور ایوان الکسیچ نیچے سروں میں۔ آج کل وہ انجیل کی تفسیر اور گرداوری کی تعلیم دیتا ہے۔ ان لوگوں کے علاوہ بعض لوگ شوقیہ شریک تھے۔ ہم لوگوں نے بہت جلد روسی گیتوں کی اچھی مشق بہم پہنچائی۔ داروغہ صاحب کو ہم لوگوں کی مشق دیکھ کر بڑی حیرت تھی۔ موسیقی میں اس کی نگاہ بڑی گہری تھی۔ چنانچہ اس نے شاہزادے کے پاس جو ماسکو میں تھے خط بھیجا جس میں "اُستاد" کے لئے تنخواہ مقرر کرنے کے لئے لکھا تھا۔ اس اثنا میں ہم نے دوسرے گیتوں اور راگوں میں مشق بہم پہنچانی شروع کر دی تھی۔ یکایک شہزادے کے پاس سے جواب آیا۔ سنگیت کی ضرورت نہیں میں اپنی صحت کی خاطر باہر جا رہا ہوں ــــ"

"اس کے بعد میں موضع بزوبون کے مدرسہ میں اسکول ماسٹر ہو گیا۔ یہاں کے رہنے والے بڑے غریب ہیں۔ سردی کے دنوں میں بہت سے کسان اپنی بھٹیوں میں سوتے ہیں۔ ایک روز اتفاق سے ایک پادری صاحب اس گاؤں میں باہر سے آگئے اور ایک گھر میں داخل ہو کر اُنھوں نے آواز دی لیکن کسی کا پتہ نہ تھا اُس پر اُنھوں نے ایک مناجات گانی شروع کی۔ یکایک لوگوں نے بھٹی سے رینگ رینگ کر نکلنا اور صلیب مقدس کو بوسہ دینا شروع کر دیا۔ میرے اکثر شاگرد بھیک مانگنے جایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود سینٹ پیٹر برگ کے ایک دولت مند رئیس نے جو ہمارے گاؤں سے گذر رہا تھا، کہا کہ لوگ تعلیم کے خلاف نہیں ہیں ــــ سچ مچ۔"

"کیا طنز سے کہہ رہے ہو؟"

"جی نہیں!!"

"واقعی غریب آدمی کو بھی علم حاصل کرنے کی خواہش ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر لومونوسوف ہی کو لے لو۔ وہ ایک معمولی کسان سے ترقی کر کے مجلس علمی کا رکن بن گیا ہے۔"

"درست ہے"

"اچھا سینٹ پیٹر برگ سے آئے ہوئے رئیس نے اور کیا کہا؟"

"اس نے کہا تھا کہ طالب علموں کے لئے اگر یونیفارم مقرر کر دیا جائے تو مناسب ہوگا۔"

"بڑا اچھا خیال ہے" رئیس نے زور سے کہا "مدرسہ میں ضبط و نظم ہونا چاہیئے۔ ضبط و نظم کے بغیر کوئی مدرسہ نہیں قایم رہ سکتا۔ فضول ــــ تمہارے اسکول میں کیا کیا پڑھایا جاتا ہے؟"

"عہد نامہ جدید روسی اور سلووانی زبان میں پڑھاتے تھے اور عہد نامہ قدیم و جدید سے ایک سو چار منتخبات، مسیحی مذہب کے عبادیات، زہد و اتقا کی مثالیں اور دعائیں بچوں کو زبانی یاد کرائی جاتی تھیں اور اس کے بعد دوسری دعائیں اور مناجاتیں وغیرہ"

"بس"

"جی نہیں" ہمارے پاس کتبخانہ میں حسب ذیل کتابیں تھیں۔

"تاریخ عالم کے منتخبات" مصنفہ شرک

"فوجی ملازمت میں داخلہ کی منظوری کے اصول"

"غذائے دل و دماغ"

"مناجاتیں"

"ہترا" مصنفہ گلشا

"سینٹ پیر دکو بیس ناجائزکی سوانح عمری"

"عوام کی کتاب"

"گھریلو بات چیت"

"گنی پتک"

اور چند کتابیں۔

"کتابیں تو اچھی ہیں" رئیس نے کہا "میں "گھریلو بات چیت" اور "گنی پتک" منگواؤں گا۔ تم وہاں کب تک ملازم رہے"

"آٹھ سال۔ اس تمام عرصہ میں میری تنخواہ نہیں بڑھی۔ ایک روز انسپکٹر صاحب آئے۔ انھوں نے پوچھا "تم کتنے عرصہ سے کام کر رہے ہو؟"

"آٹھ سال سے" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری تنخواہ میں اضافہ ہوا؟"

"جی نہیں" میں نے جواب دیا "مجھے اقل ترین تنخواہ دی جاتی ہے"

"کیوں؟"

"معلوم نہیں"

اس پر انسپکٹر نے افسر ضلع سے کہا "مدرس کی تنخواہ بڑھنی چاہیئے۔" اس نے یہ بھی کہا کہ مدرسہ کی پھلواری پر توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔ اس لئے اسے درست ہونا چاہیئے کیونکہ اس کا اخلاقی اثر طلبہ کے دلوں پر بہتر ہوگا جو بعد میں کسان بن جائیں گے"

"مجھے اس سے اتفاق ہے۔ ان لوگوں کے برے رجحانات بچپن ہی سے بدل دینے چاہئیں۔

"انسپکٹر نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ باغ میں پھول بوئے جائیں اور ——"

"فضول۔ میرے خیال میں یہ غیر ضروری ہے اسے چاہیئے تھا کہ برچ کے درخت لگانے کا حکم دیتا ان کا اثر طلبہ پر کہیں زیادہ بہتر ہوگا"

"برچ کے درخت پہلے سے موجود تھے ——"

"برچ کے درخت اتنے ہی قیمتی ہیں جتنی "گنی پتک" یا "گھریلو بات چیت"۔ کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے"

"میں شادی کر لیتا لیکن مجھے خوف تھا۔ اوگوزوف کے پادری نے مجھ سے اپنی سالی کے بارے میں کہا تھا۔

"میں اس سے ملنے گیا"

"کیا وہ عقلمند تھی"

"جی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ عقلمند تھی یا نہیں"

"لیکن تم نے اس سے درخواست کی تھی؟"

"جی ہاں۔ یہ تو درست ہے۔ ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں۔ اولگا مترسی نا"

اس نے کہا "ہاں ہاں۔ مجھے معلوم ہے"

"میں یہاں لایا گیا ہوں" میں نے کہا "تاکہ تم سے شادی کی درخواست کروں"

"واقعی" اس نے کہا۔

"جانتی ہو میں نے تمہیں کہاں دیکھا تھا؟"

اوگوزوف میں بپتسمہ کے موقع پر" میں نے کہا اور اس نے جواب دیا۔

"ہاں۔ مجھے یاد آگیا۔ تم خیسل نوسے آئے ہونا؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

"بڑے اچھے مناظر ہیں وہاں"

"بس اس کی عقلمندی کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے! اس کا باپ مجھ سے جلدی شادی کر لینے کے لئے کہتا رہا کیونکہ گھر کی نگرانی کرنے والی کے بغیر کوئی آدمی اچھی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا"

"ساتھ رہ کر ہماری زندگی زیادہ خوشگوار ہو سکتی ہے" اُس نے کئی مرتبہ کہا۔ ہم لوگ صبح تک یونہی ناچتے گاتے رہے"

"مقدس گیت؟"

"جی نہیں مختلف اقسام کی مُناجاتیں اور گیت"

"اچھا۔ کیا تمہاری منسوبہ نے کوئی گیت گایا تھا؟"

"جی نہیں۔ البتہ بعد میں جب میں نے اُسے چھوڑ دیا —— تو —— آپ کو معلوم ہے نا —— وہ ایک گیت گاتی تھی —— جس میں ہے کہ ۔

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا ہائے ہائے[1]
یہ کیا کیا کہ دوست کو دشمن بنا دیا

"آہا۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم نے اس سے بیوفائی کی"

"معلوم نہیں۔ بہر حال میرے پاس تھا کیا جس پر شادی کرتا"

"فضول۔ تو اسکول جل کر خاک ہو گیا"

"جی ہاں۔ بالکل"

"تو کیا سارا سامان اور کتابیں بھی جل گئیں؟"

"نہیں۔ اُنھیں بچا لیا گیا۔ آگ دن میں لگی تھی اس لئے لوگوں کو کتابیں وغیرہ بچا لینے کا موقع مل گیا"

"یہ اچھا ہوا کیوں کہ میرے خیال میں لوگ مدرسہ پھر بنا لیں گے اور تم پھر پڑھانے پر نوکر ہو جاؤ گے"

"میں بیزار ہو چکا ہوں اس سے۔ آپ یقین نہ کرینگے۔ میرے دل میں کئی مرتبہ خودکشی کا خیال آ چکا ہے"

"تو پھر تم کلرک بننا پسند کرتے ہو؟"

"جی سرکار"

"فضول۔ مجھے افسوس ہے لیکن میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ میں نے حال ہی میں اپنے محرر کو برطرف کر دیا ہے لیکن مجھے دوسرے محرر کی ضرورت نہیں۔ دیکھو نا ہر چیز پر ذاتی نگرانی ہونی چاہیئے۔ میں اپنے حسابات خود ہی کرتا ہوں۔ میرے پاس فرق امین کی ایک جگہ خالی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اسے تم پسند نہ کرو گے۔ تنخواہ بہت کم ہے . . . . تین روبل ماہانہ"

"بہت کم ہے" مدرس نے کہا۔

"دیکھا نا! مجھے محرر کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کے علاوہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اسکول ماسٹر بننا کیوں نہیں پسند کرتے!"

"میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ مجھ سے نہیں ہو سکتا"

"اِس میں شک نہیں کہ شجر علم کی جڑ نہایت کڑوی ہوتی ہے لیکن اُس کے پھل بہت شیریں ہوتے ہیں . . . نہیں۔ نہیں۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ تم عوام میں علم کی روشنی پھیلاؤ . . . . . آج کل جبکہ علم ضروریات زندگی میں شامل ہو گیا ہے۔ ہم سب کو انتہائی کوشش کرنی چاہیئے کہ اِس کام میں مدد دیں" میں خود جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے کرنے کو تیار ہوں میں تمہارے مدرسہ کو اپنی کتابیں تحفتاً دونگا۔ الیوشکا! اے الیوشکا! ذرا وہ صندوق تو لانا۔ اُدھر کمرے میں صوفے کے نیچے رکھا ہوا ہے"

نوکر ایک صندوق لے کر آیا جسے چاروں طرف سے چوہے کتر چکے تھے۔

[1] شیفتہ۔

" یہ دیکھو" رئیس نے کہا "یہ کتاب تمہارے لئے ہے" "قدرت کا انتقام" بڑی عمدہ کتاب ہے۔ مجھے یاد نہیں کس مضمون پر اور یہ دیکھو" قسم ۔ ۔ ۔ ۔ بھئی میرے خیال میں تو تم ساری کتابیں لے جاؤ۔ نیا اسکول بننے پر ساری کتابیں ایک سلسلہ سے ترتیب دیکر کتاب خانے میں اس کتبہ کے ساتھ رکھنا "یاکوف اینٹونوچ سوی توکوف کا تحفہ" جو پروخوروکا ،کے زمیندار ہیں "مستقبل مجھے یاد رکھے گا ۔ ۔ ۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ قسمت تمہیں یہاں لے آئی ورنہ میری کتابیں بیکار پڑی رہتیں اب ان سے لوگوں کو فائدہ پہنچے گا نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ کئی نسلوں کو بھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایوشکا! اے ایوشکا! دیکھو گھوڑا تیار کرو اور آپ کو کتابوں کے ساتھ موضع بیزوبوف پہنچادو"

دو مہینے میں نیا مدرسہ بن چکا تھا۔ تعلیمی کتاب خانے میں حسب ذیل قیمتی کتب کا اضافہ ہوگیا تھا جنھیں مسٹر سوی توکوف نے "تحفتاً عنایت فرمایا تھا"

"امرائے جہنم کی مراسلت"
"کتوں کے ذریعہ شکار"
"روسی تھیٹر"
"قدرت کا انتقام"
"بلگارین کی تصانیف"
"سیاسی اور اخلاقی کہانیاں"
"ماسکو گزٹ"
"ایک نئی لاطینی الف بے"
"دانائی سے متعلق طلبہ سے خطاب"
"رہنمائے اخلاق"
"حقیقی حکمت کے قواعد پر ایک مختصر رسالہ"

اب کسی چیز کی ضرورت نہ تھی سوا ایک مدرس کے کہا جاتا ہے کہ سابق مدرس نے پھانسی لے کر خودکشی کرلی تھی۔

(نکولای پونپسکی)

قصص و مسائل ۔ از مولانا عبدالماجد دریابادی۔ قصے اور افسانے تو آپ نے بہت سے دیکھے ہونگے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں افسانہ نہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا مقام حاصل ہے یہ قصے خود خدا نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے جدید عصری تحقیقات کی روشنی میں ان قصص کو ضروری تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے اور خوب بیان کیا ہے آج سے ہزاروں سال پیشتر کی پوری تہذیب آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس سے پہلے دنیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر اتنی ضخیم بالشان کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ قیمت ۔ عہ ۸ ۔ ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

ثاقب کانپوری

جوانی

ہیں کتنے جوانی کے یہ دلچسپ نظارے		پیغامِ جنوں دیتے ہیں ہنستے ہوئے تارے
بیٹھا ہوں لئے سینے میں جذبات کا محشر		ہر صبح نظر آتا ہے فردوس کا منظر
انجام سے غافل ہوں میں انجام سی غافل

سُنتا ہوں میں تاروں سی محبت کے فسانے		کس درجہ ہیں پُرکیف جوانی کے ترانے
گویا کہ ہیں مسرور یہ دریا کے کنارے		ہیں چاند کے کس درجہ دل آویز اشارے
اب مجھکو خبر کچھ نہیں آلام جہاں کی

اِک سکر سا برساتی ہیں گھنگھور گھٹائیں		معمور نظر آتی ہیں نزہت سی فضائیں
کہتا ہے ہر اک ذرہ محبت کی کہانی		ہر چیز میں نغمہ ہی ہر اک شئے پہ جوانی
اِک خواب سی ہی شورش ہنگامۂ ہستی

ہر چیز سے ہے رنگ جوانی کا نمایاں		ندی کی روانی میں ہی اک کیف پرافشاں
جو نقش نظر آتا ہے ہوتا ہے گہربار		جو منظر ہستی ہے جوانی سی ہی سرشار
اللہ رے جوانی کا یہ رنگ طرب انگیز

شیر محمد اختر

نفسیاتِ زندگی کا ایک ورق

خوف

میں خوف ہوں، انسانیت کا دشمن!
میں ایک ڈراوا ہوں جو زندگی کے راستہ پر گھات لگائے بیٹھا ہوں۔
مجھے آنکھیں نہیں دیکھ سکتی۔ میرا بسیرا ڈرپوک انسان کا دل ہے۔
میں یاس کا باپ ہوں، جہل وحجت میرے بھائی ہیں۔ مجھے ترقی سے بیر ہے۔ استبداد میرا ہتھیار ہے۔
میرا اَن دیکھا وجود کتنا ہیبت ناک ہے۔ بن دیکھے اس کا رعب سب پر طاری رہتا ہے۔ جہالت نے مجھے جنم دیا ہے اور غلط خیالات کی گود میں میں نے پرورش پائی ہے۔
اُمید کو تاریک کر دکھانا میرا کام ہے۔ تمناؤں کو تشنہ رکھنا میرا شیوہ، میں نے کتنے آدرش توڑ ڈالے۔ کتنی کامیابیوں کو پروان چڑھنے سے روکا۔
میں نے بڑے بڑے سورماؤں کو بزدل اور کاہل بنا دیا۔
میں نے بہادروں کے ہاتھوں سے تلواریں چھین کر اُنھیں ذلیل کرایا۔
کامیابی کی دہلیز پر بڑے بڑے سوداگر پہنچ کر لوٹ آئے۔ میں نے انسانیت کے ہزاروں اعلیٰ مقاصد ناکام کر دیئے۔
میں نت نئے روپ دھارن کرتا ہوں۔ احتیاط میرا ہی ایک روپ ہے۔ قدامت پسندی میرا دوسرا نام ہے۔

میرا نام خواہ کچھ رکھ لو۔ میرا کام ہمیشہ ترقی کی راہ میں روک ڈالنا ہے۔
اگر کوئی شخص میرا مقابلہ کرے تو میری غضب ناک آواز اس کے کان بہرے کر دیتی ہے۔ میرا نعرہ "یہ تم سے ممکن ہی نہیں" اس کے بدن میں لرزہ پیدا کر دیتا ہے۔

میرے زہر کا ایک ہی تریاق ہے ــــ ادراک۔
اس کے سامنے میرا بس نہیں چلتا۔ اس کی روشنی کے سامنے میری تاریکی خود بخود ماند پڑ جاتی ہے۔ اس کے سامنے جب میں بولنے لگتا ہوں تو خود اپنا سایہ خوف بن کر مجھ پر طاری ہو جاتا ہے

میں کیا ہوں۔ محض انسانی ذہن کا ایک واہمہ۔
مجھ میں نہ کوئی طاقت ہے۔ نہ کرامات۔ میری ساری قوت تو خود اس انسان کی دی ہوئی ہے جس کے دل میں میرا بسیرا ہے۔
جوں جوں اس کے اندر سمجھ بوجھ کی روشنی آتی ہے، میں غائب ہونے لگتا ہوں۔
آخر میں کون ہوں؟
محض ایک خیالی تصویر!

چند نایاب تاریخی و اسلامی کتب اور اُن کی قیمتوں میں حیرت انگیز رعایت

صرف ایکماہ کے لئے

۱۵ مئی سے ۱۵ جون تک

(۱) مقدمہ ابن خلدون۔ تین جلدوں میں۔ ابن خلدون کی مشہور تصنیف کا اُردو ترجمہ رعایتی قیمت مکمل سٹ چھ روپئے۔

(۲) تاریخ اسلام۔ مصنفہ رائٹ آنریبل سید امیر علی بالقابہ رعایتی قیمت عہ/ ۸

(۳) جوہر قرآنی۔ علامہ شیخ طنطاوی جوہری مصری کی مشہور تصنیف کا اُردو ترجمہ اصلی قیمت عہ ایک روپیہ رعایتی ۸/

(۴) تفسیر القرآن (مکمل آٹھ جلدوں میں) آج تک مصر اور دنیائے اسلام کے دیگر حصوں میں جسقدر تفاسیر شائع ہوئی ہیں یہ تفسیر ان تمام تفاسیر کا نچوڑ ہے بہترین اور مکمل تفسیر۔ اصلی قیمت اکیس روپے آٹھ آنے۔ رعایتی غیر مجلد بارہ روپے مجلد چودہ روپے۔

(۵) عزور حسن (۲۸) جلدوں میں۔ جادو نگار رینالڈس کے بہترین تاریخی ناول کا اردو ترجمہ قیمت اصلی بائیس روپیہ رعایتی بارہ روپیہ

(۶) خونی تلوار۔ رینالڈس کے ایک مشہور تاریخی ناول کا اردو ترجمہ دو حصوں میں۔ رعایتی قیمت پانچ روپیہ۔

(۷) محمد علی پاشا۔ عشق و محبت کی رنگین فضا میں تاریخ مصر کے ایک اہم دور کی رنگین و دلکش داستان۔ مشہور عربی ناول کا اردو ترجمہ رعایتی قیمت دو روپے۔

(۸) ترجمہ تفسیر کبیر۔ جلد اول۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ کی تفسیر جلد اول کا اُردو ترجمہ سورۂ الحمد کی مکمل تفسیر کاغذ قدرے بوسیدہ اصلی قیمت تین روپے رعایتی ایک روپیہ آٹھ آنے۔

(۹) نظارۂ پرستان۔ (۲۵) جلدیں (رینالڈس) رعایتی قیمت اٹھارہ روپیہ

(۱۰) عمر پاشا فاتح کریمیا۔ چار جلدوں میں، رینالڈس کے مشہور ناول کا اُردو ترجمہ۔ رعایتی قیمت۔ دو روپے

(۱۱) عہد حکومت۔ خاندان عثمانیہ کے عروج و زوال کی داستان سلطان عبد الحمید کے عہد حکومت کی مکمل تاریخ۔ مسئلہ خلافت پر بحث رعایتی قیمت ایک روپیہ۔

(۱۲) کلید خزائن قرآنی۔ اس کی مدد سے کسی آیت کا ایک لفظ یا کلمہ یاد ہو تو بلا تامل پوری آیت کا ترجمہ مع نشان سورہ و تعداد آیت مل جاتا ہے اصلی قیمت مجلد سات روپے۔ رعایتی قیمت پانچ روپے۔

(۱۳) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ حضرت شاہ ولی محدث دہلوی کی مشہور تصنیف کا اُردو ترجمہ۔ کاغذ قدرے بوسیدہ تین جلدوں میں رعایتی قیمت سات روپے مکمل سٹ۔

(۱۴) تاریخ مراکو و مغرب الاقصیٰ۔ مراکش کے متعلق بہترین اور مستند ترین تصنیف تین حصوں میں رعایتی قیمت مکمل سٹ دو روپے آٹھ آنے

سیرۃ الرسول (عہ) آفتاب مغرب (۸/) مصر و انگلستان (عہ) قوم ترک (۸/) جدید ترکی دور حکومت (عثمانیہ) ۱۲/ حالات عرب و عراق و عمان (۱۲/) رہنمائے زراعت (۱۲/) حسن و زبیدہ (۸/) سفر نامہ جاپان (۸/) ترکوں کی موجودہ ترقیات اور اسلامی دنیا کا فوٹو (عثمانیہ) کاغذ بوسیدہ اصلی قیمت نے رعایتی عہ/ انجیل برنباس عہ/ ۸ محاربات طلیو نامہ تین جلدوں میں روزنامچہ سیاحت بلاد اسلامیہ و مقامات مقدسہ۔ دو روپے۔

تزک تیموری۔ تیمور کے خود نوشتہ حالات کا اُردو ترجمہ قیمت رعایتی (عہ)

ضروری نوٹ:- (۱) محصولڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا (۲) آرڈر کے ہمراہ پیشگی دو روپے ضرور آنے چاہئیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوگی۔ (۳) یہ رعایت ۱۵ مئی سے ۱۵ جون تک ہوگی۔ (۴) پتہ حتی الوسع انگریزی میں صحیح صاف اور خوشخط تحریر فرمائیں اور محصولڈاک بذمہ خریدار ہوگا (۵) رعایتی قیمتوں پر کسی قسم کی مزید کمیشن نہ دی جائے گی (۶) ریلوے سٹیشن کا نام ضرور تحریر کریں۔

منیجر اورینٹل بکڈپو۔ ڈاکخانہ وطن لاہور

عقیل احمد جعفری

آسمانی بچہ

کوئی مزدور مفلس تڑکے تڑکے　　چلا جاتا تھا تنہا سر جھکائے

بلا کا جاڑا تھا، یا لا غضب کا　　زمانہ کا بدن ٹھٹھرا ہوا تھا
اٹھا سکتا نہ تھا کوئی کہیں سر　　اتر آیا تھا "شاہ یخ" زمیں پر
نہ اڑتے تھے نہ ہلتے تھے، جمے تھے　　پرندے پیڑ کا "پھل" بنگئے تھے
اماں کی جا نہ بیداں تھا نہ جھاڑی　　گلے کا ہار تھی قمری کے سردی
ہوئے تھے خشک سردی کے اثر سے　　ٹپکتے تھے نہ آنسو چشم تر سے
سفیدی برف کی تھی پیرہن میں　　کہ لپٹی تھی زمیں اجلے کفن میں

کہ — اس مزدور نے اک تارا دیکھا　　فلک سے جو ابھی گویا گرا تھا
بڑھا یہ دیکھ کر آگے غریب اور　　جو پہنچا بید مجنوں کے قریب اور
تو پائی برف پر اک شے جھلکتی　　سنہری کچھ زرو پھلی "گنگا جمنی"
ٹھٹک کر پہلے تو رک رک کے دیکھا　　بالآخر اور بڑھ کر جھک کے دیکھا
چھوا ہاتھوں سے تو جنبش سی پائی　　ٹٹولا پارچہ تو "جان" آئی
نہ سونا تھا نہ تارا تھا نہ دھوکا　　یہ تھا زربفت میں انساں کا بچا

اندھیرا گھپ یہ جنگل کا یہ سردی　　کوئی عورت ہی اس کو لائی ہوگی
جگر اپنے ہی ہاتھوں سے چھلا ہے　　یہ ناجائز محبت کا صلا ہے

نہ منظر دیکھ پایا بیکسی کا　　لے آیا اپنے گھر "تحفہ" کسی کا
"یہ گنہ کی گٹھری" منزل دور کی اف
عقیل انسانیت مزدور کی اف

"راحیل"

بہکا بہکا تخیل

سُوپنج بچار کا مرض کتنا عجیب ہوتا ہے ایک لاعلاج ناسور۔ جس کا درمان افلاطون سے بھی نہ ہوسکے بُوعلی سینا بھی عاجز رہجائے ——— !

زندگی مختلف وادیوں میں گھومتی ہوئی گمراہ ہوجاتی ہے۔ دماغ ایک آہوئے رَم خوردہ کی طرح بھٹکنے لگتا ہے۔ بعض وقت تو کچھ ایسی نامعلوم بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے جہاں اُس کے خیال کی ہوا بھی نارسا ہوجائے۔ یہ افسانوں سے بھری ہوئی زندگی، اسکے اَنوکھے پلاٹ، اس کا نرالا اَسلوب، غرض میں کیا سمجھوں اِس کا مفہوم! کوئی سمجھ کر ہی کسی کو سمجھا سکتا ہے۔ میں ہی جب کسی چیز کو اچھی طرح نہ سمجھوں تو پھر کسی کو کیا سمجھاؤں۔ یہ دنیا جینے بھی تو نہیں دیتی۔ بس اِتنا سمجھ نہیں آیا کہ ابتک کچھ بھی تو نہیں سمجھی۔ زندگی کے داؤ پیچ کچھ ایسے اُلجھے ہوئے ہیں کہ اس کو بھلا کون سمجھے جتنی بھی ابتک سمجھ میں آئی ہے۔ اس کا سمجھانا نہیں آتا اس میں سمجھنے کی بہت سی باتیں ہیں۔ اس کو ہر پہلو سے دیکھنا اور پرکھنا ہے۔ اور میری اپنی خود زندگی اِتنی مختصر و کم مایہ ہے کہ گردن موڑ کر کسی طرف دیکھ لینے کی بھی تو مہلت نہیں۔

اِتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی ابتک یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ میری اِس واہی تواہی بکواس کا موضوع کیا ہے۔

چلتے چلتے زندگی میں ایک ایسی پرکیف ٹھوکر لگتی ہے، زندگی کی یکسانیت میں ایک ایسی خوشگوار سی ہلچل پیدا ہوجاتی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کب اور کیسے ہوگیا۔ ساری سوجھ بوجھ غارت ہوجاتی ہے عقل اپنا سا منہ لے کر رہجاتی ہے۔ دماغ اپنا توازن کھو دیتا ہے۔ یہ سب کیسے ہوجاتا ہے۔ نہیں معلوم! آس، نراس، بیچینیاں، اِطمینان کی ایک ہلکی سی جنبش، اِنتظار، اس کا نتیجہ، ناکامی، نااُمیدی، نامرادی ——— اور پھر قید کی تاریکیوں کی طرف ڈھکیل دینے والا صبر ——— ایک ایسا صبر جو پیہم مایوسیوں سے جبر کی صورت اِختیار کرلے۔ ایک ایسی مایوسی جس کی اتھاہ گہرائیوں میں صرف موت ہی سے سکون ملے۔ ایک ایسا سکون جس کو ایک اَبدی سکون کہہ سکتے ہیں۔

"دُنیا بہ اُمید قائم" بھی کوئی ترکیب لفظی ہے؟ کتنی مہمل، کتنی بے جان بندش ——— کتنا سہانا سبز باغ، کتنی دھندلکوں میں گھری ہوئی مکاری کتنی سراب آسا پرکاری ——— ایک دھوکا، اور پھر رنگین دھوکا، ایک زبردست فریب، ایک حقیقت نما مجاز ——— پس وہ ——— کچھ اسی قسم کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی ——— ایک مسافر تھا جس کی منزل کھوگئی ہو ——— ایک بے مقصد زندگی اس کا ساتھ دیئے چلی جاتی تھی۔ نگاہ کی آرزو آموزی نظر کی سادہ پرکاری، اِن سبکی حقیقت اس پر واضح ہوچکی تھی ——— اُس کے پاس

خیالات تھے، لیکن اُن کے دہرانے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کو بے مقصد و بے لاگ جینے کے ڈھنگ آ چکے تھے ——— وہ اس زندگی سے تھک چکی تھی، وہ سوتے سوتے جیسے ایک ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگ اٹھی تھی۔ اُس کے سپنے تھے ہی کون سے ایسے سلونے، سہانے ——— لیکن اب ——— اُن کا بھی شیرازہ منتشر ہو چکا تھا ———

میں ایک خواب دیکھ رہی تھی ———

اس میں بس یہیں تک لکھا تھا کہ ——— آنکھ کھل گئی ——— شاید کسی افسانہ لکھنے کا خیال میرے لاشعوری دماغ میں گھوم رہا تھا ——— لیکن اُس کی تکمیل نہ ہو سکی ——— اور اچھا ہی ہوا جو نہ ہو سکی ——— آنکھ کھلنے کے بعد نہ جانے کیوں ——— بہت دیر تک شیخ علی حزیں کا یہ شعر تخیل کی وادیوں سے ٹکرا رہا تھا ۔ ۵

اے وائے بر اسیری کز یاد رفتہ باشد
در دام ماندہ باشد، صیاد رفتہ باشد

اُف! یہ زندگی ایک ڈھونگ ہے اور بس ——— !"

ضربیں

قیسی رام پوری

قیسی انسانی کمزوریوں پر اس قدر شاقانہ انگلی رکھتے ہیں کہ ہر انسان اپنے ماؤف حصہ جسم کو ٹٹولنے پر مجبور ہو جاتا ہے انکا نظریہ حیات بہت ارفع و بلند ہے وہ پلاٹ کے استاد ہیں قیسی کے تمام افسانے اور ناول زندہ رہنے والے ہیں قیمت (عہ)

وزیرزادہ قہر عثمانی

تجلیات

مری رودادِ غم شاید کہیں دہرائی جاتی ہے
ستارے مرتعش ہیں، چاندنی تھرائی جاتی ہے
حقیقت زیست کی لفظوں میں کب سمجھائی جاتی ہے
اُلجھ جاتی ہے اتنی جس قدر سلجھائی جاتی ہے
کہاں ہے وہ مئے رنگیں ترے شیشوں میں اے ساقی
مری خمخانۂ پندار میں جو پائی جاتی ہے
کلی جیسے چٹک جاتی ہے سورج کی شعاعوں سے
انھیں یوں دیکھ کر دل پر مسرت چھائی جاتی ہے
مری زخمِ جگر کی ٹیس میں کب انقلاب آیا
جہاں پہ پائی جاتی تھی، وہیں پہ پائی جاتی ہے
ہوا کرتی ہے قدر آدمی حسنِ تکلم سے
یہ وہ نایاب شئے ہے جو بہت کم پائی جاتی ہے
زمانے میں ابھی کچھ دور رنگیں آنے والے ہیں۔
بشارت اُن کی میری حالی ہی سے پائی جاتی ہے
شمیمِ گل، بہارِ خلد اور سرمستئ عالم
تمہاری یاد میں شامِ تمنا پائی جاتی ہے
چمکتا ہے یہ اُن کا جلوۂ رنگیں نگاہوں میں
کہ اک برقِ مجسم سامنے لہرائی جاتی ہے
کبھی ایسی بھی ساعت قہر آتی ہے محبت میں
کہ اظہارِ تمنا میں بھی مشکل پائی جاتی ہے

قدوس صہبائی
بی۔ اے۔ آنرز

سانپ کا بدلہ

کمپنی باغ کے چوراہے پر بینگی بجانے کی آواز آئی چند لڑکوں، بچوں اور دو چار شاگرد پیشہ ملازموں کا غول اس طرف دَوڑا، لوگوں کے جمع ہو جانے پر مداری نے پٹارا کھولا اور کالا سانپ اپنا پھن اُٹھا کر ناچنے لگا۔ تھوڑی دیر میں شائد سانپ اور نیولے کی لڑائی ہونے والی تھی۔ تماشائی منتظر تھے۔

باغ کے دوسری طرف ولایت سے نئے در آمد کئے ہوئے گورے کلکٹر صاحب کی کوٹھی تھی۔ یہ آئی۔ سی۔ ایس صاحب ایسے زمانہ میں ہندوستان آئے تھے جب انقلابی طاقتیں بڑے زور شور سے مصروف عمل تھیں اور صوبوں کی حکومت کی باگ دوڑ کانگریسی جماعت کے قبضہ میں تھی — کلکٹر صاحب کو ہندوستان کی روانگی سے پہلے اُن کے دوستوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ چونکہ وہاں یہ ایک عام تبدیلی کا زمانہ ہے اِس لئے ضلع کے ایک حاکم ہونے کی حیثیت سے اُن کا فرض یہ ہے کہ عوام سے اپنا رشتہ بہت مضبوط رکھیں۔

عوام سے اپنا رشتہ اور رَبط قائم رکھنے کا نیک مشورہ کلکٹر صاحب نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ اِس لئے وہ اکثر شام کو پیدل تفریح کرتے ہوئے کمپنی باغ کے آس پاس اور دار الحکومت کی ایسی سنسان سڑکوں پر پائے جاتے تھے جہاں امراء زیادہ اور غریب کم نظر آتے ہوں۔

اس وقت صاحب اپنے بنگلہ سے نکلکر کمپنی باغ میں سے سیدھے مجمع کی طرف آ رہے تھے ممکن ہے اُنھیں رابطۂ عوام کے مشورہ پر پہلی مرتبہ عمل کرنیکا موقع ہاتھ آیا ہو۔ مجمع نے اُنھیں پہچان لیا کسی نے فرشی سلام کیا، کسی نے راستہ دیا، صاحب بھی تماشہ دیکھنے لگے۔

مداری نے کافی انعام حاصل ہونے کی اُمید میں زیادہ دلچسپی اور جانفشانی سے کام شروع کر دیا۔ صاحب بڑے محظوظ ہوئے اور اُنھوں نے مداری سے پُوچھا۔

"تم اپنا دوست سانپ کو کیسے سکھاتا ہے —؟"

اُنھیں تعجب تو نہیں تھا لیکن وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ کس طرح یہ لوگ اتنی خطرناک چیز پر قابو پا لیتے ہیں مداری نے جواب دیا۔

"حضور، ہم اِن کے ساتھ محبت اور رحمدلی کا برتاؤ کرتے ہیں اور یہ سانپ ہمارے اِس برتاؤ کو زندگی بھر نہیں بھُولتے، مگر حضور، سانپ، سانپ ہی ہوتا ہے۔ ہم اپنے بچاؤ کے لئے اس کے منہ سے زہر دانی نِکال دیتے ہیں"

"مگر، سانپ والا تم اِس کو پکڑتا کیسے ہے — اور اور ....." صاحب، صاف ہندوستانی نہ بُول سکتے تھے اُنھیں اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں مشکل ہوئی شاید مداری اُن کا مفہوم سمجھ گیا ہوگا۔ اِس لئے اس نے جواب دیا۔

"حضور، یہ بڑا کٹھن کام ہے، اور یہ ذات کبھی اپنا بدلہ لینا نہیں بھُولتی۔ اگر کسی سے سانپ کو ذرا سی

بھی تکلیف پہونچی ہو تو سانپ اُس سے بدلہ لئے بغیر نہ رہیگا اگر ہم سانپ کو کبھی کوئی تکلیف پہونچا دیں اور وہ ہمارے قبضہ میں آجائے تو ہمیں بڑی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ —— یوں بھی ایک ستائے ہوئے سانپ سے زیادہ کوئی چیز دُنیا کے پردہ پر خطرناک نہیں۔

صاحب کو مداری کی بات کا یقین نہ آیا اُنھوں نے کہا: "تم جھوٹ بولتا ہے" لیکن بازیگر اپنے فن کی آسانی سے ایسی توہین ہوتی ہوئی برداشت نہ کرسکتا تھا فوراً بولا "سانپ بھی آدمی کی طرح سمجھ رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ کب کیا کرنا چاہیئے۔ ایک مرتبہ کوئی اسے چھیڑدے پتھر ماردے تو وہ اس بات کو سالہا سال تک یاد رکھتا ہے اور بدلہ کا موقع ڈھونڈھتا ہے چاہے اِس کوشش میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے"

کلکٹر صاحب نے زیادہ بحث مناسب نہ سمجھی تماشہ کو چھوڑ کر وہ "واک" کے لئے چل پڑے البتہ اپنے دِل میں اُنھوں نے یہ ضرور سوچا کہ اگر ایک سانپ کا دماغ اور عقل بھی انسان کی طرح ہوتی تو مداری کا کہنا ممکن ہوسکتا لیکن اُس نے جو کچھ کہا ہے یہ ممکن ہی نہیں۔

شام کو دیر میں وہ کوٹھی پر واپس آئے اور دوسرے دن مداری اور سانپ کے متعلق اُنہیں خیال بھی رہا۔ اِتفاق سے کوٹھی کے احاطہ میں بہت بڑا باغ لگا تھا۔ درختوں کی کثرت اور بارش کے موسم کی وجہ سے اس زمانہ میں اکثر سانپ نکل آتے تھے اور صاحب کو بھی یہ بات معلوم تھی۔

ایک دن شام کی تفریح کے بعد جب صاحب واپس ہوئے تو اُنھوں نے کتے کے بھونکنے کی آواز سنی، اور وہ اس کی طرف چلے۔ موٹر گیرج کے قریب پہونچکر کیا دیکھتے ہیں کہ کتے کی کمر سے ایک خوفناک سانپ لپٹا ہوا ہے، سانپ اِنتہائی غیض وغضب کے عالم میں ہے اور کتا بے بس ہوجانے کو ہے۔ اُنھوں نے یہ سوچا کہ اگر ذرا توقف سے کام لیا تو کتے کا کام تمام ہوجائے گا۔ اِس لئے ایک بڑا سا پتھر اُٹھایا اور کتے کی طرف چلے۔ سانپ نے یہ احساس کرکے کوئی دوسرا دشمن بھی موجود ہے کتے کو چھوڑ دیا اور پھن اُٹھا کر کلکٹر صاحب کو دیکھنے لگا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں انسانی آنکھوں سے ملیں اور ایک لمحہ میں کلکٹر صاحب کے ہاتھ سے پتھر چھوٹ کر سانپ کی کمر پر جا پڑا سانپ اپنی جگہ سے ذرا آگے بڑھا اور پھر اس نے دشمن سے نگاہ ملائی اور اس وقت صاحب بہادر کی آنکھ جھپک گئی۔ اُنھیں یہ محسوس ہوا کہ سانپ کی نگاہوں سے دھواں نکل رہا ہے اگرچہ اُن کی نگاہ صرف ایک لمحہ کے لئے ان ہیبتناک نگاہوں سے ملی تھی لیکن اِن نظروں میں غصّے اور بدلے کے جذبات نمایاں تھے۔ وہ خوف سے کانپ گئے لیکن اپنے حواس مجتمع کرکے اُنھوں نے دوسرا پتھر اُٹھایا اور سانپ پر پھینک مارا، پتھر خالی گیا اور سانپ راستہ کاٹ کر گھاس میں جا چھپا۔

یہ واقعہ بھی جیسے جیسے دن گزرتے گئے کلکٹر صاحب کے دماغ سے فراموش ہوگیا ——۔

پورے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک دن دوپہر کو کلکٹر صاحب برآمدہ میں بیٹھے ابرآلود فضا اور ٹھنڈی ہوا سے لُطف اندوز ہورہے تھے۔ "لنچ" کھا چکے تھے۔ اور آرام کرسی پر سگار کے دھوئیں سے مشغلہ فرما رہے تھے۔ ہوا کی خوشگواری اور غذا کی آسودگی نے نیند کو دعوت دی، پہلے غنودگی طاری ہوئی اور رفتہ رفتہ وہ سوگئے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ بیدار ہوئے لیکن ابھی اچھی طرح ہوشیار نہ ہونے پائے تھے کہ اپنے کھُلے گریبان میں سے قمیص کے اندر اُنھوں نے کوئی ٹھنڈی ٹھنڈی اور لجلجی سی جاندار چیز داخل ہوتی ہوئی محسوس کی اور آنکھیں کھولدیں —— معاذ اللہ! نظروں نے ایسا منظر دیکھا جس سے

ان کا رواں رواں تھرا اٹھا، زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا وہ لرزہ براندام ہوگئے ——— کالا سانپ اُن کی برہنہ جلد پر قمیص کے نیچے چل رہا تھا۔

نا اُمیدی کی نظری گھڑی میں حفاظت جان کی خاطر فطری خوف نے صاحب بہادر کو "ہرچہ بادا باد" پر آمادہ کردیا اُنھوں نے اِس جراءت کے ساتھ جو نا اُمیدی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ موذی سانپ کے پھن پر ہاتھ ڈال دیا۔ اور حسن اِتفاق سے وہ کامیاب بھی ہوگئے۔ سانپ کا پھن اُن کی مضبوط گرفت میں تھا ———

غصہ سے دیوانہ ہوکر سانپ نے اپنی دُم سے متعدد چوٹیں جو تازیانہ کی ضرب سے کہیں شدید تھیں کلکٹر صاحب کے جسم پر لگائیں اَب صاحب، سانپ کا سرد جسم اپنے سینہ اور کمر کے گرد لپٹا ہوا محسوس کر رہے تھے ایک ہاتھ سے وہ سانپ کے بل نکالنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسرا ہاتھ مضبوطی سے اس کا منہ پکڑے ہوئے تھا۔ سانپ موقع موقع سے اپنی دم کا اِستعمال برابر کر رہا تھا۔ اور یہ جد و جہد زیادہ خوفناک ہوتی جا رہی تھی۔ ——— صاحب کی سانس پیٹ میں نہ سماتی تھی، وہ اپنے حلقے مضبوط کر چکا تھا اور سختی سے اُن کی ہڈیاں دبا رہا تھا جس کی تکلیف کا اِحساس یہ تھا کہ گویا شکنجہ میں جکڑ دیا گیا ہے، وہ کرسی سے نیچے گر پڑے تھے اور اَب انھوں نے چلانا بھی شروع کر دیا تھا۔ نوکر چاکر آس پاس کھڑے ہوئے سوچ رہے تھے کہ رہائی کی کیا تدبیر اِختیار کریں

صاحب کی میم صاحب بھی ایک پستول لئے بازو میں کھڑی تھیں اور ارادہ کر رہی تھیں کہ سانپ کو گولی مار دیں لیکن سانپ کے حلقے جو کلکٹر صاحب کے گرد لپٹے ہوئے تھے اور اس کا منہ جو صاحب کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اُنھیں اِس کا موقع نہ دیتا تھا۔ سانپ اور انسان دونوں خوف جان اور غیر معمولی کشمکش کی وجہ سے پورے برآمدہ کے فرش پر لوٹ رہے تھے۔ رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ——— اس سنسنی خیز اور خطرناک جنگ کے یہ پانچ منٹ دیکھنے والوں کیلئے گھنٹوں سے زیادہ تھے دونوں حریف اپنی پوری طاقت ایک دوسرے کو زیر کر لینے کے لئے صرف کر رہے تھے اور دونوں کو یہ احساس تھا کہ کامیابی ایک آخری کوشش کی محتاج ہے۔ دونوں جانب سے تازہ حملہ شروع ہوا اور سرکتے سرکتے صاحب بہادر اور انکے ساتھ سانپ برآمدہ سے پانچ فٹ نیچے فرش پر جا پڑے۔

لوگ جو بیوقوفوں کی طرح برآمدہ میں سے تماشہ دیکھ رہے تھے یہ دیکھ کر اِحساس خوف سے چلا اُٹھے کہ سانپ نے اِنسان سے آزادی حاصل کر لی ہے اور جلد ہی وہ اپنا خوفناک بدلہ لینے والا ہے ——— بدلہ کی اِسپرٹ میں سانپ کا پھن اُبھر چکا تھا، بس ایک لمحہ ! اور دیکھنے والی آنکھوں کے سامنے کلکٹر صاحب کا کام تمام تھا۔ میم صاحب ایک چیخ مار کر بیہوش ہوگئیں ——— عین اُس وقت ایک چھوٹا سا بھورا جانور جو اَب تک خاموشی سے کسی گوشہ میں بیٹھا اس لڑائی کی نگرانی کر رہا تھا اچانک بجلی کیطرح جھپٹا اور سانپ کی گردن دبا بیٹھا۔ سانپ نے خود کو اپنے زیادہ خونخوار دشمن نیولے کی گرفت میں کچھ اس طرح پایا کہ اسپر قابو پا لینا اس سے مقابلہ کرنا ناممکن ہوگیا۔ نیولے کو فتحیابی میں کوئی زیادہ وقت پیش نہ آئی۔ ——— میم کو ہوش میں لایا گیا جنھوں نے نیولے اور سانپ کی لڑائی دیکھی ——— ان کے شوہر کا موذی دشمن مغلوب و منتوح ہو چکا تھا۔

نیولا اِس بہادرانہ جنگ سے فارغ ہوکر چند لمحے حاضرین کے سامنے ٹھیرا گویا کلکٹر صاحب کی جان بخشی اور اپنی فتح پر داد طلب کر رہا ہے ——— لیکن میم صاحب جو شکر گزاری کے طور پر اپنے شوہر کے جان بخش محسن کو دودھ پلا کر معاوضہ دینا چاہتی تھیں بڑی مایوس ہوئیں کیونکہ وہ جب آگے بڑھیں تو نیولے نے بغور اِحسان مندی کا یہ حقیر سا معاوضہ لینا اپنی توہین سمجھی شاید وہ آزادی کو عیش کی غلامی پر ترجیح دیتا تھا ——— اسی لئے بھاگ کر قریب کی جھاڑی میں غائب ہوگیا۔ ممکن ہے زندگی کا ایک معمولی واقعہ حادثہ تصور کیا جائے لیکن گوری کلکٹر صاحبہ کے اس تجربے نے یقین کی اور یقین نے مذہبی عقیدت کی صورت اختیار کر لی تھی کہ سانپ کا بدلہ اِنتہائی خوفناک اور بالکل یقینی ہوتا ہے ۔"

علمی ادبی کتابیں اور ان کا شاندار مرکز

بلند پایہ ادیبوں اور حیدرآباد کے مشہور و معروف ناشرین کی تمام کتابیں ہم سے طلب فرمائیں۔

عصر حاضر آپ کو مجبور کر رہا ہے کہ مسائل حاضرہ کے ہر پہلو سے آگاہ ہوں مطبوعات مسائل حاضرہ سے متعلق ذیل کی ہر کتاب بیش بہا علمی اور معلوماتی خزانہ اپنے سینے میں رکھتی ہے۔

جنگ اور روپیہ ۱۲ر	جنگ اور راتب بندی .... عہ
جنگ اور اغذیہ ۱۵ر	امریکہ میں بین الاقوامی زر کے منصوبے ۶ر
جنگ اور مالیہ ۱۲ر	کینڈا میں " " " " ۸ر
اشتراکی روس ۶ر	انگلستان " " " " ۸ر
تنظیم مابعد جنگ ۶ر	ہندوستان " " " " ۸ر
ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات عہ	محصول زائد نفع اندوزی ۸ر
جنگ اور غذا کا مسئلہ ۱۲ر	ہندوستان کا قومی قرضہ ۱۲ر
حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات عہ	ہندوستان کیلئے ایک معاشی لائحہ عمل ۱۲ر

حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی ...... عہ

انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

بہشتِ ہند

دیارِ ہند جانِ ایشیاء ہے
ہمیں ہر ذرہ اس کا دیوتا ہے
بڑی نعمت ہیں اس کے کوہ و دریا
نہایت جانفزا آب و ہوا ہے
ہمالہ سب سے اونچا برف کا گھر
فضائے آسماں پر چھا رہا ہے
ہر اک وادی ہے جنت کا نمونہ
ہر اک دریا کا منظر غم ربا ہے
گھنے جنگل ہیں اونچی چوٹیوں پر
بشر جن سے ابھی نہ آشنا ہے
یہ گنگا جان ہے اس سرزمین کی
یہ جمنا اس چمن کی دلربا ہے
وہ مستانہ ادائیں گومتی کی
کہ شیخِ خشک بھی جن پر فدا ہے
نوا پیرا ادہر راوی کی موجیں
اُدھر گوداوری نغمہ سرا ہے
ادھر ستلج رواں ہے پیچ کھاتا
ادھر جویا کسی کا نربدا ہے

یہ کشور ہے تماشاؤں کا مسکن
پہاڑوں اور دریاؤں کا مسکن

جہاں میں بے نظیر اپنا وطن ہے
جہاں جنت بھی گم ہو وہ چمن ہے
تسلط اک طرف کوہِ گراں کا
سمندر تین جانب موجزن ہے
پہاڑوں کی سہانی وادیوں میں
ہجوم لالہ و سرو و سمن ہے
ہمیشہ چیت کا موسم ہے گویا
ہوا مشکیں، زمیں گل پیرہن ہے
فلک تاریک ساون کی گھٹا سے
چمن میں چھپ کے کوئل نعرہ زن ہے
یہی گھر ہے بہارِ جاوداں کا
غزل خواں بلبلِ شیریں سخن ہے
اِدہر صبحِ بنارس کی تجلی
اُدھر شامِ اودھ کا بانکپن ہے
فضائیں بانسری کی لے میں گم ہیں
بہشتِ رنگ و بو گوکل کا بن ہے
لگے ہیں سیم و زر کے ڈھیر ہر سو
مثالِ کیمیاء خاکِ دکن ہے

یہیں ہے فارغ البالی کا مسکن
مسرت اور خوش حالی کا مسکن

تمکین کاظمی

بھول

(زبیدہ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ہے گراماؤفون بج رہا ہے کسی مشہور گانے والے کا ریکارڈ ہے۔ کسی کے تیز تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے اور ماما آکر زبیدہ سے کہتی ہے)

ماما:۔ بیوی! ڈاکئیے نے یہ چٹھیاں اور کتابیں دی ہیں۔

(اخباروں اور رسالوں کے پیکٹ میز پر رکھنے کی آواز)

زبیدہ:۔ (لفافہ پھاڑ کر چٹھی نکالنے کی آواز) کریمن! گاڑی منگواؤ میں اماں جان کے ہاں جاؤں گی۔

کریمن:۔ بیوی! ابھی تو سرکار نہیں آئے، آپ چائے پی کر جائیں گی نا؟

زبیدہ:۔ چائے وائے میں نہیں پیوں گی سرکار آتے رہیں گے میں ابھی جاؤں گی جلدی گاڑی لاؤ۔

(کریمن جاتی ہے، قدموں کی چاپ)

زبیدہ:۔ (اپنے آپ گفتگو کرنے لگتی ہے) بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ نازو نیاز ہیں میں تو اس کو اپنی بہن ہی سمجھتی تھی اللہ رے قطامہ بڑی ہی کامنیاں نکلی بہن سے محبت جتا کر بہنوئی کو لگا رکھا ہے، بھلا اب دنیا میں کوئی کس کا اعتبار کرے بہن اور پھر بہن کی سوت اللہ کی قدرت ہے۔

کریمن:۔ بیوی گاڑی آگئی۔

(کریمن واپس جاتی ہے اور ایڑی دار بوٹ کی چاپ سنائی دیتی ہے۔)

سلطان:۔ (کمرے میں داخل ہوتا ہے اور ہنستے ہوئے پوچھتا ہے) یہ گاڑی کیوں کھڑی ہے کیا کہیں جا رہی ہو؟

زبیدہ:۔ ہاں، میں جا رہی ہوں۔

سلطان:۔ کہاں؟

زبیدہ:۔ جہاں سینگ سمائیں، ملک خدا تنگ نیست۔

سلطان:۔ اچھا، تو گویا سرکار خفا ہیں۔

زبیدہ:۔ جی اور خوش ہوں گی آپ نے کام ہی تو ایسا کیا ہے۔

سلطان:۔ میں نے کیا کیا؟

زبیدہ:۔ اللہ اللہ، بیچارے کچھ جانتے ہی نہیں، کتنے بھولے ہیں۔

سلطان:۔ صاف صاف کہو۔

زبیدہ:۔ صاف صاف کہوں، پوچھتے ہوئے لاج نہیں آتی۔

سلطان:۔ لاج کیسی؟

زبیدہ:۔ اللہ رے بے حیائی! اُف رے بے غیرتی پوچھتے ہیں لاج کیسی؟ خداوندا تو نے کیسے کیسے بے شرم پیدا کئے ہیں۔

سلطان:۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟ کہتی کچھ نہیں ہو شرم و لاج گنائے جا رہی ہو!

زبیدہ:۔ اجی آج تمہاری چوری پکڑی گئی ہے، تم تو کہتے تھے پرانے قصے بھول! آئندہ کے لئے میں نے

توبہ کرلی ہے!

سلطان: ذرا صاف صاف کہو میری سمجھ میں نہیں آیا!

زبیدہ: آپ کی سمجھ میں کیوں آنے لگا۔ ابھی اُڑیں گے آپ!

سلطان: شاید کسی نے مذاق میں تم سے کچھ کہا ہے اور تم بگڑ رہی ہو!

زبیدہ: جی ہاں مذاق ہی مذاق میں آپ کی چہیتی کی چٹھی میں نے پالی ہے' سمجھے آپ؟ آپ کی عاشقی کا حال کھل گیا' سنا آپ نے!

سلطان: واللہ تم تو پہیلیاں بجھوا رہی ہو؟

زبیدہ: جی پہیلیاں نہیں بجھوا رہی ہوں حقیقت حال سنا رہی ہوں چٹھی مجھے مل گئی ہے!

سلطان: میری سمجھ میں نہیں آتا! کس کی چٹھی کیسی چٹھی؟ کیا میری چٹھی ہے؟

زبیدہ: آپ کی چٹھی مجھے کیسے ملتی آپ تو بڑی احتیاط سے بھیجتے ہوں گے البتہ آپ کی راحت جان کی چٹھی میں نے پالی ہے۔

سلطان: میری چٹھی؟ میری لکھی ہوئی؟ حیرت ہے!

زبیدہ: کہہ تو رہی ہوں کہ آپ کی چٹھی مجھے نہیں ملی بلکہ آپ کی ایک محبوبہ کی چٹھی ملی ہے آپ ہیں کہ تو کہلا رہے ہیں!

سلطان: میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا؟ کس کی لکھی ہوئی چٹھی ہے؟ نام تو بتاؤ!

زبیدہ: معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بہت سی رانڈوں کو گھیر رکھا ہے اور کئی ایک سے خط و کتابت ہے اسی لئے کسی ایک کا نام سمجھ میں نہیں آتا!

سلطان: دیوانی عورت! ذرا تفصیل تو سنا!

زبیدہ: ہوشیار مرد! لے یہ تیری اس محبوبہ کا خط ہے جو چٹھی لکھ کر میرے ہی نام کے لفافے میں تیرے لئے بھی تسکین دل کا نسخہ رکھ دیتی ہے!

(زبیدہ میز پر سے ایک لفافہ اٹھا کر سلطان کو دیتی ہے)

سلطان: (لفافہ لیکر مسکراتے ہوئے) لاحول ولا یہ تو بشیر النساء کا خط ہے!

زبیدہ: دیکھا آخر خط پہچان لیا نا؟

سلطان: اری دیوانی! بشیر النساء کو تو میں اپنی بہن سمجھتا ہوں آخر وہ تمہاری ہی تو عزیز ہے' بھلا میں اس کی نسبت برا خیال کروں گا؟

زبیدہ: جی نہیں! آپ برا خیال کیوں کرنے لگے' صرف عاشقی کر رہے ہیں!

سلطان: توبہ کرو زبیدہ!

زبیدہ: توبہ ہے توبہ ایسے نیک شوہر سے!

سلطان: یہ خط تمہیں کب ملا؟

زبیدہ: اجی ابھی ابھی ۲½ بجے کی ڈاک سے یہ خط آیا ہے' نیک بخت نے مجھے خط لکھا ہے اور ایک چٹھی اپنے پیارے کے نام بھی ملفوف کر دی ہے اور کس محبت سے مجھے لکھا ہے کہ ملفوفہ چٹھی دولہا بھائی کو ضرور دے دینا اللہ ری ڈھٹائی۔

سلطان: (لفافے میں سے کاغذ نکال کر پڑھتا اور ہکلاتے ہوئے کچھ کہنے لگتا ہے) ......

زبیدہ: (سلطان کے ہاتھ سے چٹھی لے کر آواز بلند پڑھنے لگتی ہے)

میرے پیارے!

کل تمہارا کوئی خط نہیں آیا آج کی ڈاک بھی خالی گئی ایسے کیا مصروف ہو کہ بشیر کو تم نے بھلا دیا' کل اگر مجھے کوئی خط نہیں ملا' پرسوں میں خود تمہارے پاس پہونچ جاؤں گی اور یاد رکھو ایسی سخت سزا دوں گی کہ گذشتہ سزاؤں کو بھول جاؤ گے فقط صرف تمہاری

بشیر النساء

(زبیدہ خط کی عبارت ختم کرنے کے بعد ہچکیاں لے کر رونے لگتی ہے اور روتے ہوئے کہتی ہے)

زبیدہ: تو اب بھی کوئی بہانہ تراش لو! اس سے پہلے بھی دو تین چٹھیاں میرے نام کے خط میں بشیر نے تمہارے لئے بھجوائی تھیں وہ چٹھیاں میں نے تمہیں دیدیں نہ جانے اُن میں کیا تھا۔ آج اتفاقاً میری نظر پڑ گئی تو یہ قصہ معلوم ہوا نہ جانے تم کب سے اس طرح عاشق کر رہے ہو' بہن' بہن کی سوت بن رہی ہے اُف ری عورت!

سلطان: زبیدہ! یقیناً غلط فہمی ہو رہی ہے غالباً بشیر النساء نے اپنے شوہر کے نام چٹھی لکھ کر تمہارے خط میں غلطی سے رکھدی ہے۔

زبیدہ: (بات کاٹ کر) ہاں ضرور غلطی ہوئی کیونکہ میرے نام کے لفافے میں چٹھی رکھدی ہے ورنہ تمہارے نام الگ لفافہ آتا!

سلطان: زبیدہ! بشیر بڑی شریف لڑکی ہے تم خواہ مخواہ اس سے بدگمان ہو رہی ہو!

(زبیدہ چیخ چیخ کر رونے اور بسورنے لگتی ہے)۔

(قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے ماما تیز آتی ہے)

ماما: سرکار! بشیر بیگم کے دولہا میاں آئے ہیں!

سلطان: بلا لو!

(زبیدہ میز پر سے لفافہ اُٹھا کر چھپا لیتی اور آنسو پونچھنے لگتی ہے اور بشیر النساء کا شوہر داخل ہوتا ہے)

زبیدہ: (بھرائی ہوئی آواز میں) دولہا بھائی! آپ کب آئے؟

بشیر کا شوہر: ابھی تو آرہا ہوں! (سلطان سے مخاطب ہو کر) بھائی سلطان! بشیر کا کوئی خط تو نہیں آیا؟

سلطان: (پریشان ہو کر زبیدہ کی طرف دیکھتا ہے اور زبیدہ غصے سے سلطان کی طرف گھورنے لگتی ہے سلطان پریشان ہو کر جواب دیتا ہے)۔ کیوں بھائی! کس لئے پوچھ رہے ہو آج ہی ایک خط زبیدہ کے نام آیا ہے!

بشیر کا شوہر: جی زبیدہ کے خط سے غرض نہیں آپ کے نام بشیر کا کوئی خط آیا ہو تو کہئے!

سلطان: (مردہ آواز میں) زبیدہ کے خط میں ایک چٹھی اور تھی مگر شاید وہ میرے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔

بشیر کا شوہر: وہ چٹھی مجھے دیدیجئے!

سلطان: کیوں؟

بشیر کا شوہر: مجھے ضرورت ہے!

زبیدہ: (مارے غصے کے سانس پھول جاتا ہے اور آنکھوں سے چنگاریاں سی نکلتی نظر آتی ہیں کپکپاتی آواز میں کہتی ہے) چٹھی دیدو نا!

بشیر کا شوہر: (زبیدہ کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے) واللہ بڑا پر لطف نظارہ ہے اسی نظارے کی خاطر میں اپنا کام خراب کر کے آیا ہوں!

زبیدہ: آپ کو اس چٹھی کا حال معلوم ہے؟

بشیر کا شوہر: ہاں مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس کا مضمون کیا ہے یہ چٹھی میرے پیارے سے شروع ہو کر صرف تمہاری پر ختم ہوتی ہے۔

زبیدہ: اُف ری بے حیائی! دنیا سے شرم اُٹھ گئی ہے!

بشیر کا شوہر: (ہنستے ہوئے جیب میں سے ایک لفافہ نکال کر زبیدہ کو دیتا ہے) یہ خط تو پڑھو!

زبیدہ: یہ تو بشیر کا خط ہے آپ کے نام!

بشیر کا شوہر: ہاں لفافہ تو میرے ہی نام ہے خط تو پڑھو!۔

(زبیدہ لفافے میں سے خط نکال کر پڑھتی ہے
اور مسکراتے ہوئے لفافہ بشیر کے شوہر
کو واپس کر دیتی ہے سلطان اس کی طرف
حیرت سے دیکھتا ہے، بشیر کا شوہر لفافے
میں سے خط نکال کر آواز سے پڑھتا ہے)

سلطان بھائی

آج جنوری کی گیارہ تاریخ ہے مگر آپ نے
اب تک اس مہینے کے نئے رسالے نہیں بھیجے، ادبی دنیا،
نگار، اور پیام ادب ضرور بھجوایئے۔ فقط

خادمہ بشیر النساء

بشیر کا شوہر: آج صبح مجھے خط ملا لفافہ جو چاک کرتا ہوں تو
اندر سلطان بھائی کے نام کی چٹھی تھی میں نے
سمجھ لیا کہ غلطی سے میرے نام کی چٹھی سلطان
کو بھیجی گئی ہے میں دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے
کسی طرح یہ چٹھی زبیدہ کی نظر سے گزرے اور
دونوں کی کشمکش میرے سامنے ہو شکر
ہے کہ میں وقت پر پہونچ گیا۔

(تینوں مل کر قہقہہ لگاتے ہیں، زبیدہ
ماما کو آواز دے کر چائے منگواتی ہے)

طبعزاد۔

جمیلہ!

ادیب مالیگانوی

اب وہ ساقی ہے نہ وہ مے نہ وہ پیمانۂ عشق
کس کے جاتے ہی گئی رونق میخانۂ عشق
شعلۂ حسن سے بزم محبت نہ رہا
کون دیکھے تپش اندوزیٔ پروانۂ عشق
کوئی مضراب زن ساز تمنا ہی نہیں
ورنہ ہے برق اثر نغمۂ مستانۂ عشق
ان کے دم تک تھا حقیقت ہی حقیقت ہمدم
اب تو افسانہ ہی افسانہ ہے افسانۂ عشق
ذرے ذرے میں نظر آتا تھا اک شہر جنوں
کبھی آباد سا آباد تھا ویرانۂ عشق
جب کوئی وقف تھا آرائش محفل کے لئے
تھا مرا خانہ، بر باد، پریخانۂ عشق
حسن کو شوق، کہ ہوں صرف سب انداز جمال
عشق کو لاگ کہ ہو جان بھی نذرانۂ عشق
وہ تھے یا دولت کونین، میسر تھی مجھے
وہ شب ماہ، وہ تنہائی وہ کاشانۂ عشق
حسن کے ساز نے کچھ سوز جو دے رکھا تھا
ناز کرتا تھا اسی سوز پہ پروانۂ عشق
کیسے اس ساعت زریں کو فراموش کروں
حسن پہ عشق فدا، حسن تھا دیوانۂ عشق
آج بھی میں ہوں جمیلہ کا پرستار ادیب
آج بھی ہے وہی مسجود صنم خانۂ عشق

ہلال احمد

فردیّت

فلسفۂ فردیت

کا اصل اُصول یہ ہے کہ ریاست پر لازم ہے کہ جہاں تک ممکن ہو فرد کے ذاتی معاملات میں کم سے کم دخل اندازی کرے۔

اُنیسویں صدی میں یورپ میں یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ حکومت کے اختیارات حد سے متجاوز ہیں۔ لہٰذا یہ اختیارات حکومت سے چھین کر فرد کی تحویل میں دیدیئے جانا چاہئیں۔ اس انحراف کے اسباب اقتصادی اور معاشی تھے۔ نئے ممالک کی دریافت اور مشین کی ایجاد نے لوگوں پر تجارت کی نفع بخشی کا راز فاش کر دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ تجارت حکومت کے اثر سے قطعی آزاد ہو۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک ہمہ گیر ہوگئی۔

فردیت کو بعض پائے کے مفکروں نے موضوع فکر بنایا ہے۔ مثلاً جرمن فلاسفر کانٹ اور انگریز علماء جان اسٹوارٹ مِل اور اسپنسر۔ اُن کا کہنا ہے کہ ریاست کا وجود فرد کی خوشحالی اور مسرت کے لئے ہونا چاہیئے اور یہ مسرت صرف اسی صورت میں حاصل کی جاسکتی ہے جبکہ ریاست فرد کے ذاتی معاملات سے سروکار نہ رکھے۔

حامیانِ فردیت کی رائے میں ریاست کو اپنے وظائف بہت محدود کرلینا چاہئیں۔ اُسے صرف قیامِ امن اور ملکی دفاع تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھکر بقیہ اُمور فرد پر چھوڑ دینا چاہئیں۔ فرانسیسی مفکر جلیس سائمن ————— کے نزدیک ریاست کو جامد ————— بن جانا چاہیئے۔ ————— فری مین ————— اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ "ریاست کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کی انسانیت تشنۂ تکمیل ہے۔"

فردیت کے وکلاء عام طور پر چار قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں:۔

(۱) انصاف کا تقاضہ ہے کہ اپنی شخصیت کو بنانے بگاڑنے کا فرد کو کامل اختیار رہو۔ قدرت نے ہر جاندار کو بعض خصائص ودیعت کئے ہیں جن کے تحت وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اگر ریاست کی جانب سے اس پر پابندیاں نہ ہوں تو وہ صلاحیت کے مطابق اپنی شخصیت کو ڈھال لے گا۔ تعلیم و تربیت کے اُمور میں دخل اندازی کرکے ریاست فرد پر سخت ظلم کرتی ہے۔ ریاست کے احکام کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ تمام افراد ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں۔ یہ نہ صرف فرد بلکہ پورے سماج کی بہبود کو غارت کرنے کے مرادف ہے۔

مِل اپنی کتاب "آزادی" میں لکھتا ہے کہ بدترین اخلاق سوز رائے کے اظہار پر بھی بندش نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ اس طرح نیکی کے محاسن زیادہ روشن ہو جائینگے۔

مگر افعال کے بارے میں مِل کی رائے مختلف ہے۔ افعال کے وہ دو حصے کرتا ہے:۔

(۱) وہ افعال جن کا اثر محض فرد کی ذات تک محدود رہے۔ جیسے لباس کھانا پینا وغیرہ۔

(۲) وہ افعال جن سے کرنے والے کے علاوہ

دوسرے افراد بھی اثر پذیر ہوں جیسے ننگا رہنا وغیرہ۔ ایسی مذموم حرکتیں مِل کی رائے میں قابلِ مواخذہ ہیں لیکن اسکے دوسرے ہم مسلک اس باب میں خاموش ہیں۔

(۲) بہت سے حامیانِ فردیت اپنے استدلال کو طبیعات سے جا ملاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ طاقتور کا کمزور کو ہڑپ کر جانا اور اس طرح اپنی بقا کے لئے جد و جہد کرنا قدرتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ایک طرف قوی جاندار بھوکوں مر جائیں گے۔ دوسری طرف نیم جان کیڑے کوڑوں کی بہتات ہو جائے گی۔ اسپنسر جو خود طبیعات کا ایک متین طالب علم تھا اسی استدلال کا سہارا لیتا ہے۔ وہ ریاست کی اس حکمت عملی کی کڑی نکتہ چینی کرتا ہے کہ وہ قوانین کے ہیر پھیر سے سب افراد کے لئے ترقی کا ایک ہی معیار مقرر کرتی ہے۔ نتیجتہً وہ افراد جن میں ترقی کی صلاحیت جنم سے مفقود ہو جیسے جیتے تیسے جیتے رہتے ہیں اور اپنے وجود سے معاشرے کے تعفن میں اضافہ کرتے ہیں۔

اسپنسر امداد غرباء سے متعلق قانون سازی کا بھی سخت مخالف تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایسے قوانین نافذ کر کے ریاست ایک انتہائی نوعیت کے جرم کا ارتکاب کرتی ہے لوگوں کو مفت خوری کی عادت ڈلواتی ہے۔ اُن کی آگے بڑھنے کی صلاحیت کو کچل کر رکھدیتی ہے۔ وہ جد و جہد سے عاری آپاہج بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے نزدیک یہ فعل نظامِ فطرت میں دست اندازی ہے۔ اس کی کتاب "سماجی عدد یات" ایسے بیانات سے بھری پڑی ہے۔ وہ بار بار فرد کو ریاست سے قطع تعلق کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

(۳) متذکرۂ بالا دونوں دلائل اُنیسویں صدی کے حامیانِ فردیت کی طرف سے پیش کئے جاتے تھے۔ جدید فردیت کے وکلاء اپنی منطق کو ایک نیا لباس پہناتے ہیں۔ ایسے ہی ایک انگریز صاحب علم نارمن اینجل ہیں۔ انھوں نے اپنے طویل مقالے "عظیم غلط نگاہی" میں فردیت کو معاشیات کے نقطۂ نظر سے اُجالا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا زمانہ وہ تھا جبکہ پہلی جنگِ عالمگیر ہنوز ختم ہی ہوئی تھی۔ دنیا جنگ کے ہولناک عواقب سے دوچار ہو رہی تھی۔ بیکاری اور سیاسی و اقتصادی بحران کا دور دورہ تھا۔ وہ فردیت کا جواز یہ کہکر ثابت کرتے ہیں "انسان کی تمام تر دوڑ دھوپ کی اساس اقتصادی ہے۔ معاشی مفادات کا باہمی تضاد و تخالف لڑائی بھڑائی کی جڑ ہے۔ فطرتاً آدمی اسی کام کو لگن سے کرتا ہے جس سے اسے زیادہ سے زیادہ مالی فائدے کی اُمید ہو۔ موجودہ زمانے میں آپس کی رقابت کے باعث حکومتیں کچھ اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتی ہیں کہ افراد نفع بخش اشیاء کا انتخاب صحیح طور پر نہیں کر پاتے۔ اگر ریاست کو نشر و اشاعت کے حق سے محروم کر دیا جائے تو جھگڑے ٹنٹے آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے۔

اس نقطۂ نگاہ کے حامیوں کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ افراد کو صنعت و حرفت کے میدان میں خود مختاری عطا کرنے سے ریاست فائدے ہی میں رہے گی نقصان میں نہیں۔ کیونکہ آخر ریاست کا مفاد افراد کے اجتماعی مفادات کے سوا کیا ہے؟

(۴) چوتھی اور آخری دلیل فردیت کے حامیوں کی یہ ہے کہ ریاست کو غلط کاریوں سے پاک سمجھ بیٹھنا بھاری غلطی ہے۔ برخلاف اس کے حقیقت یہ ہے کہ ریاست کا شاید ہی کوئی فعل ایسا ہو جو صحیح وقت اور درست طریق پر انجام دیا جاتا ہو۔ ریاست کے کرتا دھرتا کون ہوتے ہیں؟ افسران و حکام۔ یہ لوگ ہمیشہ اخراجات میں بے جا سخاوت کرتے ہیں کیونکہ اُن کو پبلک کے روپئے کا درد نہیں ہوتا وہ جانتے ہیں کہ اس میں اگر ان کا کوئی حصہ ہے بھی تو آٹے میں نمک سے بھی کم۔ فرد خرچ کرے گا تو آگا پیچھا سوچ کر کرے گا۔ وجہ یہ کہ یہ اس کے اپنے مستقبل کا سوال ہوگا۔ اسے احساس ہوگا کہ ذرا سی بھول چوک اُسے خطرات میں

بتلا کر سکتی ہے۔

فردیت کے مخالفین اس کی کاٹ کرتے ہوئے جو مختلف نوعیتوں کے اعتراضات کرتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

(۱) فردیت انسان کو انسان نہ سمجھ کر فرشتے کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ اس پر غور نہیں کرتی کہ کمزوری انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ فردیوں نے بلا سوچے سمجھے یہ فرض کر رکھا ہے کہ تمام افراد میں دور اندیشی اور غور و فکر کا مادہ برابر برابر ہے، ہر شخص کو اپنی ضروریات کی تکمیل کے ذرائع پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ فرد کی فلاح ساری ملت کی فلاح کے متوازی جاتی ہے۔

(۲) فردیت کے حامی آزادی کا جو مفہوم لیتے ہیں وہ مبہم اور غیر واضح ہے۔ ہر قسم کے بندھنوں کو توڑ دینا آزادی نہیں بے راہ روی ہے۔ مثلاً اگر فرد کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دیدی جائے اور وہ بلا جھجھک بیچ بازار میں رفع حاجت کرنے بیٹھ جائے تو ریاست تو باز پرس کرنے سے رہی لیکن اس کے پڑوسیوں کو اس کی اس خدمت کے کارن جس تکلیف کا سامنا ہوگا وہ ظاہر ہے۔

(۳) ریاست کو یکسر اغلاط کی پوٹ سمجھ لینا اور یہ خیال کرنا کہ اس کے افعال فرد کے مفاد کے منافی ہوتے ہیں معقولیت سے بعید ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اکثر حالتوں میں ریاست فرد کے نجی معاملات میں دست اندازی کر کے اس پر بڑا احسان کرتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی وجہ سے اپنے بچے کو اسکول نہیں بھیجنا چاہتا ریاست حکماً اسے تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ صریحاً والدین کی آزادی میں مداخلت کرنا ہے۔ مگر یہ بھی تو سوچئے کہ اس وقتی مداخلت نے نہ صرف بچے کی زندگی سدھار دی بلکہ ماں باپ کے اطمینانِ قلب کا سامان بھی کر دیا۔ اشیاء کے محض سلبی پہلو پر نگاہ رکھنا اور ایجابی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دینا غلطی ہے۔

(۴) انسان معاشرتی جاندار ہے۔ افراد کے مفادات باہم اس درجہ مربوط ہیں کہ اُن کو الگ کیا ہی نہیں جا سکتا تارک الدنیا فقیر بھی زندگی کی گرم بازاری سے منہ موڑ لینے کے باوجود دنیا سے سو فیصدی تعلق نہیں توڑ سکتا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک آدمی آنکھیں موندے ناک کی سیدھ چلا جاتا ہو اور دوسرے راہ گیروں سے اسکی ٹکر نہ ہو؟

(۵) اسپنسر نے وارڈن کے نظریۂ ارتقاء کے زیر اثر یہ رائے قائم کی کہ سبھی لوگوں کے لئے ترقی کی ایک راہ تجویز کرنا قانونِ فطرت کی خلاف ورزی ہے۔

جس طرح شیر جنگل کے چھوٹے موٹے جانوروں کا شکار کر کے زندہ رہتا ہے اسی طرح ارتقاء کے عمل میں کمزور انسان بھی مر کھپ جاتے ہیں یا کم از کم مر کھپ جانا چاہیئے اور اس طرح قوی انسانوں کے لئے راستہ صاف ہو جانا چاہیئے۔ نیز یہ کہ دکھی غریبوں کی مدد کر کے ریاست ان کی جبلی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے سے روک دیتی ہے۔

منطق کے لحاظ سے کسی دلیل کا اندازہ ہونا دوسری بات ہے مگر اسپنسر کی اس رنگ آمیزی سے فردیت کا اخلاقی پہلو بہت مکروہ ہو گیا۔ اور لوگ اس سے بیزار ہونے لگے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سماج ماہیئت کے اعتبار سے ایک انسانی ادارہ ہے۔ اُس کے قواعد کی تدوین میں حیوانی دنیا کے اُصولوں کی ٹھونس ٹھانس ناقابل برداشت ہے۔

(۶) تاریخی تجربے کے پیش نظر بھی فردیت کو قابل عمل قرار دینا دشوار ہے۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں جنتا کی روش سے مرعوب ہو کر بہت سی یورپی حکومتیں افراد کے ذاتی قضیوں میں پاؤں اڑانے سے کترانے لگی تھیں۔ چنانچہ انگلستان میں یہ کیفیت ہوئی کہ کارخانہ دار مزدوروں سے بے حد کام لیتے تھے وہ بے چارے زیادہ اُجرت کے لالچ میں دن رات

بجتے رہتے تھے نتیجۃً قومی صحت کا ادارہ گھٹنے اور شکایتیں بڑھنے لگیں پریشانیوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا بات بگڑتی دیکھکر حکومت نے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی ترک کردی۔

مندرجۂ بالا سطور کو پڑھنے کے بعد ایک غیر جانبدار شخص یہ رائے قائم کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ فردیت انسان کی جس فارغ البالی اور بے فکری کا خواب وہ اپنی جگہ احسن ہے لیکن اُس کے لئے جو وسائل اختیار کرنے کی ترغیب دیتی ہے وہ نا مکمل بلکہ غیر دانشمندانہ اور تباہی کی طرف لیجانے والے ہیں۔ کون نہیں چاہتا کہ اس کے معاملات میں دوسرے لوگ مخل نہ ہوں مگر ساتھ ہی یہ کون چاہتا ہے کہ وہ ذمہ داریاں بھی اکیلے اسی کے سر پر آپڑیں جو سدا سے مشترکہ طور پر سارا سماج سنبھالتا آیا ہے؟۔

اپنے گاؤں کی یاد میں

سید ضمیر جعفری

وہ دُلہن کی طرح نکھرے ہوئے شاداب ویرانے
وہ یکسر اک ہجوم انجم و مہتاب ویرانے
لرزتی، گنگناتی مستیاں سنسان راہوں میں
دئیوں کے مضمحل شعلے مقدس خانقاہوں میں
وہ اِک رومانیت تالاب کے ٹوٹے کناروں پر
وہ اِک شاداب سی مستی، سُہانے سبزہ زاروں پر
ہوائیں پھیلتی موسیقیاں، ساکت اندھیروں میں
فضائیں جاگتی رعنائیاں روشن سویروں میں
لب جہلم پہ کچھ معصوم سی آبادیاں ہر سو
(طلسمی وادیوں میں خواب کی شہزادیاں ہر سو)
ہجوم لالہ و گل، زرفشاں زرکار وادی میں
ملائی گھاٹیاں، وہ ریشمیں اشجار وادی میں
نظر کی وسعتوں میں پھیلتے گلزار دھانوں کے
وہ کچھ بے ربط مدھم سلسلے کچے مکانوں کے
رسیلی بنسری کی جوڑیاں، شیشم کے "دوتارے"
چراگاہوں میں الھڑ راگ کے بہتے ہوئے دھارے
لبِ دریا۔ گھڑوں کے ساز ۔۔ دوشیزاؤں کے نغمے
کنواری بیٹیوں کے ساتھ سادہ ماؤں کے نغمے
طلسم انگیز شامیں، وہ بھرے ساون کی برساتیں
وہ خود رَو جھاڑیوں کی اوٹ میں رنگیں ملاقاتیں
کشادہ ۔ گرد میں ڈوبے ہوئے ماتھے کسانوں کے
سُنہری مچھلیوں والے بھرے بازو جوانوں کے
سہانی ۔ سانس لیتی چاندنی میں رات کا منظر
کھری چاندی کے سوتے جاگتے ذرات کا منظر!
گزی گاڑھے کے کرتے، چھینٹ کی خود رنگ شلواریں
وہ لمبے دامنوں پر سُوت کی کاڑھی ہوئی تاریں
مقدس، آسمانی سادگی، ڈھیلے لبادوں میں
نگاہوں میں حیا، پاکیزگی مبہم اِرادوں میں

مرے مغموم دِل کا غنچۂ افسردہ کھل جائے
مجھے اے کاش! پھر وہ جنتِ گم کردہ مِل جائے

ہماری ۱۹۴۳ء کی ہر دلعزیز مطبوعات

نمبر	کتاب	مصنف	روپیہ	آنہ	پائی
۱	ادب اور انقلاب	ڈاکٹر اختر حسین رائپوری	۳	۸	۰
۲	گرداب	احمد ندیم قاسمی	۳	۱۲	۰
۳	لہریں	ڈاکٹر شفیق الرحمان	۳	۱۲	۰
۴	افسانے اور ڈرامے	سعادت حسن منٹو	۲	۱۲	۰
۵	زندگی کے نئے زاویئے	رئیس احمد جعفری	۳	۰	۰
۶	مضامین عبدالماجد دریابادی		۴	۴	۰
۷	محمد علی	مولانا عبدالماجد دریابادی	۲	۱۲	۰
۸	مردوں کی مسیحائی	" " "	۴	۴	۰
۹	یقین وعمل	عبدالقدوس ہاشمی	۲	۸	۰
۱۰	مقالات محمد علی	مرتبۂ رئیس احمد جعفری	۳	۱۲	۰
۱۱	مقالات محمد علی حصہ دوم	" " "	۳	۱۲	۰
۱۲	رنگ محل	ساغر نظامی	۳	۱۲	۰
۱۳	نغمات ماہر	ماہر القادری	۳	۰	۰
۱۴	محسوسات ماہر	"	۳	۰	۰
۱۵	ٹیگور اور اُن کی شاعری	مخدوم محی الدین	۱	۸	۰
۱۶	کاروانِ علم	فیض محمود بادشاہ حسین	۳	۰	۰
۱۷	اقبال کا تصورِ زمان ومکان	ڈاکٹر رضی الدین	۰	۱۲	۰
۱۸	سیاست جاپان	علی امام بلگرامی	۰	۱۰	۰
۱۹	اقبال کے خطوط جناح کے نام		۰	۵	
۲۰	ابن خلدون کے سیاسی ومعاشرتی نظریئے	پروفیسر عبدالقادر	۰	۶	
۲۱	جمہوریہ چین	میسر عابد علی خاں	۱	۱۲	۰

اِدارۂ اشاعت اُردو

عابد روڈ حیدرآباد (دکن)

مسرور احمد
بی۔اے

سحرِ دلبراں

اُن پرسکون اور شیریں لمحوں کی یاد آج بھی اِتنی تازہ ہے جتنی اس رات تھی جبکہ چودہویں کا ماہتاب ڈرائنگ روم کی چھوٹی سی کھڑکی میں اپنی بے شمار آنکھوں سے پیکرِ تبسم نسیمہ سے چشمک زنی میں مصروف تھا۔اور میں خودفراموشی کے عالم میں فضائی کیفیات سے ناآشنا ذرا بھی اندازہ نہ لگا سکتا تھا کہ یہ سحرطرازی میرے معصوم قلب کو کسی بے پایاں سمندر کے گہرے بھنور کی طرف غیرمحسوس طور پر کھینچے لئے جا رہی ہے۔زمانہ نے جس تیزی سے کروٹ بدلی اس کو میں نہ اس وقت سمجھ سکا اور نہ آج۔اِتنا ضرور یاد ہے کہ میں ایسے تیز دھارے میں بہتا چلا جا رہا تھا جہاں دم مارنے کی مجال نہ تھی۔آخرکار وہ وقت بھی آگیا کہ میں نے نیم مدہوشانہ کیفیت میں اس بھنور میں کئی چکر کہائے اور گرداب کے ہیبتناک شوروشغب میں ہلکی سی چیخ کے ساتھ اس عالم میں پہنچ گیا جہاں ہرشئے شباب کی رنگینیوں سے لبریز تھی۔اور ہزاروں نرم ونازک مجسمے مسرت وانبساط کا سرچشمہ بنے ہوئے صرف ایک ہی رشتہ محبت میں منسلک نظر آتے تھے وہاں دوئی کا نام نہ تھا۔ان کا مقصدِ حیات ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ آستانہ محبت پر نذرِعقیدت چڑہاتے رہیں۔وہ اِس فرض کی ادائی میں جس جوشِ عقیدت کے ساتھ ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش کر رہے تھے۔اُن کے شگفتہ چہروں سے نمودار تھا۔

ہنوز میری نگاہیں اُن کیف پرور نظاروں سے سیر نہ ہوئی تھیں کہ میری زندگی کے رنگین باب میں تمناؤں، آرزوؤں۔اور بے پایاں جذبوں کا قافلہ داخل ہوا میں یہ محسوس کرنے لگا کہ نیچر مجھے دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ہرشئے میں شگفتگی اور لطافت دکھائی دیتی تھی۔اور اس سے جس انس کا اظہار ہوتا تھا وہ خاردار جھاڑیوں اور خشک ہنروں میں اس سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوا تھا۔

میری طرح نسیم کے جذبات بھی روزافزوں تھے میں اپنے دل ہی دل میں داد دیتا تھا۔اور خاموشی سے ہجر کی گھڑیوں کو پیامِ عشق لکھ لکھکر کاٹتا۔ہزاروں مرتبہ لکھا اور چاک کیا۔دل کی رام کہانی صاف صاف لکھدینا چاہتا تھا لیکن جب لکھنے بیٹھتا تو سوائے نسیمہ کے اور کچھ یاد نہ آتا۔اِس عالم میں نسیمہ ہی نسیمہ مجھ پر چھائی ہوئی تھی۔اگر کچھ اِحساس تھا تو صرف اِتنا کہ ایک پیاری موہنی صورت رہ رہ کر سامنے آتی ہے اور آناً فاناً غایب ہوجاتی ہے۔محبت کے افسانہ کی تکمیل کے لئے دونوں محبت کے مارے ہوئے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے اِن کی مثال ان دو چھوٹے بچوں کی سی تھی جو تنگ وتاریک کمرہ میں نتیجہ پر غور کئے بغیر گھس جانے کی کوشش کرتے ہیں اور آخرکار مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار بنجاتے ہیں

"رنج" اور "خوشی" دو توام بہنیں ہیں جن کی کمر جڑی ہوئی ہے یہ اپنے رقص میں اِنسان کو محو رکھتی ہیں ان دونوں کے ناچتے وقت جب خوشی کا جگمگاتا رخ سامنے آتا ہے تو اِنسان اسی کے نظارہ کی روح پرور

کیفیتوں میں کھونے لگتا ہے یعنی اُس وقت "رنج" بجائے خوشی کے اپنا بھیانک چہرہ پیش کر دیتا ہے۔ اور اس طرح انسان کی ساری خوشیوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ میں نسیمہ کو دیکھتا اور خوش ہوتا تھا لیکن یہ خوشی زیادہ عرصہ تک رہنے والی نہ تھی۔ محبت کے جواب میں محبت —— یہی اس کشمکش کا ماحصل ہے لیکن نسیمہ کی بے اعتنائی نے آخرکار راز افشا کر دیا کہ جو آتش اس کے قلب میں فروزاں ہے اس کا لگانے والا کوئی اور ہی خوش نصیب ہے۔ اس کی گریہ وزاری اور شب و روز کی بیقراری میرے لئے نہیں کسی اور کے لئے ہے۔

آہ۔ اس انکشاف نے جذبات میں شدید ہیجان پیدا کر دیا اور غیرت و حرمان کے ملے جلے احساس نے بری طرح اکسایا کہ اس روحانی صدمہ کا انتقام لیا جائے مگر کس سے۔ اور کس کے مقابلہ میں جس سے میں کل تک محبت کرتا تھا۔ اس سے! پھر وہ محبت جو ازلی ہے۔ اور جو اب بھی کسی نہ کسی انداز میں میری ہستی کو اپنی زبردست گرفت سے آزاد کرنے کے لئے تیار نہیں! ایسے انقلابی دور میں جبکہ میزان حیات کا پلہ کسی ایک طرف جھک جانے کے خطرہ سے دوچار ہو رہا ہو اور انسان کی بہترین خصوصیات کے خلاف قوی تر امور کی کارفرمائی کے اندیشے لاحق ہوں تو آسان راہ یہی ہے کہ انسان اعلیٰ مثال قایم کرے۔ محبت سے انتقام 'محبت کے مقابلہ میں' میری ہی قربانی ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے میں اپنے آپ کو آمادہ پاتا ہوں۔ پیاری نسیمہ' وسیم کی پجارن ہے۔ وہ میرا گہرا دوست اور بچپن کا یار ہے۔ نسیمہ کی خاطر اب میں اس سے اور زیادہ لگاؤ محسوس کر رہا ہوں۔

نسیمہ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ "خاتون" ہے اس کے احساسات پاک اور نازک ہیں اور خیالات اعلیٰ —— وہ اپنا حق سمجھتی ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ چاہا جائے اور اس فرض کی ادائی کے لئے اس نے وسیم کا انتخاب کیا ہے۔ وسیم قبول صورت اور بے باک نوجوان ہے۔ بعض اوقات اس کی گفتگو سے بدذوقی کا اظہار ہوتا ہے تاہم اس کی دوسری خصوصیات کے مقابلہ میں اس کمزوری کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ سنجیدہ زندگی کے خشک اثرات کو مرغوب بنانے کے لئے نسیمہ نے اس شگفتہ لیکن تیز رنگ کا انتخاب کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ محبت پر تاریخی یا منطقی حیثیت سے نظر نہیں ڈالی جا سکتی۔ جو قوتیں اس عالم میں کارفرما ہوتی ہیں ان کو صرف وہی جان سکتا ہے جس کو ان سے دوچار ہونے کا موقع حاصل ہوا ہو۔ یہ ان واقعات میں سے ایک ہے جن کو معرض بحث میں نہیں لایا جا سکتا۔ وسیم 'نسیمہ کا انتخاب ہے' اس کی خوشی ہے' اور اس کے دل کا سکون ہے۔ نسیمہ کو وسیم کی آغوش مبارک!

نسیمہ میرا احترام کرتی ہے۔ اور جب کبھی محبت بھری نظر سے میری طرف دیکھتی ہے تو اس کی پُرنم آنکھوں سے اس مجبوری کا انکشاف ہوتا ہے جس کا وہ شکار بنی ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نسیمہ دل کے ہاتھوں بک چکی ہے۔ اس کے باوجود میں اس کی خوشی میں برابر کا شریک ہوں۔ اس کی ہر مسکراہٹ میری زندگی کا سہارا اور میرے اجڑے ہوئے دل کی رونق ہے۔ میں آج بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہوں جتنی کہ چودھویں کے چاند کی تاروں بھری رات میں۔

اُمید رضوی

غزل

وجہ سکونِ قلب ہو شورشِ اضطرار کیا
آپ کا منتظر جو ہو آنے اسے قرار کیا!
کارگہِ حیات میں جبر کا آئینہ ہیں ہم
زندگی بس میں جب نہیں موت پہ اختیار کیا
جس میں ہے ہوشِ بیکسی عشق وہ خام ہے ابھی
کاہشِ جاں گداز کیوں شورشِ اضطرار کیا
جاگنے والے ہجر کے ختم بھی کر یہ داستان
موت کا انتظار کر اس کا ہے انتظار کیا
آئینگے آپ آئینگے آپ ضرور آئیں گے
آپ کا وعدہ سچ مگر آپ کا اعتبار کیا
بخشنے والے درد کے مجھے درد مستقل
سوزِ دوام چاہیئے عارضی اضطرار کیا
آپ ہیں میری زندگی آپ ہیں وجہ زندگی
آپ کو بھول کر میری زیست کا اعتبار کیا
جھوٹی تسلیاں بھی کیا ہونگی سکون کا سبب
آپ ہی دل میں سوچئے آئیگا یوں قرار کیا
حسن پہ اعتماد بھی عشق کی ہیں ہلاکتیں
حسن خود اک فریب ہے حسن کا اعتبار کیا
آپ کے وعدے ہیں لیکن وجہ سکون غلط غلط
دل کی لگی بجھا سکے آتشِ انتظار کیا
چاندنی رات تاج[1] کی آج بھی ہے نگاہ میں
آتا ہے اس فضا میں پھر اب بھی کوئی نگار کیا

[1] تلمیح

ہماری نئی کتابیں

ضربیں	قیسی رامپوری	ے
زلزلے	قدوس صہبائی	عہ ۱۲؍
انگڑائیاں	احمد ندیم قاسمی	ے ۴؍
سیلاب	” ”	ے ۸؍
کردار	ماہر القادری	عہ ۴؍
زندگی کی ٹھوکریں	جعفری	ے ۴؍
تعدیریں	منظور بخاری	عہ
پریم پجارن	قدوس صہبائی	۱۴؍
مردِ انقلاب	” ”	۱۲؍
شادی اور محبت	مقصودہ فرحت	۱۲؍
بخارا کا جمہوری انقلاب		۹؍
ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر		۹؍
خدا اور کائنات	ماہر القادری	۹؍
سیاروں پر زندگی کے امکانات		۹؍

اِدارہ اشاعتِ اُردو

عابد روڈ۔ حیدرآباد (دکن)

منظور بخاری

آرام

محنت کے بغیر کہیں آرام نہیں، یہ بات زبان زدِ عام ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی محنت ہی کئے جائے اور اِتنی محنت کرے کہ آرام کا حَظّ اُٹھانے کے قابل ہی نہ رہے، آدمی کبھی منازلِ ترقی طے نہیں کر سکتا اگر اُس کی زندگی صرف مشقت ہی مشقت ہے، بعض آدمی کام میں بہت زیادہ منہمک ہو جاتے ہیں، اور یہ اِنہاک اِضمحلال پیدا کرتا ہے جس سے اِنسان کسی تفریح سے لطف اَندوز نہیں ہو سکتا مصروفیت کے باعث دماغ بیکار ہو جاتا ہے جس سے آزاد خیالی کم ہو جاتی ہے اِنسان کی طبیعت کا رُجحان صرف ایک ہی طرف ہوتا ہے اِسے اگر آرام بھی ملتا ہے تو بے سُود۔ موم بتی کی طرح دن اُس کے سامنے پگھلتے رہتے ہیں۔

کام جب ذلیل محنت چاہے تو کبھی نفع بخش نہیں ہوتا، کیونکہ ذلت کبھی اخلاقی بلندی پیدا نہیں کر سکتی اِس لئے کہ اس کا میلان ہمیشہ پستی کی طرف ہوتا ہے۔

کام اِنسانیت کا نہ منتہائے مقصود ہے اور نہ انجام اگرچہ یہ حاصلِ دُنیا نہیں مگر پھر بھی دنیاوی نعمتوں سے بلند و بالا ہے۔

قوتِ لایموت کے حصول کے لئے مصروف رہتے ہوئے آزاد رہنا بھی بڑی چیز ہے کام کرنا رذالت نہیں ہے مگر یہ سفلہ پن ہے کہ اِنسان ایک روپیہ کمائے اور ہر روزانہ خرچ کر کے اس خیال سے بیکار بیٹھا رہے تا آنکہ روپیہ ختم ہو جائے۔

بالزاک کہتا ہے کہ اگر سوسائیٹی کے میدانوں سے ہم نے لاکھوں من خوشی اکٹھی بھی کر لی پھر بھی اِختتامِ ماہ پہ یہ ہمارے قرضے کی اَدائیگی نہیں کر سکتی اِس لئے محنت کرو محنت کرو۔ دماغی عرق ریزی سے ہمیں اپنی کھیتی کو پانی دیتے رہنا چاہیئے۔

اگرچہ بعض اوقات تونگری اخلاق کو تباہ اور دل کو پتھر بنا دیتی ہے مگر مفلسی بھی روحانیت اور جراءت کو فنا کر دیتی ہے، اِنسان کے بستر پر کانٹے بکھیر کر اس کے لئے دیانتدار معزز اور نیک بخت بننا ناممکن کر دیتی ہے اِس لئے خیر الامور اوسطھا پر ہمیشہ عمل کرنا چاہیئے۔

کام اپنی نوعیت کے لحاظ سے اِتنا معزز اور سُود مند نہیں جتنا کہ وہ بلند عزائم، اِصلاحِ خیال، نشوونمائے اِدراک اور مناسب تفریحات زندگی کے لئے ہے یہ واقعہ ہے کہ دنیائے اَدب و سائینس کے بعض بہترین کام ایسے آدمیوں کے ہاتھوں سرانجام پائے جو اپنے کاروباری مشاغل میں مصروف تھے، اِنتہائی مجبوریوں میں کام کی زیادتی زندگی کی لطافتوں کو فنا کر دیتی ہے۔

لارڈ بیکن نے کہا ہے کہ "دانا کو کسی نہ کسی تمنا میں بے قرار رہنا چاہیئے"۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ سب سے زیادہ باعمل اور مصروف آدمی جو ہوا ہے۔ یا ہو سکتا ہے اُس کے پاس بہت سا وقت تفریح کے لئے ہوتا ہے، درآں حالیکہ وہ کاروباری مدوجزر اور اِنقلاب کے دَور میں ہوتا ہے۔ سوائے اُس شخص کے

جو کاہل اور ناقابل ہو یا نا اہلیت اور غلط خواہشات کی بنا پر ان کاموں کو ہاتھ میں لے جو دوسرے لوگ اس کی نسبت بہتر طریقہ پر انجام دے سکتے ہوں یہاں بہت بڑا اختلافی نکتہ قابل توجہ ہے وہ یہ کہ ہمیں بہ یک وقت صرف ایک ہی کام بہ حسن وخوبی انجام دینا چاہیئے اور بقایا سے عدم توجہی اختیار کرتے ہوئے انحراف کرنا چاہیئے' یہ آسائش حاصل کرنے اور زندگی کی بہار و برکت کو محفوظ کرنے کا صحیح ترین طریقہ ہے' اس سے فرصتی لمحات کا لطف حاصل ہوتا اور طبیعت کے پوشیدہ جوہر کھلیں گے' جس سے مسرتوں کے چشمے جاری ہو کر گوناگوں تفریح بخشیں گے تا آنکہ زندگی ایک دائمی آسائش بن جائیگی دُنیا میں تفریح حاصل کرنے کے بہت سے نیک اور منفعت بخش طریقے ہیں قدرت اپنی دائمی خوبصورتی کو بے نقاب کئے ہوئے ہے ہم اس کے گوناگوں نظاروں کو دیکھ سکتے ہیں اور اس کی وسعت لامحدود کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے رازوں کا جگر چاک کر سکتے ہیں' نباتات' جمادات' حیوانات' اور علمی دنیا کی بے انتہا تحقیقات انسان کے لئے ایک وسیع میدان پیش کرتی ہے' جس سے انسانیت کی قدیم و موجودہ تاریخ' تعلیم' حکومت اور دنیاوی تہذیب و ترقی کے بہترین ذرایع پر روشنی پڑتی ہے نہ صرف یہ بلکہ اُن میں اَدب' سوانحعمری' شعر و شاعری اور افسانہ نگاری کا بے انتہا ذخیرہ تکمیل ذوق کے لئے موجود ہے۔

اٹلی کے سب سے بڑے مصور اور اس ملک کے سب سے بڑے شاعر نے آپس میں اپنے پیشوں کا تبادلہ کر لیا تھا' مچل رینگلو نے مصوری چھوڑ کر شاعری شروع کر دی اور ڈانٹے نے شاعری ترک کر کے مصوری اختیار کر لی' یہ اُن کی دماغی عیاشی کا دور تھا. لینارڈو اور مچل رینگلو عالمگیر شہرت کے مصور تھے جن کو مصوری کے علاوہ سنگتراشی معماری اور فن انجنیئری میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔

روزیٹی بھی مصوری میں اتنا ہی باکمال تھا جیسا کہ شاعری میں۔

بعض دماغی کام کرنیوالے جسمانی ورزش کے شوقین بھی ہوتے ہیں وہ ہرن کا شکار گوشت و پوست کے لئے نہیں بلکہ اس دوڑ دھوپ سے ورزشی مفاد حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں۔

مسٹر ایشورتھ تشنج کے مریض تھے اگرچہ شکار کے شیدائی نہ تھے مگر پھر بھی کہا کرتے تھے کہ جنگلوں میں شکار کھیلتے رہنے سے اُن کی زندگی بچ گئی۔

خان اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

ہمارا وطن

ستاروں سے اونچا ہمارا وطن ہے بہاروں کا ماوی ہمارا وطن ہے
بہشتِ تمناء ہمارا وطن ہے جہاں سے نرالا ہمارا وطن ہے
محبت کی دنیا ہمارا وطن ہے محبت سراپا ہمارا وطن ہے
جہاں بھر کا داتا ہمارا وطن ہے
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

وہ سب سے انوکھا وہ سب سے نرالا وہ آغوش میں جس نے شاہوں کو پالا
وہ ظلمت سے جس نے بشر کو نکالا وہ جس سے ہے سارے جہاں میں اُجالا
وہ آفاق میں جس کا ہے بول بالا وہ پربت کا پیارا وہ جانِ ہمالہ!!
وہ گنگا سے محبوب دریاؤں والا
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

تجلّی سے ہر دشت مانندِ ایمن پہاڑوں کے اشجار پھولوں سے روشن
بہاروں کا گھر بلبلوں کا نشیمن محبت کا مامن مسرت کا گلشن
الم سوز ساون طرب خیز پھاگن ہمالہ کی وادی ہے گنگا کا دامن
ہے گوداوری کا کرشنا کا مسکن
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

گلستانِ آفاق بے رنگ و بو تھا فلاطوں کا حکمت کدہ بے نمو تھا
جہالت کا بت مصر کے روبرو تھا نہ آسماں روم بے آبرو تھا
جب انساں ناواقفِ گفتگو تھا بہت تنگ جب دامنِ آرزو تھا
یہاں علم اُس وقت بھی چار سُو تھا
جہاں بھر سے اچھا ہمارا وطن ہے

ابو نذیر رحمانی

ایک خط

اِک آرزوئے محبت کا خواب دیکھا تھا
اَب اُس کی یاد بھی دِل سے بھلا رہا ہوں میں

نجمہ عزیزہ ——— خوش رہو!
اور کہو کیا حال ہے، تم نے تو اَب خط لکھنے سے تو بہ ہی کرلی اچھا کیا، لیکن یہ ایک ذریعہ تھا تمہاری خیر و عافیت معلوم ہونے کا، سو جاتا رہا۔

ہاں خیریت اور صرف خیریت! اور میں اس سے زیادہ چاہتا ہی کیا تھا اور اگر چاہتا بھی تو ہوتا کیا؟ اِنسان تو بہت کچھ چاہتا ہے لیکن حاصل ہو جب نا! اور ہونا بھی یہی چاہیئے، ورنہ دنیا والوں کی اگر ہر تمنا، پوری ہونے لگے تو بس پھر چل چکی یہ دنیا کی گاڑی! تم ہی سوچو! تم نے شہاب کو کس بری طرح چاہا، پھر ہوا کچھ حاصل؟ یورپ جاکر ڈاکٹری پڑھنا چاہی، پھر جا سکیں؟ سچ بتانا! مجھے خط لکھنے کا کئی بار اِرادہ کیا، پھر ہوا پورا؟ بھلا غور کرو، جب اِنسان کی بے بسی و مجبوری کا یہ عالم ہو تو پھر تم ہی بتاؤ کہ دنیائے خیالی کی تعمیر سے حاصل ———؟ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ کہہ یہ رہا تھا کہ تم نے خط لکھنا چھوڑ دیا۔ اور غالباً اِس لئے کہ میں نے تمہیں انگاروں سے کھیلنے کو منع کیا تھا تم نے شاید برا مانا اور اس درجہ اَثر لیا کہ اپنی خیریت سے بھی محروم کر دیا، جو میرا سرمایۂ حیات ہے اور اسے تم صرف اِس لئے چھیننا چاہتی ہو کہ میں نے تم کو تمہاری ایک غلطی پر ٹوکا ایک ایسے جال سے نکالنے کی کوشش کی جس میں پھنسکر تم زندگی بھر پھڑ پھڑاتیں۔ خیر۔ تم نے جو فیصلہ کیا خوب کیا۔ کاش میں جانتا ہوتا کہ میری ہلکی سی نکتہ چینی بھی تمہاری طبع نازک پر گراں گزر سکتی ہے ———!

دیکھو! ایک معصوم بچہ رنگین تتلی کو دیکھکر خوش ہوتا ہے اُسے پکڑنے کے لئے مچلتا ہے اور جب اس کے پیچھے دوڑتا ہے تو وہ اپنی طاقتِ پرواز کو ہوا دیتی ہے تیز اڑتی ہے اور بہت تیز۔ نادان بچہ آنکھیں اُوپر اُٹھائے بے تحاشہ، اندھا دھند دوڑتا ہے، اور جب ٹھوکر لگتی ہے تو گرتا ہے، تتلی ہاتھ نہیں آتی تو روتا ہے؛ چیختا ہے، چلاتا ہے، مگر کب؟ اس وقت جب کمان سے تیر نکل چکا ہوتا ہے۔ یہی اور بالکل یہی صورت تمہاری تھی، تم نے سمندر کی صاف و شفاف سطح کو دیکھا، خوب اچھی طرح دیکھا، پھر اُس کے کنارے کنارے، اتھلے اتھلے، ٹھنڈے ٹھنڈے، چاندی سے پانی میں چاندی سے پاؤں اُتار دیئے اور جب آگے جانے کا قصد کیا تو رشتۂ روحی نے مجھے چونکایا اور میں نے تم کو سوچے سمجھے بغیر وہ سب کچھ لکھدیا جس کی تاب تم نہیں لاسکیں خفا ہوگئیں۔ جو تمہاری بلند نظری اور فراخ حوصلگی کا عکس ہے اور بس ———! سچ بتانا، پیشانی پر کتنے بل آئے؟ ———؟ خفگی اور تلخی کے اتنے شدید

جذبات بیسکر بھی کوئی زندگی شروع کرتا ہے!

معاف کرنا۔ میری سطور واعظانہ حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہیں اور تم کہہ رہی ہوگی "یہ کہاں کی ہے دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح" "مگر میں کروں بھی کیا" "چارہ سازی" اور "غمگساری" کے قابل تو یہ دل رہا بھی نہیں۔ تم پوچھوگی کیوں؟ میں کہونگا "رہنے بھی دو اسے" یہ تمہارے بس کا روگ نہیں۔ بڑی المناک اور دکھ بھری کہانی ہے اور وہ بھی پھر میری اپنی زبانی ——— اول ہول، ——— سن نہ سکوگی، صبر کرو صبر۔ ابھی میرا ساز محبت، مضبوط اور بہت مضبوط ہے۔ جب یہ شکستہ ہو جائے تب سننا ہر تار نغمۂ غم سنائیگا، سن لینا۔ اچھا سنو!

ثریا اگر اس سال ادیب فاضل میں شریک ہو رہی ہے تو تم ضرور اس کا ہاتھ بٹاؤ اور اپنی تمام تفریحات رنگین سے دستکش ہو کر ادب کی لاج رکھ لو تمہارا احسان ہوگا۔ یاد رکھو! ہر قوم کی ترقی کا انحصار اس کے ادب پر ہوتا ہے! معلوم ہے؟ آج جبکہ ساری دنیا، آگ و خون کی بھٹی بنی ہوئی ہے۔ امریکہ نے کیا کیا، جان و مال کی حفاظت سے پہلے جس کی حفاظت کی ہے، وہ ہے اُن کا ادب! جانتی ہو کس طرح؟ تمام کتابوں کے فلم تیار کرا لیئے۔ پھر کیا تم اس سلسلہ میں کچھ ایثار و قربانی نہیں کر سکتیں؟ خیر تم جانو! بہر حال جس طرح بھی ممکن ہو ثریا کو امتحان میں پاس کرا دو۔ اس طرح اردو ادب خطرہ کی زد سے بچ جائے گا اور ادب بھی وہ جس کو ہمارے آبا و اجداد نے ——— میں پھر بہکا۔

اچھا سنو! تم نے فلم نجمہ بھی دیکھا؟ ہاں! ہاں! وہی جس نے راس کماری سے ہمالیہ کی چوٹی تک دھوم مچا رکھی ہے، فلم برا نہیں تاہم خوب ہے مجھے جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کی زبان ہے، مکالمہ بھی تگڑا ہے، نجمہ کے یہ الفاظ بھلائے نہیں بھولتے "طلعت! ہندوستان کی شریف گھرانے کی عورت، اپنا رنج و غم، اپنا عیش و عشرت اور اپنا سب کچھ میکے میں دفن کر آتی ہے اور مر کر شوہر کے گھر سے نکلتی ہے۔ طلعت! میں سب سمجھتی ہوں مگر اپنے فرض سے مجبور ہوں" ——— ! اسی طرح حضرت بیدل ارے بھولا، حضرت نہیں، مسٹر بیدل کے یہ الفاظ کیا یاد رکھنے کے قابل نہیں "یوسف! تم میرے سچے، مخلص، ایک اور صرف ایک دوست ہو اس لئے میں تم کو ہوش میں لاکر رہونگا اور ایک نہ حاصل ہونیوالی چیز کے لئے تباہ و برباد نہیں ہونے دونگا" ——— ! کیوں؟ ہے نا پتہ کی بات! ممکن ہے کہ الفاظ صحیح نہوں اس لئے کہ عرصہ اور بہت عرصہ ہوا جب زیارت کی تھی۔ وہ بھی کس طرح؟ آنکھوں میں نیند تھی کہ سمٹی آ رہی تھی، پچھلے واقعات تھے کہ پردۂ سیمین پر رقص کر رہے تھے، بھولی بسری یادیں تازہ ہو گئی تھیں۔ ارے توبہ! میں پھر اڑا۔ ہاں تو جب نجمہ، ایسے سرمست و لا ابالی شہزادے کو جس کے لئے "تان ربا" "بانگ سحر" ہو، راہ راست پر لا سکتی ہے تو کیا تم سے یہ ممکن نہیں ——— ؟ آؤ! ملاؤ ہاتھ۔

اٹھو اور اٹھ کے نظام جہاں بدل ڈالیں

تم سوچتی ہوگی کہ یہ آج مجھے آخر ہو کیا گیا ہے، سر سے پیر تک بدلا ہوا نظر آ رہا ہوں، اور یہ ہے بھی واقعہ! محبت نفرت میں تبدیل ہو چکی ہے ریشم نے کھدر کی جگہ لے لی ہے اور ہاں میرے پاس جو دیوان دیکھے تھے نا تم نے! جانتی ہو اُن کا کیا حشر ہوا؟ سنو! جگر کے "شعلۂ طور" کو تو احسان دانش کے "آتش خاموش" نے خاکستر کر دیا اور بہزاد کے "نغمۂ نور" کو اقبال کے "ضرب کلیم" نے دے مارا ——— ارے! تمہیں تعجب کیوں ہے؟ ہاں ہاں! میں اب لب خشک اور آہ سرد کی منزلوں سے دور بہت دور جا چکا ہوں۔ وہاں جہاں پہنچکر کوئی کہتا ہے:

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

سنو! اِندنوں میرا مقصدِ حیات سماج کی اصلاح

اور اردو کی خدمت کرنا ہے۔ بولو! دو گی ساتھ ——— ؟ مگر خوب سوچ لو، تختۂ گل کو چھوڑ کر وادیِ پُرخار میں قدم رکھنا پڑے گا جس کی مجھے تم سے امید ہے۔ اداے فرض اور احساس ذمہ داری کے لئے تیار ہو جاؤ! اور جو کچھ ہوا اُسے بھول جاؤ میں نے تم کو جو پہلا خط لکھا تھا وہ میرے بجھے ہوئے دل کا آخری دھواں ہے جسے تم نہیں سمجھ سکتیں اور خدا کرے کہ نہ سمجھو!

عشق کی ایک ایک ادا پر جان و دل، صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

میری اچھی نجمہ! میں نے تمہارا خاصہ وقت ضائع کیا اور بہت سی باتیں کر ڈالیں۔ اس لئے اب رخصت، ہاں ایک بات اور سنو، مگر دیکھو! کسی سے نہ کہنا۔ ذرا سر قریب لاؤ تو کان میں چپکے سے کہدوں ——— ! اچھا! خدا حافظ۔ فقط

تمہارا

نجمی

محمد اقبال سلیم
(گاہندری)

تنقید و تبصرہ

اُصول افسانہ نگاری

از اویس احمد ادیب، حجم ۱۷۶ صفحہ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$
قیمت:۔ عہ ۸ ر ناشر۔ اُردو پبلشنگ ہاؤس الہ آباد۔

مختصر افسانوں کا رواج اردو زبان میں روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن مقبولیت کے ساتھ گھٹیا درجہ کے افسانوں کی بھرمار بھی ہو رہی ہے، ہر وہ شخص جو چار سطریں لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے افسانہ نگار بن بیٹھا ہے، اور نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ درجہ کے افسانوں نے مذاق سلیم کا خون کر ڈالا ہے۔ جناب ادیب کا یہ قول بالکل صحیح ہے کہ اُردو دان طبقہ کا ہر تیسرا فرد افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے"۔

افسانہ نگاری ایک فن ہے اور خاصا نازک فن، اس کو اور فنون کی طرح دقت نظر اور محنت ہی کے بعد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جو شخص اپنے اندر افسانہ نگار ہونے کی صلاحیت محسوس کرے اُس کا فرض ہے کہ باقاعدہ مطالعہ اور مشق کے ذریعہ اِس فن کو حاصل کرے یہ بڑا ظلم ہے کہ فوراً غلط صحیح، ایک مہمل، بے مقصد اور بے ربط افسانہ لکھکر چھپوانے کی سعی کی جائے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے افسانہ نگاری کے اصول اور لوازم پر بحث کی ہے، انگریزی زبان کے مختلف باکمال ناقدین اور افسانہ نگاروں کے خیالات درج کئے ہیں اور دلپذیر ترتیب کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ایک افسانہ نگار کو افسانہ لکھتے ہوئے کن اُمور کی تکمیل کا خاص خیال رکھنا چاہیئے ——— کتاب اپنے موضوع پر نادر اور اچھی کتاب ہے اور ہم جدید افسانہ نگاروں سے اس کے مطالعہ اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

دورِ جدید کے چند منتخب شعراء

از عبد الشکور ایم۔ اے۔ حجم ۱۸۴ صفحہ تقطیع $\frac{22 \times 35}{16}$ قیمت:۔ سے ۲ ناشر۔ دانش محل لکھنو۔

جناب عبد الشکور صاحب نے اس کتاب میں پنڈت رتن ناتھ سرشار سے رواں تک، اور جناب ساحر دہلوی سے سکھدیو پرشاد بسمل الہ آبادی تک جدید اردو زبان کے اکتیس ہندو شعراء کا تذکرہ، اُن کے کلام پر تبصرہ اور کلام کے نمونے درج کئے ہیں۔ ابتداء میں ایک بسیط مقدمہ اُردو شاعری میں ہندوؤں کا حصہ سے متعلق ہے، اور مفید مضامین پر مشتمل ہے۔

عبد الشکور صاحب نے کتاب نہایت محنت کے ساتھ مرتب فرمائی ہے اور تبصرہ کرنے میں اصابت نظر سے کام لیا ہے۔ نمونہ کلام کو دیکھکر شاعری کی داد کے علاوہ عبد الشکور صاحب کے ذوق سلیم کی داد دینے کو دل چاہتا ہے، کتاب شروع سے آخر تک نہایت پر لطف اور بہت ہی مفید معلومات سے پُر ہے، ہم عبد الشکور صاحب کو اس کتاب کی تالیف پر مبارکباد دیتے ہیں۔ اور ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں کتاب معلومات آفریں ہے۔ اور حوالہ کی ایک اچھی کتاب کا کام دے سکتی ہے۔

اُردو تنقید پر ایک نظر

از کلیم الدین احمد ۔ حجم ۲۳۲، ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت :- عه/ ۔ مرکز ادب، ہندر دہلی

اُردو میں تنقید نگاری کی عمر ابھی بہت ہی کم ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں کہ ہمارے ہاں تنقید اُدب کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اور جیسے ہر چیز کی ابتدا تکمیل طلب صورت حال سے ہوتی ہے؛ "تنقید اُدب" بھی تکمیل طلب ہے، زیر نظر کتاب تنقید کی تنقید ہے اور تبصرہ پر تبصرہ، اپنے موضوع پر یہ نادر کتاب ہے مصنف نے اُردو ادب کی تاریخوں اور تذکروں پر تنقید کی ہے۔ اُردو میں فن تنقید کی تاریخ پر بحث کی ہے۔ ہمارے اُصول تنقید پر کیا کیا اثرات پڑے ہیں؛ اس کا ذکر کیا ہے۔ ہم مصنف کی اس رائے سے بالکل متفق ہیں کہ آج کل جانبداری کے ساتھ جو تنقید کی جاتی ہے وہ "تنقید" نہیں بلکہ قصیدہ خوانی ہے۔ اور اسی طرح مخالفت کی وجہ سے جو تنقیص لکھی جاتی ہے وہ محض ہجو ہے۔ اس سے اُدب کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچتا ہے۔

کتاب دلچسپ بھی ہے اور معلومات آفریں بھی۔ لیکن مصنف کا قلم تذکروں پر تنقید کرتے ہوئے تنقیص پر آ گیا ہے۔ جو کسی سنجیدہ نگار کے لئے مناسب نہیں۔ کتاب اچھی ہوتی اگر مصنف ذرا وسعتِ نظر سے کام لیتے۔

شمیم کے سو شعر

قیمت :- ۴ر عثمانیہ بکڈپو ۔ محمد علی بلڈنگ بمبئی ۳

سید مظفر حسین صاحب شمیم کی غزلوں میں سو شعر منتخب کر کے سید جمیل الدین صاحب نے یہ کتابچہ شایع کیا ہے اشعار میں کوئی ندرت تو نہیں البتہ زبان و بیان صاف ہیں۔ انداز کسی قدر واقعاتی و وارداتی ہے اس لئے اشعار میں ایک قسم کا لطف پیدا ہو گیا ہے۔

کنول

حکیم میر کاظم علی برق موسوی ۲۰×۳۰/۱۶ ۸۰ صفحات مجلد خوشنما۔ قیمت :- ۱ر ۔ مرکز ادب قطبی گوڑہ حیدر آباد دکن۔

نوجوان شاعر برق موسوی کی ۴۳ مختصر بہاریہ نظموں کا مجموعہ، جناب برق کے کلام کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اگر زمانہ سازگار رہا اور مشق سخن جاری رہی تو ایک دن یہ اچھے شاعروں میں ہوں گے۔ ان کے کلام میں شاعرانہ عناصر کی کمی نہیں البتہ ابھی پختگی نہیں ہے، مشق اور محنت کی ضرورت ہے، جذبات شاعرانہ ہیں، انداز شاعرانہ ہے بیان شاعرانہ ہے، مگر بیان پر قدرت مشق و محنت چاہتی ہے، ہمارا مشورہ ہے کہ برق صاحب مشق جاری رکھیں، اور بیان میں زور پیدا کرنے کی سعی کریں۔

اَدب اور زندگی

مجنوں گورکھپوری، ۱۶۸ صفحہ ۲۰×۳۰/۱۶ مجلد۔ قیمت عہ/ دانش محل لکھنو۔

حضرت مجنوں گورکھپوری، اُردو زبان کے پختہ مشق اَدیبوں میں سے ہیں۔ ان کے قلم سے اَب تک متعدد نفیس اور اعلیٰ درجہ کی کتابیں نکل چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو ترمیم و اضافہ کے بعد دوسری مرتبہ شایع ہوا ہے۔ یہ مضامین حسب ذیل عنوانات پر ہیں:-

ادب اور زندگی، مبادیات تنقید، زندگی اور اَدب کا بحرانی دور، ادب اور ترقی۔ ہندوستانی ناٹک۔ نظیر اکبر آبادی ضمیمہ۔ حالی کا مرتبہ اُردو ادب میں، نیا ادب کیا ہے۔ اُردو مختصر افسانے میں جدید رجحانات۔

حضرت مجنوں کی نظر بہت سے فرزانوں سے زیادہ باریک ہے، وہ تنقید کرتے ہوئے جس قدر سُلجھے انداز میں اُصولی بحث کرتے ہیں وہ بہت سے ناقدین کے لئے قابل تقلید ہے۔

اَجرتی محنت اور سرمایہ

کارل مارکس، مرتبہ عابد علیخاں بی۔ اے

۲۰×۳۰ ۱۶ ۴۰ صفحات قیمت:- ۱۲ر اشاعت گھر حیدر آباد دکن۔

یہ کتاب کارل مارکس کے ایک مشہور مضمون کا ترجمہ ہے اور اشتراکی پروپگنڈا کے سلسلہ میں اشاعت گھر نے شائع کیا ہے۔ کارل مارکس کی تحریروں کا ترجمہ بڑا مشکل کام ہے، اول تو یہ ترجمہ در ترجمہ کا کام ہوتا ہے دوسرے یہ کہ خود کارل مارکس اپنی بے مغزی کو تحریر کی الجھاوٹ میں چھپانے کا عادی تھا۔ اس لئے یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، لیکن جناب عابد علی خاں صاحب نے بڑی کامیابی کے ساتھ مفہوم کو اردو میں ادا کیا ہے جس کے لئے وہ صحیح معنی میں داد کے مستحق ہیں۔

رسالہ منزل یہ رسالہ چھوٹی تقطیع پر ماہانہ فرنگی محل لکھنؤ سے شایع ہوتا ہے۔ سالانہ قیمت (للعہ) ہے۔

فروری و مارچ ۱۹۴۳ء کا مشترک شمارہ اس وقت ہمارے سامنے ہے جو مع اشتہارات کے چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ رسالہ اردو کے جدید مارکس زدہ ادب سے متاثر اور اسی کا منادی معلوم ہوتا ہے۔ اس نمبر میں ابتدائی مضمون عبد العلیم صاحب کا ہے جو نئے ادب کی حمایت میں ہے۔ بعض مشہور شعرا مثلاً حسرت موہانی وغیرہ کے اشعار بھی اس میں شامل ہیں۔ رسالہ اچھا ہے، ضرورت ہے کہ اس کی ظاہری صورت کو بھی حسین بنایا جائے۔

گلدستۂ معرفت اولیا مجموعہ کلام حضرت سید شاہ احمد حسن صاحب جعفری، تقطیع ۲۰×۲۶ ۱۶ ، حجم ۵۰ صفحات کاغذ و طباعت نہایت نفیس قیمت:- عالہ۔ کسیری اینڈ کمپنی جانسٹن گنج، الہ آباد۔



پولٹیکل ڈکشنری

مرتبہ

جناب سید عبد القدوس ہاشمی

عظیم الشان سیاسی لغت جدید ترین معلومات کا خزانہ

جس میں

سیاسی اصطلاحات، سیاسی معاہدات، سیاسی اشخاص، سیاسی مقامات بین الاقوامی معاملات، اور چھوٹی بڑی تمام حکومتوں کے حالات، انکی تاریخ اور اُن کے سیاسی موقف کو عام فہم اور دلکش انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

تمام کتاب حروف تہجی پر مرتب ہے اور مشہور سیاسی عالم مولٰنا

عبد القدوس ہاشمی

کی دو سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے

مجلد قیمت (عے)

سید عبد الرزاق مہتمم و پرنٹر اعظم اسٹیم پریس
اعظم بلڈنگ حیدرآباد دکن

ماہنامہ پیام ادب

ادارۂ تحریر

سید عبدالوہاب

(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری

ادارۂ اشاعت اردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

اپریل ۱۹۴۴ء — رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸ — جلد (۲)

نمبر (۲)

مندرجات

چندہ سالانہ — چھ روپیہ کلدار — فی پرچہ آٹھ آنے کلدار

محمد اقبال سلیم گاہندری

نَظرات

آسمان و زمین کا چکر پوری تیزی کے ساتھ جاری ہے، ہر روز آفتاب مشرق سے طلوع ہوتا ہے، دنیا کے سامنے نئے نئے مسائل اور نئی نئی باتیں پیدا کرتا ہوا۔ افراد، اقوام اور پورے دنیائے اِنسانیت کو نئی نئی ضرورتوں کا احساس دِلاتا ہوا، آج کی دنیا کل سے مختلف ہے، اور آئندہ کل کی دنیا یقینی طور پر آج سے مختلف ہوگی۔ بدلتے ہوئے عالم کے تقاضوں سے چشم پوشی نادانی اور بدترین نادانی ہے۔ لیکن ہر پرانی چیز کو صرف اس لئے کہ وہ پرانی ہیں خارج از بحث قرار دینا اِس سے بھی بڑی حماقت ہوگی بہت سی پرانی چیزیں ایسی ہیں جن سے وابستگی حیات ہے، اور بہت سی نئی باتیں ایسی ہیں جنھیں اِختیار کرنا زندگی، نہ اُس سے صرف نظر مناسب ہے۔ اَب سوال یہ رَہ جاتا ہے کہ قدیم سے وابستگی کس حد تک قایم رہے اور جدید کو کس حد تک قبول کیا جائے۔

اس کا جواب بہت زیادہ آسان نہیں تو کچھ بہت زیادہ مشکل بھی نہیں، دماغوں میں ہیجان ہے، سیدھی طرح سوچئے کون، ورنہ یہ کیا بڑی بات ہے، دنیا کو دیکھئے، نظامِ کائنات پر غور فرمائیے۔ کلیات و اصول میں کہیں تبدل و تغیر نہ ملے گا: خلقتِ اِنسانی میں صدیوں سے کیا تغیر ہوا، افکار بدلے ہیں لیکن افکار کا طریقہ اور سوچ بچار کا ہیج کہاں بدلا ہے۔ اعمال میں تنوع اور تجدد ہزاروں طرح کے ہوئے، ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ لیکن نتائجِ عمل اور اصولِ عمل میں اِختلاف و تجدد کس نے دیکھا، چھری کا کام کاٹنا ہے طرح طرح کی چھریاں بنائیے تیز سے تیز دھار پیدا کیجئے، لیکن چھری بہرحال وہی کام کرے گی جو کرتی تھی۔ اسی طرح ماں کی محبت، بہن کی الفت، بچوں کا بھولا پن، حسن کا ناز، عشق کا نیاز، کہاں بدلا ہے، دنیا بدل رہی ہے، کون کہتا ہے کہ نہیں بدلتی، آفتاب کی روشنی اور شب کی سیاہی سے اِنکار کی جرات کون کرسکتا ہے، لیکن اُصول و کلیات نہیں بدلتے اور کبھی نہیں بدلیں گے۔

پیامِ اَدب کے پچھلے نمبروں میں کچھ مضامین ایسے نِکلے جس سے ہمارے بعض معاصرین کو غلط فہمی ہوگئی، اُنھیں یقین رکھنا چاہیئے کہ "پیامِ ادب" ترقی و تجدد کے میدان میں اُن سے دو قدم آگے ہی رہے گا؛ ہاں! آنکھوں کی خیرگی اور بدحواسی کے ساتھ نہیں، اِحساسِ کمتری، اور خود دشمنی کے جذبات لے کر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی "پیامِ اَدب" ہر حماقت کا ساتھ دے، اور سب کی ہاں میں ہاں ملائے، اس کی اُمید نہ رکھئے۔

مُسلم ایجوکیشنل کانفرنس

علی گڑھ کی تعلیمی تحریک نے ہمیں جو کچھ دیا ہے اس میں سے تین زندہ جاوید اِدارے پوری طرح کارگزار ہیں: مدرستہ العلوم جواب ماشاءاللہ مسلم یونیورسٹی ہے، انجمن ترقی اُردو جسے کبھی علامہ شبلی نعمانی کی معتمدی کا فخر حاصل تھا،

اور اب مولوی عبدالحق صاحب کی، اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جسے نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی کی معتمدی کا امتیاز حاصل ہے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلمانانِ ہند کا غالباً سب سے قدیم ادارہ ہے۔ اب تک اُس نے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کام کیا ہے اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ امسال اس کا سالانہ اجلاس ۱۴ اپریل سے بمقام جبلپور منعقد ہو رہا ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ وقت کی شدید ضروریات یقیناً ارکان کے سامنے ہونگی۔ اور نئے عزم و ارادہ سے کام شروع ہوگا۔

دُنیا بدل رہی ہے، ضرورت ہے کہ ہم بھی اپنی تعلیم کو اپنی بیش بہا روایات کے ساتھ ساتھ عصری ضروریات کے سانچے میں ڈھال لیں اور کوئی ایسی راہ نکالیں کہ ہمارے نونہال بدلتی ہوئی دنیا میں روایاتِ ایمانی کے حامل اور ضروریاتِ تمدن کے مطابق ثابت ہوں۔

ہماری موجودہ تعلیم چونکہ دوسروں کے ہاتھوں شروع ہوئی اور بقول میکالے صرف کلرک پیدا کرنے کے لئے جاری کی گئی ہے اس لئے اس نے ہمیں اتنا نقصان پہنچایا جس کا اندازہ بھی آسان نہیں۔ ہمیں خود نگر کی بجائے بازی گر، نقال اور خود فروش بنا کر رکھ دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم میں انگریزی زبان کے جاننے والے پیدا ہو گئے لیکن ان میں بہت ہی کم ہیں جن کی حیثیت "در پس آئینہ طوطی صفت" سے زیادہ ہو، ہمیں تجارتی ضرورت کے لئے اور صرف اس ضرورت کے لئے کہ "شعار اغیار" سے مرعوب ہو کر ان کی مصنوعات کے خریدار بن سکیں، ہم کو "از خود گریزاں" اور "شیدائے غیر" بنا دیا گیا۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے لیکن حقیقت ہے جس سے انکار کی مجال نہیں کہ آج ہم دوسروں کی آنکھ سے دیکھتے اور دوسروں کے کان سے سنتے ہیں۔

۱۸۳۵ء میں جب ہماری موجودہ تعلیم کا ڈھانچہ بنایا جا رہا تھا تو "دانشمند فرنگ" نے ان مصالح کو سامنے رکھ کر انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں ان دانشمندوں کو ناکامی ہوئی

دوسری طرف ہماری تعلیم کا وہ پرانا، فرسودہ مکتبی نظام ہے جس میں مقصود کی بجائے ذرائع کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے جس میں زبان کی بجائے قواعد پر کئی کئی سال صرف ہو جاتے ہیں جس میں پانچ سو برس پہلے کی دنیا سے ہمیں کسی قدر روشناس تو کرا دیا جاتا ہے مگر آج کی دنیا سے ہمیں عمداً بے خبر رکھا جاتا ہے۔

اس میں طریقۂ تعلیم اور نصاب کی اصلاح ہو جائے تو مکتبی نظام ہندوستان جیسے ملک کے لئے موجودہ مدارس سے صدگونہ زیادہ مفید ہے، اور ہزار گونہ زیادہ عملی اور زیادہ کارآمد۔ لیکن موجودہ صورت میں بغیر اصلاح و ترمیم تو اس سے بھی کسی خوشگوار نتیجہ کی اُمید نہیں کی جا سکتی، بلکہ ناخوشگوار نتائج کا تجربہ ہے

مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا مسئلہ اب کسی طرح قابل بحث نہیں رہا، یہ ایک مسلّم حقیقت اور تجربہ و مشاہدہ نے اُسے ناقابلِ انکار حد تک ثابت کر دیا ہے کہ اُردو زبان میں ہندوستانی بچوں کی تعلیم ہر دوسری زبان سے بہتر اور انگریزی سے بدرجہا بہتر ہوتی ہے۔ اس سے پڑھنے والوں پر کم بار پڑتا ہے، مضامین اچھی طرح سمجھ آتے ہیں۔ اور کتاب یا پروفیسر کے بتائے ہوئے مضامین طلبہ کے اپنے ہو جاتے ہیں۔

یہ سب کچھ سہی، لیکن فکر و عمل میں یہ طلبہ انگریزی زبان میں تعلیم پانے والے طلبہ سے کیا مختلف کیفیت رکھتے ہیں؟ دماغی کمزوری، فکر کی ناپختگی، احساس کمتری اور سب سے زیادہ نقالی و اغیار پسندی کا کوفسا مرض ہے جو اُردو میں تعلیم پانے والے طلبہ میں دوسروں سے کم درجہ پر پایا جاتا ہے؟

کسی قوم کی ترقی کے لئے ایسی تعلیم کسی زبان میں ہو، کس حد تک مفید ہو سکتی ہے۔ اس پر قوم کے دَرد مند ماہرین کو غور کرنا چاہیئے

اُردو امتحانات

حیدرآباد کے تعلیمی اِدارہ بیت العلوم نے اپنے یوم تاسیس کے موقع پر ایک بڑی معقول اور اہم تجویز منظور کی ہے۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ فارسی امتحانات کی طرح یہاں اُردو امتحانات کا بھی انتظام کیا جائے۔ اور اُنھیں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانوں کی طرح سرکاری طور پر مسلمہ قرار دیا جائے۔ تجویز میں اُس کے لئے جو وجہ بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ طلبہ اُردو کے امتحانوں میں شریک ہونے کے لئے پنجاب جاتے ہیں، اور گراں اخراجات کا بار اٹھاتے ہیں، اگر امتحان یہاں ہوں تو ان اخراجات سے گلو خلاصی ہو جائے۔

ہماری رائے میں یہ مطالبہ بروقت اور بہت ہی معقول مطالبہ ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ فارسی کے سرکاری امتحان ہوں اور اُردو کے نہ ہوں، فارسی میں اُردو سے زیادہ کیا دھرا ہے؟ اُردو زبان علمی حیثیت سے فارسی سے زیادہ سرمایہ رکھتی ہے، تصوف کی چند کتابوں اور شعراء کے دواوین کے علاوہ فارسی میں جو کتابیں ہیں وہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں —— اگر ان کے لئے فارسی کی تعلیم اور اُن کے امتحانات کا انتظام کیا جا سکتا ہے تو اُردو کے امتحانات کا نظم کرنا اس سے زیادہ ضروری ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ جو حکومت اُردو یونیورسٹی چلا رہی ہے وہ اُردو زباندانی کے امتحانات کا نظم کرنے سے دریغ نہ کرے گی۔

اعظم اسٹیم پریس

جنوبی ہند کے اس سب سے بڑے لیتھو پریس کا ذکر اس سے پہلے بھی "پیام اَدب" میں آ چکا ہے۔ رسالہ "پیام اَدب" اور اِدارہ کی تمام مطبوعات اِسی پریس میں چھپتی ہیں — اس پریس کو مرحوم سید عبدالقادر صاحب نے تقریباً ۳۵ سال پہلے بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر قائم کیا تھا۔ کچھ حسن نیت اور کچھ حسن انتظام نے مل کر اسے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کا موقع دیا۔ آج اس کا حسن انتظام اور ندرت کار مرحوم سید صاحب کے فرزند اکبر سید عبدالرزاق صاحب کی ماہرانہ نگرانی کے مرہون منت ہیں، سید عبدالرزاق صاحب خود فن طباعت کے اتنے بڑے ماہر ہیں کہ کسی کاریگر کے لئے اُن سے اچھا رہنا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اُن کی مہارت ہی ہے جس نے پریس کو جدید العصر مکمل پریس بنا دیا ہے۔

پولیٹکل ڈکشنری

سید عبدالقادر صاحب مرحوم نے تمدن عرب کا دوسرا ایڈیشن شایع کر کے اپنی ہمت وقت پسندی اور نفاست کا ثبوت دیا تھا۔ اور ایک ایسی کتاب ناظرین کو دی تھی کہ اگر سید صاحب مرحوم کی ہمت نہ ہوتی تو اس کے لئے پیرس سے اصل فرنچ ایڈیشن کے بلاک کون ناشر منگواتا اور اتنے کثیر اخراجات کون برداشت کرتا۔

سید عبدالرزاق صاحب نے بھی اب تک بہت سی نادر، بیش بہا تصانیف زرِ کثیر صرف کر کے شائع کی ہیں۔

آج کل سید صاحب مولانا عبدالقدوس صاحب ہاشمی کی کتاب پولٹیکل ڈکشنری شایع کرا رہے ہیں۔
یہ کتاب وسیع ترین سیاسی لغت ہے جسے علامہ موصوف نے دو سال کی شدید محنت کے بعد مرتب فرمایا ہے کتاب میں موجودہ سیاسی اصطلاحات، معاہدات، مقامات، اشخاص اور ممالک و ریاستہائے ہندوستان کے تفصیلی حالات، مختصر تاریخ اور اُن کے تفصیلی مطالعہ کے ہدایات درج ہیں۔ کتاب کی ترتیب "کتب لغت کی طرح ہے اور حوالہ کی مکمل اور آسان کتاب کا کام دے گی۔ اب تک نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی کوئی وسیع کتاب اِس موضوع پر موجود نہیں ہے۔

حضرات مصنفین سے بعض مصنفین ہمارے پاس اشاعت کے لئے کوئی مسودہ بھیجنا چاہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "فلاں ناشر ہمیں اتنی رقم بطور حق تصنیف دے رہا ہے لیکن ہم نے ادارہ اشاعت اردو کی شہرت اور اُس کے حسن معاملہ کی تعریف سنی ہے، اِس لئے آپ کو اس کا موقع دینا چاہتے ہیں" اُن کی عنایت اور حسن ظن کا شکریہ، لیکن ادارہ کسی دوسرے ناشر کے معاملہ میں خواہ مخواہ دخل اندازی کرنا نہیں چاہتا۔ براہ کرم یہ حضرات جب تک کسی دوسرے ناشر سے معاملہ ختم نہ ہو جائے، ہمیں مخاطب نہ فرمائیں۔ یہ طریقہ حسن معاملہ کے خلاف ہے کہ معاملہ کے دوران میں اُسی مسودہ کا دوسرے سے معاملہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

بعض حضرات سرپرستی فرما کر اپنا مسودہ ہمیں ارسال فرما دیتے ہیں۔ اُن سے عرض ہے کہ وہ فوراً اس کے جواب کی اُمید نہ فرمائیں۔ ہمارے کرم فرماؤں میں مسلّم ادباء .... ہیں جنھیں آپ کے مسودات ملاحظہ کے لئے دیئے جاتے ہیں، اور ان کی رائے کے بعد ہم آپ کو ادارہ کی طرف سے جواب دے سکتے ہیں، اِس لئے مسودہ کی وصولی کے بعد دو ہفتہ ہمیں وقت ملنا چاہیئے۔

بعض جدید مصنفین ہمیں اپنے مسودات بھیجتے ہوئے، ان مسودات پر نظر ثانی کے لئے خود ہی کسی شخص کا نام بھی تجویز کر دیتے ہیں۔ ہم اُن سے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جن ادباء کو ادارہ کی طرف سے اس کام کی زحمت دی جاتی ہے اُن پر نہ صرف ہمیں بلکہ تمام دیگر اہل علم کو بھی اعتماد ہے، اِس لئے اگر اُن کو دوسرے ہی حضرات کی نظر ثانی پر اصرار ہو تو براہ کرم بعد اصلاح و نظر ثانی مسودہ ارسال فرمائیں، اور یقین رکھیں کہ ہم اس کے بعد بھی اپنے مشیروں سے مشورہ کئے بغیر اُنھیں جواب نہ دے سکیں گے۔

اِدارۂ اِشاعت اُردو کی کتابوں کی قیمتیں سکۂ انگریزی ہیں

ہماری کتابیں براہِ راست ہم سے منگوائیے

اویس احمد ادیب

اُصولِ افسانہ نگاری

اُردو زبان و ادب میں آج کل افسانہ نگاروں[1] کی کمی نہیں اُردو دان طبقہ کا ہر تیسرا فرد افسانہ نگار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ حشرات الارض اپنے افسانوں کے مجموعے شایع کر کے شہرت عام اور بقائے دوام کے طالب ہوتے ہیں۔ ان کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ ان کے افسانے کس حد تک اُصول افسانہ نگاری کے تحت میں لکھے گئے ہیں۔ اور انھوں نے کس حد تک افسانہ کے عناصر اور منازل کو پیش نظر رکھا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ افسانہ نگار پر کوئی پابندی عاید نہیں کی جا سکتی اور نہ اُسے اپنے فرائض کی تکمیل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اُن کی ہمت افزائی کے لئے اکثر و بیشتر ایسے رسائل ملک کے طول و عرض میں سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن کو پست، پست تر اور پست ترین افسانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان رسائل کو بھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا کہ "افسانے" کس معیار کے ہوتے ہیں اور ان میں اِنسانی زندگی کا کون سا پہلو پیش کیا جاتا ہے "ادب لطیف" کے پردے میں وہ "ادب کثیف" کے انبار لگا رہے ہیں۔ اپنے نظریہ کے مطابق وہ اُردو زبان و ادب کے سرمایہ میں اضافہ کر رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے افسانے اردو زبان و ادب پر بدنما داغ ہیں جو کسی طرح دھوئے نہیں جا سکتے۔ رفتہ رفتہ ان اردو "افسانوں" کی وجہ سے "اُردو زبان و ادب" کی صورت مسخ ہو جائے گی۔ اور ہر فرد کی زبان پر یہی کلمات ہوں گے "اردو زبان و ادب مخرب اخلاق ہے۔ اس میں سوائے گل و بلبل[1] کے افسانوں کے اور کچھ نہیں"

اگر اس امر پر غور کیا جائے کہ "اردو" میں اس قدر افسانہ نگار کیوں پیدا ہو گئے تو اس کی صحیح وجہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔

ہر وہ شخص جو تھوڑی بہت اردو لکھ پڑھ سکتا ہے اہل قلم بننے کی کوشش کرتا ہے اردو کا یہ اضطرابی دور ان کی وجہ سے پستی کی طرف مائل ہوتا جا رہا ہے علم کی کمی، مگر صاحب قلم بننے کی خواہش اُنھیں اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ وہ کسی ناول، ڈراما یا افسانے کے پلاٹ میں ضمنی تبدیلیاں کر کے اُسے اپنا اور "طبعزاد" سوشل یا تاریخی شاہکار بنا کر پیش کریں۔ اگر اُنھیں اس قسم کی ادبی چوری کا موقع نہیں ملتا تو وہ اپنے محلہ یا شہر کے کسی واقعہ کو پیش کر کے خراج تحسین حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ایسے افسانہ نگار کبھی بلند نظریوں کے حامل نہیں ہو سکتے عوام ان افسانوں کو پڑھ کر خوش ہوتے ہیں ادنیٰ درجہ کے افسانے پڑھ کر ان کی ذہنیت بھی پست

[1] افسانہ نگار۔

[1] عشقیہ داستانیں

ہو جاتی ہے اور وہ اسی قسم کے افسانے پسند کرنے لگتے ہیں۔ موجودہ ذہنی پستی کے ذمہ دار کسی حد تک ادنیٰ درجہ کے افسانہ نگار ہیں۔

ملک اور قوم کی سیاسی اور سماجی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ بہت سے "اخبار نویس" افسانہ نگار بھی ہو جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ غلط فہمی اُردو دان طبقہ میں پھیلی ہوئی ہے ہر بلند پایہ "اخبار نویس" یا "ایڈیٹر" ایک بلند پایہ افسانہ نگار بھی ہو سکتا ہے۔ مگر جب اس خیال کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو اس کی حقیقت طشت از بام ہو جاتی ہے۔ اور ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ "ہر کامیاب اخبار نویس معیاری افسانہ نگار نہیں ہو سکتا۔ مگر جس اخبار نویس میں افسانہ نگاری کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ اس کا اخبار نویسی کا تجربہ اس کو ایک کامیاب اور بلند پایہ افسانہ نگار بننے میں بہت مدد دیتا ہے۔"

اس تمہید سے میرا یہ مقصد نہیں کہ میں کامیاب افسانہ نگاروں کو بددل کر دوں یا کامیاب افسانہ نویسوں کو اخبار نویس بنا دوں یا جن میں اُن کے جراثیم موجود ہوں اُن سے کہہ دوں کہ وہ اس سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔ جن میں افسانہ نگار بننے کی صلاحیت موجود ہو انھیں اصول افسانہ نگاری سے واقف ہو جانا بھی ضروری ہے۔

اکثر ایسے افسانہ نگار بھی دیکھنے میں آئے ہیں جن کو افسانے کے اجزا کا بھی علم نہیں ہوتا انھیں چاہیئے کہ وہ افسانہ نویسی سے قبل اس کے اصول اور اجزا سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کر لیں۔ اگر انھیں فطری طور سے افسانہ نگاری سے لگاؤ نہیں ہے تو افسانہ نگاری چھوڑ کر کسی اور صنف ادب کی طرف توجہ کریں۔ ایسے افسانہ نگار جو فطری رجحان نہ ہونے کے باوجود افسانہ نگار بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب افسانہ نگار نہیں ہوتے اکثر ایسے اصحاب بھی ہیں جن میں افسانہ نگاری کے جراثیم موجود ہوتے ہیں اور ذرا سی مشق بہم پہنچانے سے وہ خاصے افسانہ نگار بن سکتے ہیں۔ مگر وہ محنت سے گریز کرتے ہیں" انھیں "اکتساب" میں محنت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

جس طرح ایک کور مذاق انسان شاعر نہیں بن سکتا یا بدمذاق انسان موسیقی کا ماہر نہیں ہو سکتا، اسی طرح "اکتسابی جذبہ" ہر انسان کو افسانہ نگار نہیں بنا سکتا۔

افسانہ نگاری کی اس فطری خوبی کا اندازہ اس کے افسانوں کے اُصولی اور بلند پایہ ہونے سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس شخص میں افسانہ نگاری کا جوش اور جذبہ موجود ہو گا وہ ادنیٰ درجہ کے ہلکے پھلکے اور پامال قصے لکھنے سے گریز کر کے اُصول افسانہ نگاری سے آگاہ ہونے کی کوششیں کرے گا۔ اُس کے اجزائے ترکیبی کو پہلے سمجھے گا اور ایک خاص نصب العین کے ساتھ اپنا قلم اُٹھائے گا۔ اکثر افسانہ نگار ایسے ہوتے ہیں جس کو اُن کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی۔ اسی سلسلہ میں کچھ ایسے اصحاب کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا۔ جن میں افسانہ نگار بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے مگر وہ اس قدر کاہل اور کم ہمت ہیں کہ وہ افسانہ نگاری کو درد سری تصوّر کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے افسانے پڑھ کر لُطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی خداداد ذہانت اور قابلیت کو رفتہ رفتہ تباہ کر ڈالتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایسے افراد کو اگر مجبور کیا جاتا ہے تو وہ طوعاً وکرہاً افسانہ لکھ دیتے ہیں۔ مگر اس میں ان کا وہ پوشیدہ جوہر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے افراد جب افسانہ نگاری کی طرف توجہ کرتے ہیں تو وہ بہت جلد شہرت عام کے مالک بن جاتے ہیں۔ افسانہ نگاری ان کی روزی کا ذریعہ نہیں ہوتی وہ ہر سیکنڈ اور ہر منٹ میں افسانہ

تیار نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں ابتذال پیدا نہیں ہوتا۔ ان میں ندرت، عجوبہ پن اور جاذبیت ہوتی ہے۔

کامیاب افسانہ نگاروں کی شہرت ناکام افسانہ نگاروں کو ان کا دشمن بنا دیتی ہے۔ وہ اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کو ذلیل کریں اور نیچا دکھائیں مگر حاسدین کا حسد انھیں خود قعر ذلت میں ڈبو دیتا ہے اور ایک دن وہ آتا ہے کہ حاسد فنا ہو جاتا ہے۔ اور افسانہ نگار عروس شہرت سے ہمکنار نظر آتا ہے مگر یہ "ہمکناری" صرف اسی وقت حاصل ہوتی ہے۔ جبکہ افسانہ نگار ملک کی سیاسی، سماجی، قومی اور ملی تحریک کا بغور مطالعہ کرتا ہے اور ان پر اپنے افسانوں کی فلک پیما عمارتیں تعمیر کرتا ہے۔ میرا مقصد یہ ہے کہ افسانہ نگار اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور اسی ماحول میں اسے افسانہ لکھنے کا مواد مل جاتا ہے۔ مگر مواد مل جانے کے یہ معنی نہیں کہ افسانہ نگار جس طرح ممکن ہو چند منٹ اور ساعت میں اپنے افسانے کی تکمیل کر دے۔ ممکن ہے کہ اسے ایک معیاری افسانہ لکھنے میں ایک دن، ایک ہفتہ ایک ماہ یا ایک سال لگ جائے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک افسانہ نگار افسانہ کی ابتداء کرتا ہے تمہید بہت اچھی ہوتی ہے۔ مگر بعد میں وہ معیار قائم نہیں رہنے پاتا۔ ایسی صورت میں ایسے "افسانہ آئندہ کے لئے اٹھا رکھنا چاہئیے۔

ہماری فروری و مارچ ۱۹۴۴ء کی کتابیں حسب ذیل ہیں

(۱) زندگی کی ٹھوکریں ..... رئیس احمد جعفری
(۲) کردار (ناول) .... ماہر القادری
(۳) سیلاب .... احمد ندیم قاسمی
(۴) انگڑائیاں .... " " "
(۵) ضربیں .... قیسی رامپوری
(۶) زلزلے .... قدوس صہبائی
(۷) شادی اور محبت ...... مقصودہ فرحت
(۸) پریم پجارن ...... قدوس صہبائی
(۹) مجاہد بخارا (امیر بخارا) " "
(۱۰) ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر قدوس صہبائی
(۱۱) مرد انقلاب (شہزادہ کروپاٹکن) " "
(۱۲) رنگین سپنے .... کوثر چاند پوری
(۱۳) تقدیریں .... منظور بخاری

محمد عبدالقادر
بی ایس سی آنرز (لندن)

آپ بیتی کے لٹریچر میں ایک گرانقدر اضافہ

سرسید رضا علی نے اپنی خود نوشت سوانح کا نام "اعمال نامہ" رکھا ہے۔ یہ نام بعض حلقوں میں غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ صاحب موصوف کے متعلق عام اخبار بینی طبقہ کی واقفیت محض اس قدر ہے کہ آپ متعدد سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں اور جنوبی افریقہ میں قیام کے دوران میں آپ کی ایک ہندو خاتون سے شادی ہوئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ طبقہ اس کتاب کو سرگزشتِ ملازمت اور داستان عشق سمجھے۔ لیکن فہرستِ ابواب اور اصل کتاب کی سرسری ورق گردانی کے بعد اسے معلوم ہو جائیگا کہ سید صاحب کی زندگی کے اور بہت سارے اہم گوشے ہیں۔ پہلے سے ہی جو افراد آپ کی سیاسی سرگرمیوں اور ادبی ذوق و شغف سے واقف تھے انہیں اس آپ بیتی کے ذریعہ آپ کی زندگی سے متعلق مزید تفصیلات جاننے کا موقع حاصل ہوگا۔

مصنف نے "اعمال نامہ"[1] کا نام اسی لئے منتخب کیا ہے کہ اس میں اپنے متعلق بے کم و کاست واقعات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کسی حد تک کراماً کاتبین کے لکھے ہوئے اعمال نامہ کے "مختصر چربہ" سے کم نہیں ایک اچھی آپ بیتی ہمیشہ حق گوئی پر مبنی ہوتی ہے جس میں کہ ہیرو اپنے متعلق اصل واقعات بلا تامل اور بغیر کسی آمیزش کے پیش کرتا ہے۔ جہاں کہیں کہ وہ اپنے کارناموں کا ذکر کرتا ہے وہاں اپنی کمزوریوں کو ظاہر کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ یہی سبب ہے کہ روسو، گبن، مل، نیومن، ٹالسٹائے اور گاندھی جیسی شخصیتوں کی آپ بیتی کو دنیائے ادب میں نمایاں حقیقت حاصل ہے۔

آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی کا ہونا بھی ناگزیر ہے ہم میں سے ہر ایک کی زندگی ماحول سے برابر متاثر ہوتی رہتی ہے اور ہمیں اُن تمام قوتوں کا جائزہ لینا چاہیئے جو ہماری زندگی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔

سرسید رضا علی نے آپ بیتی کے مقررہ معیاروں کا بہت کچھ لحاظ رکھا ہے۔ آپ نے محض اپنے ذاتی رجحانات کی بناء پر حقیقت کو نہیں چھپایا ہے۔

محسن الملک سے گہرے تعلقات کے باوجود آپ نے مرحوم کے متعلق بعض ناخوشگوار چیزوں کو بے نقاب کرنے میں تامل نہیں کیا ہے۔ نیز یہ بیان کرنے میں کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کی ہے کہ آپ کو دوران تعلیم میں کہاں کہاں سے مدد ملی یا اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے کیونکر اپنی جائداد فروخت

---

[1] "اعمال نامہ" مصنفہ سرسید رضا علی، کے، ٹی، سی، بی، ای، ایم، ایل، اے۔
ناشر ہندوستانی پبلیشرز دلی۔ ۱۹۴۳ء صفحوں کی تعداد ۵۲۷۔ قیمت:۔ مجلد آٹھ روپے۔

کرنا پڑا، کندرکھی کا معاشرتی ماحول، علیگڑھ کی تعلیمی اور سیاسی فضاء، مراد آباد کے مقامی مسائل۔ برطانوی حکام کی نفسیات، ہندوستانی لیڈروں کے طور طریقے۔ یہ سب آپ کی سرگزشت کے پس منظر کا کام دیتے ہیں۔

"اعمال نامہ" چودہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں نہ صرف آپ کے خاندانی حالات، ابتدائی تعلیم کی کیفیت علیگڑھ کی علمی و معاشرتی زندگی کا مرقع، ملازمت، وکالت اور سرکاری اعزازت کے تفصیلات درج ہیں بلکہ اہل ملک اور بالخصوص مسلمانوں کے سیاسی تحریکات اور زبان و ادب سے متعلق آپ کے خیالات بھی شامل ہیں۔

سید صاحب کی ابتدائی تعلیم قدیم مشرقی طرز پر آپ کے وطن کندرکھی میں ہوئی، اس کے بعد انگریزی تعلیم کے لئے آپ نے مراد آباد کا رخ کیا۔ یہاں سے آپ اعلیٰ تعلیم کے لئے علیگڈھ تشریف لے گئے اور بی۔اے کی ڈگری پانے کے بعد وہیں کچھ عرصہ تک قانون کی تعلیم پاتے رہے۔ لیکن مالی مسائل کی وجہ سے تعلیم کو ترک کرکے ملازمت اختیار کرنا پڑا۔ ملازمت کے تین چار سال ہی گزرے تھے کہ آپ کو تعلیم قانون کی تکمیل کا خیال ہوا اور آپ نے ایل ایل بی کا امتحان دیا۔ اس میں کامیاب ہونے پر ملازمت کو خیرباد کہا اور مراد آباد میں وکالت شروع کردی۔ یہ سلسلہ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا جب کہ آپ الہ آباد منتقل ہوگئے۔ اور وہاں کے عدالت العالیہ میں وکالت کرنے لگے۔ ۱۹۲۵ء کے بعد سے آپ کو متعدد سرکاری اعزازات حاصل ہوئے۔ ۱۹۲۵ء میں ہیڈلسین وفد کے رکن کی حیثیت سے جنوبی افریقہ بھیجا گیا۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۱ء پبلک سروس کمیشن کے رکن کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ ۱۹۲۹ء میں انجمن اقوام میں ہندوستانی وفد کے سرکاری رکن کی حیثیت سے شریک رہے۔ ۱۹۳۵ء تا ۱۹۳۸ء جنوبی افریقہ میں ایجنٹ جنرل کی خدمت انجام دی۔

سرکاری عہدوں سے کہیں زیادہ آپ کی وکالت کا زمانہ اہم ہے جب کہ آپ نے مسلمانوں کے تعلیمی اور سیاسی اُمور میں نمایاں حصہ لیا۔ طالب علمی کے زمانہ سے ہی آپ کو اسی قسم کے کاموں میں دلچسپی تھی۔ چنانچہ پٹنہ میں ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کرانے کے سلسلہ میں اور سر انتنی میکڈانل کی اُردو دشمنی کی مخالفت میں آپ نے قابل ذکر خدمات انجام دیئے مسلم لیگ سے سید صاحب کا تعلق ابتداء سے ہی رہا ہے چنانچہ آپ کے جملہ خدمات کا اعتراف یوں کیا گیا کہ آپ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ اُن تمام اسباب سے بخوبی واقف تھے جو مسلمانوں کی ایک علیحدہ سیاسی جماعت کے قیام کا باعث بنے۔ مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے والا پہلا واقعہ تو سر انتنی میکڈانل کی لفٹننٹ گورنری کے زمانہ میں ناگری کی قرارداد تھی۔ پھر تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا اعلان مسلم یونیورسٹی کے قیام کو ماننے سے انکار اور ان سب سے اہم، مسجد کانپور کے واقعہ نے مسلمانوں کے سیاسی شعور کو تیز کردیا۔ اور اب انہیں اپنی تنظیم کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی۔ مسجد کانپور کے سلسلہ میں آپ نے وہ تمام واقعات جو اس سانحہ سے متعلق ہیں بلا کم و کاست بیان کئے ہیں۔ مسٹر مظہر الحق کے خدمات گنوائے ہیں اور اپنے اس انگریزی مضمون کا بھی حوالہ دیا ہے جو صحیح واقعات کی نشر و اشاعت کے لئے لکھا گیا۔

یہ واقعات تو سر رضا علی کے زندگی کے ابتدائی دور سے متعلق ہیں جب کہ آپ حکومتی ماحول سے بہت دور تھے۔ بعد میں آپ کو کئی سرکاری اعزازات نصیب ہوئے اور آپ کے نقطۂ نظر میں بین تبدیلی کے قرائن ہو سکتے تھے۔ غنیمت ہے کہ آپ نے اپنی

انفرادیت کو قائم رکھا اور انگریز حکام کی ذہنی کیفیت کو پیش کرنے میں کسی قسم کا تامل نہیں کیا چنانچہ آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ "نجی زندگی میں انگریزوں کا اخلاقی معیار بلند اور کافی بلند ہے مگر ان مسائل کے بارہ میں جن کا تعلق قومی پالیسی سے ہے ایک رسمی اور تقلیدی دستور العمل مقرر ہے جس پر حکمران قوم کے افراد عمل کرتے ہیں"۔

ایک اور جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے "لندن کا امتحانی مقابلہ پاس کر کے جو انگریز انڈین سول سروس کے ممبر مقرر ہوئے ان میں سوائے پولٹیکل تخیل کے سب کا قابلیتیں موجود تھیں مگر جو مورخ آئندہ انڈین سول سروس اور امتحانی مقابلہ کے صحیح واقعات لکھیگا اس کو افسوس کے ساتھ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس جھرمٹ میں میکڈانل۔ مشٹن اور ہیلی جیسے چمکتے ہوئے تارے تو نکلے لیکن ہیوم جیسا چاند نہ پیدا ہوا جس کی روشنی گہن لگ جانے کے بعد بھی سب تاروں پر غالب تھی"۔ ہمیں امید ہے کہ دوسری جلد میں جب آپ حالیہ سیاسی تحریکات پر بحث کریں گے تو حکومت اور مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان کشمکش کے صحیح اسباب اور اساسی اختلافات کو دور کرنے کے طریقوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرینگے آپکو جو تجربات کہ جنوبی افریقہ میں ہوئے اُن سے بھی حاکمانہ نفسیات کی تحلیل میں خاصی مدد دیں گے۔

"اعمال نامہ" میں جابجا لسانی اور ادبی مسائل پر بحث موجود ہے۔ آپ نے ایک جگہ فرمایا ہے کہ مغربی زبانوں کے بعض الفاظ کو بھی اردو میں رواج دینے پر ہمیں اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے اور اسے صرف خاص خاص حالات کے تحت ہی روا رکھا جائے آپ نے بجا طور پر مرکزی ادبی اردو کی حمایت اور ادبی معیارات کو سختی سے برقرار رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ سچ پوچھو تو زبان کی بقاء کا مسئلہ ایک حد تک اسی سے وابستہ ہے۔ ادبی مسائل میں بھی جو مغرب پرستی کا دور دورہ ہے اس پر تنقید کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے "

سرسید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ مغربی ممالک کے حالات، طرز معاشرت اور ادب پر بغیر کافی عبور رکھے ہمارے بزرگ ہر مغربی چیز کو ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے ذریعہ نجات سمجھتے تھے"۔ ایسے زمانہ میں جب کہ ہمارے ادبی رجحانات میں سخت تبدیلی کی ضرورت تھی۔ شاید اس طریقہ کار کا تھوڑا بہت جواز ہو سکے۔ لیکن آج کل تو ہمیں اپنے طرز عمل میں آزادی کی ضرورت ہے۔

آپ کو اپنے خاندانی روایات اور مشرقی طرز تعلیم کی بدولت، انہی چیزوں سے بیحد اُنس رہا ہے آپ نے اپنے ادبی ذوق کا جابجا ثبوت دیا ہے۔ شعراء کا مقابلہ و موازنہ نہایت ہی خوبی سے کیا ہے دبیر کی اصلی حیثیت کو نمایاں کرنے کی کوشش قابل استحسان ہے۔ کتاب کا بارھواں باب تو خاصی ادبی شان رکھتا ہے اس میں آپ نے مومن کے متعلق بحث کی ہے اور اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ شملہ کے مشاعروں۔ ادبی مناظروں اور دیگر ادبی محفلوں کے ذکر سے آپ کی اردو زبان و ادب سے دلچسپیوں کا ثبوت ملتا ہے۔ نیز مختلف شعراء کا کلام آپ کو بکثرت یاد ہے اور آپ نے اس کا استعمال جابجا کیا ہے۔

آپ کا مذہبی مسلک روشن خیالی۔ رواداری اور یگانگت پر مبنی ہے۔

خوشی کا مقام ہے کہ آپ "گرفتاران بوبکر و علی"

میں سے نہیں ہیں۔ ہمیں آپ سے اس بارے میں قابل اتفاق ہے کہ اصل چیز اسوۂ حسینی ہے۔ رقت اور آہ و بکا کو مقصد واحد بنا لینا اور اسی کو وسیلۂ نجات تصور کرنا غلط ہے۔ آپ نے رسوم محرم کے سلسلہ میں جن اصلاحات کی تجویز کی ہے وہ بے شک قابل غور ہے۔

آپ کی مذہبی۔ سیاسی اور ادبی زندگی سے متعلق جو تفصیلات کہ درج ہیں اُن کے مقابلہ میں آپ کی خانگی زندگی کے جزئیات کچھ کم اہم نہیں۔ ہر انسان کی زندگی اپنی اصلی حالت میں وہی ہوتی ہے جو گھر پر بسر کی جاتی ہے۔ گھریلو زندگی جو بناوٹ اور ظاہرداری سے آزاد ہوتی ہے انسان کو اپنے حقیقی خد و خال کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ اسی لئے کتاب کے وہ حصے جس میں کہ آپ نے اپنی ماں سے انتہائی محبت کا اظہار کیا ہے یا اپنے ازدواجی تعلقات اور خاندانی لگاؤ کی طرف اشارے کئے ہیں۔ خاصے اہم ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اُردو زبان میں جو خود نوشت سوانحات موجود ہیں اُن میں سر رضا علی کی آپ بیتی سے ایک گران قدر اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اس پایہ کی کتاب کے لئے بہتر چھپائی اور کتابت کی ضرورت تھی۔ بعض مقامات پر گنجلک عبارت اور بعض صفحات پر سطروں کی غیر مساوی تعداد سے کتاب کی ظاہری خوبیاں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اُمید کہ دوسری جلد میں اس کا بطور خاص خیال رکھا جائے گا نیز کتاب کے ساتھ صحت نامہ چھاپنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ ہماری رائے ہے کہ اس ضخیم کتاب کا مختصر خلاصہ بھی علیحدہ طور پر شائع کر دیا جائے تو خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

تم

خورشید احمد جامی

جلوہ بقدرِ شوق دکھاتے نہیں ہو تم	دنیائے عقل و ہوش پہ چھاتے نہیں ہو تم
غمہائے روزگار بھی کیا دلفریب ہیں	سچ ہے کہ اب تو یاد بھی آتے نہیں ہو تم
تاریک ہو گئی ہیں تصور کی بستیاں	اب شمعِ التفات جلاتے نہیں ہو تم
وہ دلنوازیاں وہ محبت کہاں گئی	اب تو نظر بھی مجھسے ملاتے نہیں ہو تم
افسانۂ حیات ہے کچھ ناتمام سا	یعنی کہ دردِ عشق بڑھاتے نہیں ہو تم
جن میں دھڑک رہی تھیں جنوں کی حکایتیں	وہ گیت آرزو کے سناتے نہیں ہو تم
کیا دردمندیاں بھی گوارا نہیں تمہیں	فریاد ہے کہ دل بھی دکھاتے نہیں ہو تم

اب تو یہ سوچتا ہوں کوئی زندگی ہے وہ
جس زندگی کو داو بناتے نہیں ہو تم

علی آخشر

اَدب

تعمیر ادب گرچہ نمایاں نہیں ہوتی
اِس راہ میں مِلتے ہیں کہیں قصر نہ ایواں
اِس منزل اِسرار وحقائق میں پہنچکر
مِٹی کے کھلونوں سے بہلتا نہیں انساں

اِسرار جنوں اور ہیں، آئین فرد اور
ہستی ہے یہاں بیخبر گردش دَوراں
یاں اَطلس و دیبا میں اُلجھتی نہیں عقلیں
یاں دولت و پندار کے اجزا ہیں پریشاں

ہر شام دل آویز ہے، ہر صبح طرب خیز
یہ محفل اِسرار ہے وہ منزلِ عرفاں
یہ آئینہ حسن وجمال اَزلی ہے
یاں خاک کے پتلے نہ بنے فتنۂ دوراں

یاں حُسن بھی ہے اور محبت بھی ہے باہم
اِس عالم تمکیں میں نہ حیرت ہے نہ حرماں
ہر نغمہ یہاں شرح نِشاط اَبدی ہے
اِس بزم میں خود مطرب فطرت ہے غزلخواں

یاں صرف گل و لالہ نگاہیں نہیں ہوتیں
کھلتے ہیں یہاں روح پر اسرار گلستاں
مِلتا نہیں یاں مَرحلۂ زہد و ضلالت
ہوتی نہیں یاں کشمکش عصمت و عصیاں

ہے اِس کے فقیروں کا صِلہ نعمت کونین
مانندِ کف ناک ہے یاں عظمت سُلطاں
المختصر آئین اَدب، غور ریون کیجیے
ہے جلوۂ طراز چمن عالم اِمکاں

وابستہ اَدب ہی سے ہے اقوام کی قسمت
یہ سیرت وکردار اَدب ہی کا اِحساں

جس قوم نے تعمیر ادب کی نہیں محُکم
وہ قوم ہے منجملۂ خاشاک پریشاں

احمد ندیم قاسمی

انگڑائیاں کا دیباچہ

"یہ سوچتی ہوئی آنکھوں والے زرد رو نوجوان مستقبل کے سیاسی اور سماجی انقلابات کے خالق ہیں۔ انہیں ماضی کی طرف نہ گھسیٹو۔ کیونکہ یہ امروز و فردا کے چہرے سے ماحول وراثت اور قانون و رواج کے دبیز پردے چاک کرنے نکلے ہیں۔"

"راہی"

اَدب ایک نازک آبگینہ ہے، جس میں اُبلتی ہوئی شراب پناہ لیتی ہے، میں اِس سے زیادہ اَدب کے متعلق نہ کچھ کہنا چاہتا ہوں نہ کہہ سکتا ہوں۔

مختصر افسانہ اُردو ادب کے لئے کوئی نئی چیز نہیں رہا، اور گذشتہ تیرہ برس میں تو اس نے کچھ ایسی پھریری لی ہے، کہ ہم شکست یا ندامت کے خوف کے بغیر اُردو افسانہ کو یورپ کی ترقی یافتہ افسانوی اَدب کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں، اردو افسانہ کی یہ فوری ترقی دنیا بھر کی زبانوں میں مثالی حیثیت رکھتی ہے، اس کی وجہ وہ تیزی سے پہلو بدلتا ہوا سیاسی دھارا ہے، جس نے نوجوانوں کے ذہنوں میں تشکیک اور تذبذب کے نشیب و فراز تراشے ہیں، اور بوڑھوں کو کھسیانی سوچوں میں غرق کر دیا ہے۔

مقام مسرت ہے، کہ کمزور، بے سروپا اور بے کار افسانوں کے طوفان سے ہمارا غیر فانی ادب بچ نکلا، ہر زبان میں بلند ادب کے ساتھ ساتھ پست اور بھونڈی یاوہ گوئی سائے کی طرح لگی رہی ہے، لیکن دربارِ اَدب میں بے مقصد چیزیں بار نہیں پا سکتیں۔ اُردو اَدب کے اِس بحرانی اور عبوری دَور میں بھی بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں، ہر "بوالہوس" نے "حسن پرستی" کو اپنا شعار بنا لیا ہے، رسالے افسانوں کے دَم سے زندہ ہیں، روزآنہ اخباروں کے خاص نمبر بھی افسانوں کی اِس یلغار سے محفوظ نہیں رہ سکے؛ کہانیوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے، کہ اچھی کہانیوں کا اِنتخاب بہت دشوار ہو جاتا ہے؛

جب تنقید نگار کسی فن کی تکمیل کا دعوٰے کرنے لگے، تو وہ در اصل ادبی گناہ کا مرتکب ہو رہا ہے لیکن خوش قسمتی سے ابھی تک ہمارے نقادوں نے حرفِ آخری کی رٹ شروع نہیں کی۔ اول تو ہمارے ہاں صحیح النظر نقادوں کی افسوس ناک کمی ہے، لیکن جو چند ایک "راہ داں" ہیں، وہ ابھی تک جدید افسانے کی تکنیک اور تعمیر کے لئے ایک خاص سانچہ تجویز نہیں کر سکے، ہر نوع کے افسانے لکھے جا رہے ہیں، اور ہر نوع کی تنقیدیں کی جا رہی ہیں، یہ ہمارے ادب کی زندگی اور کشمکش زندگی کا ثبوت ہے۔

پریس کی حیرتناک ترقی ہمارے اَدب کی توسیع کا سب سے بڑا سبب ہے، اب ہمارے ہاں اِس قسم کے اَدیب موجود نہیں، جو ان پھولوں سے

مماثلت رکھتے ہیں، جو ویرانوں میں اُگے، اور مرجھا گئے، آج کل ہر اَدیب منظرِ عام پر آجاتا ہے، ہم اس کی فنکاری کی جانچ پڑتال کرسکتے ہیں، نہایت آزادی سے اپنے خیالات کا اِظہار کرسکتے ہیں، اور شاید یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگاروں کے اس انبوہ میں سے سچے اور بلند اَدیب نہایت آسانی سے چن لئے گئے ہیں۔

یہ نئے افسانہ نگار تعلیم یافتہ ہیں، حساس ہیں بے تکلف ہیں، بناوٹ سے نفرت کرتے ہیں جو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں وہی لکھتے ہیں، اُن کے اِحساسات پر نہ قانون پہرہ بٹھا سکتا ہے اور نہ ماحول، وہ جانتے ہیں، کہ برسوں کی غلامی اور مدتوں کے ٹھہراؤ نے ہماری سماج کو متعفن کردیا ہے، اور یہ تعفن صرف اِس طرح دوَر ہوسکتا ہے، کہ لوگوں کو اس تعفن کا احساس دلایا جائے، ہمارا نیا اَدب افیون نہیں بیچتا۔ وہ قمچیاں چلاتا ہے، چرکے لگاتا ہے، زہر میں بجھے ہوئے تیر برساتا ہے، وہ جانتا ہے کہ زہر ہی زہر کا مداوا ہے، اُسے معلوم ہے کہ ہمارا پرانا ادب محکومیت کے اس خمار کی پیداوار ہے، جو دراصل حاکم کی مصلحت ہے لیکن جِسے اس کی سخاوت پر محمول کیا جاتا ہے۔

اِس تجرباتی دَور میں کئی لغزشیں بھی ہوئی ہیں کیونکہ تجربہ ناکام بھی ہوسکتا ہے، لیکن نئے اُدیبوں کی کاوش اور نیت پر شک کرنا اُن کی ترقی کی جڑیں کاٹنا ہے، بلاشبہ ہمارے اَفسانہ نگاروں نے مغربی ادب سے بہت زیادہ اِستفادہ کیا ہے، لیکن جب مختصر افسانہ مغرب ہی کی تخلیق ہے، اور مغربیوں ہی نے اِسے بنایا اور سنوارا، تو ہم پر لعن طعن کرنے والے ہمارے لئے کونسا دوسرا راستہ تجویز کرتے ہیں، مشرقی اَدب میں داستان ہے، اَفسانہ نہیں، تخیل ہے، حقیقت نہیں، خواب ہے، بیداری نہیں، وہ ہمیں سُلا تو سکتا ہے لیکن جگانے پر قادر نہیں، اُس کے پاس نشے ہیں، مگر اِن نشوں کے توڑ سے اس کا دامن خالی ہے، وہ ہمیں الف لیلا ایسی ضخیم کتاب دے سکتا ہے، ماپساں کے مختصر اَفسانے نہیں دے سکتا، وہ جنون دیوؤں اور پریوں کی باتیں کرسکتا ہے، مزدور، کسان اور مفلس لڑکیوں کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ وہ بہلا سکتا ہے، تجزیہ نہیں کرسکتا۔ اِس حالت میں ہم پر مغرب کی نقالی کا الزام سراسر بے بنیاد ہے، ہم نے فن کی باریکیاں مغرب سے مستعار لی ہیں، لیکن ہم نے فن کے خطوط میں ہندوستانی رنگوں کو سمویا ہے، ہم نے اپنے دیہات کی گلی سڑی لاشوں پر سے ریشمی کفن اتارے ہیں ہم نے اپنی سماج کے گھناؤنے ڈھانچے پر سے غازے کی تہیں کھرچ ڈالی ہیں، ہم نے چپ چاپ حویلیوں میں گھومتی ہوئی شرمیلی عورتوں کی دہاڑتی ہوئی تنہائیوں کے راز کھولے ہیں ہم گالیاں نہیں دیتے سچائیاں بیان کرتے ہیں، ہم عریانی کے شیدا نہیں، ہم یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ آپ سب عریاں ہو رہے ہیں اگر ہمارے نفسیاتی تجزیوں سے آپ کا جذبۂ نفس پرستی بیدار ہوجاتا ہے، تو یہ آپ کی کم ظرفی ہے، آپ سطح پر تیرنے کی بجائے تہوں پر جائیے، زندگی بہت عمیق ہے، اور صاف ستھری سطح پر تھرکنے والوں کو یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ تہوں میں چٹانیں بھی ہیں، اور وہ خوفناک روئیدگی بھی ہے، جس میں زندگی پھڑپھڑا رہی ہے۔

یہاں مجھے افسانہ کے اندازِ تعمیر سے سروکار نہیں، کیونکہ یہ نقادوں کا کام ہے، مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ افسانہ روزبروز ترقی کررہا ہے، پہلے پہلے اِمکان اور اتفاق تخیلی اَدب کے ضروری عناصر تھے، اَب ہم صرف حقیقتوں سے کام لے سکتے ہیں، ہمارے افسانوں کی ابتداء میں تعجب اور اِنتظار کی سرسراتی ہوئی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، ہمارے افسانے اُن

ہوائی جہازوں کی طرح نہیں، جو ہمیں زمین سے اٹھا کر فضاء میں لے جاتے ہیں، اور اِدھر اُدھر گھما کر پھر زمین پر اتار دیتے ہیں، اب ہم اپنے پڑھنے والوں کو فضاء میں لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں، نیچے اُترنے کے لئے وہ خود ہی نئی نئی راہیں تلاش کرتے ہیں، اِس لئے ہمارے افسانوں کے انجام بھی فنی لحاظ سے بہت بلند ہو رہے ہیں۔ ہم ہیرو کی پرستش کے قائل نہیں۔ ہم ہر چیز کو نہی دھندلکے میں دیکھنے کے عادی نہیں، ہم حقیقت نگار ہیں اور حقیقت نقابوں کی دشمن ہے۔

ہمارے ہاں پلاٹ بھی ہے، لیکن ہم اسے فن کا لابدی جز قرار نہیں دیتے، ہم کردار نگاری کرتے ہیں، اور ہمارا افسانہ جس چیز پر مدتوں تک فخر کر سکتا ہے، وہ کردار نگاری ہی ہے، ہمارے افسانوں کے مکالمے جناتی نہیں۔ ہم خوابوں میں نہیں بڑبڑاتے، ہمارا مشاہدہ کسی سے کوئی رنگین عینک مستعار نہیں لیتا، صدق اور خلوص سے ہم وہی کچھ کہہ دیتے ہیں، جو ہم دیکھتے ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے، کہ مشاہدہ کی باریکی اور گہرائی ہمارے جدید افسانہ کی وہ خصوصیت ہے جو دوسری زبانوں کے ادب میں اتنی فراوانی سے نہیں ملتی۔ اس کی وجہ وہ شدتِ احساس ہے، جو ہماری مجبوریوں کی پیداوار ہے، ہم میں سے ہر ایک کا اپنا اسلوب ہے۔ اِسٹائل کے متعلق کوئی اصول مقرر نہیں، ہمارے جذبات و احساسات ہمارا اسٹائل خود بخود بناتے چلے جاتے ہیں۔ جو حضرات اسلوب کے لئے کوئی قانون وضع کرتے ہیں، وہ حقیقت میں اسلوب کی باریکیوں سے نابلد ہیں۔ کئی قابلِ رحم نقاد نئے لکھنے والوں پر "جذبانیت" کا الزام دھرتے ہیں لیکن آنسوؤں کی معمولی نمکینی کی وجہ سے ہمارے ماتھوں پر جذبانیت کا لیبل چپاں نہیں کیا جا سکتا۔

ہم تصویروں میں سوچتے ہیں، ان تصویروں کو مَن مانی ترتیب نہیں دیتے، منطقی ترتیب دیتے ہیں۔ ہم اس ماحول کو نہایت غور اور محنت سے پرکھتے ہیں، جو اِن تصویروں کو سہارا دیتا ہے، ہم بہت کم کہتے ہیں، ہمارا کام صرف اشارہ کرنا ہے

ہمارے افسانوں کا طرۂ امتیاز ہے!

ہم جب اپنے افسانوں کے کرداروں کی ذہنیتوں کو ٹکراتے ہیں، تو یہ ٹکراؤ اتفاقی نہیں ہوتا واقعات کا بہاؤ اور اذہان کی تدریجی ترقی کا ناگزیر نتیجہ ہوتا ہے، ہم حتی الوسع اختصار سے کام لیتے ہیں لیکن افسانے کی پیمائش کا کوئی پیمانہ مقرر نہیں، ہمارا افسانہ پچاس سطروں میں بھی ختم ہو سکتا ہے، اور پچاس صفحوں میں بھی۔ لیکن ہم الفاظ کی بھرمار سے اجتناب کرتے ہیں۔ آوارگئی خیال سے کتراتے ہیں، ہمارے افسانوں کا ہر لفظ کردار، پلاٹ اور ماحول سے کوئی نہ کوئی گہرا تعلق ضرور رکھتا ہے۔ محل اور موقع کی پہچان کے بعد ہم ان میں درد بھی لے آتے ہیں اور مزاح بھی۔ ہم پرانی لکیر کے فقیر نہیں، جدتِ خیال کو ہم بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں، ہم اپنے موضوع سے خلوص برتتے ہیں، ہم رسماً نہیں لکھتے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ہم زبان پر کند آرے چلانے کے بھی روادار نہیں، ہم زبان کو وسیع کرتے ہیں، اُسے چند تراکیب کے محبسوں میں نہیں جکڑتے، زبان کا احترام ہمارا عزیز ترین فرض ہے۔

فارم کے حسن اور بیان کی صفائی کو ہم حقیقت نگاری کے جوش میں فراموش نہیں کرتے، ہم سنجیدگی سے سوچتے ہیں، اور سنجیدگی سے لکھتے ہیں، اگر ہمارے پڑھنے والے بھی اسی سنجیدگی اور گہرائی سے کام لیں، تو اُن کے نفسانی جذبات میں کوئی کھلبلی نہ مچے،

ہم اپنی قوتوں کو ضائع نہیں کرتے، ہم زندہ رہنا چاہتے ہیں، اور توقع کرتے ہیں، کہ وہ لوگ بھی ہمیں زندہ رہنے دیں جو ہمارے جذبات و احساسات کو ابھی تک گرفت میں نہیں لاسکے، جو ہماری عُریاں نگاری کا رونا روتے ہیں، لیکن اپنی عُریانی کا اُنہیں علم تک نہیں، جو ہماری پرائیویٹ زندگیوں پر لعن طعن کرتے ہیں، لیکن اپنی اور اپنے پڑوسیوں کی زندگیوں پر دبیز پردے ڈالے رہتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عورت اور مرد کے درمیان ایک بہت بڑی دیوار حائل ہے، انھوں نے یہ دیواریں پھاندی ہیں۔ ہم اس دیوار ہی کو سرے سے گرا دینا چاہتے ہیں، بس یہی فرق ہے، جس نے نئے افسانہ نگاروں کو بزرگوں کا مقہور بنا رکھا ہے۔

ہم مارکسیت، کمیونزم اور سوشلزم کا پروپیگنڈا نہیں کرتے، پروپیگنڈا آرٹ کی موت ہے، اگر ہمارا انداز فکر اِن تحریکوں سے کوئی مطابقت رکھتا ہے، تو اِس مطابقت کو پروپیگنڈا کہنا نہایت سطحی سوچ کا نتیجہ ہے۔

ہم حیات کے نئے نئے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے نکلے ہیں، ہمارے مدنظر انسانیت کا مفاد ہے، ہمارے مدنظر وہ آزادی ہے، جو برسوں کی غلامی تلے دب کر سسک رہی ہے، ہمارے مدنظر عمل، حرکت اور احساس ہے، ہم اگر کسبیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں تو محض اِسلئے کہ اُن پیکروں پر چڑھی ہوئی غازے مسی کی تہیں ہمارے بزرگوں کے پسینے کی کمائی سے خریدی جاتی ہیں، ہم اگر کسانوں کے متعلق لکھتے ہیں، تو صرف اس لئے کہ ان کے کھلیانوں پر ہمارے سرمایہ دار زندگی بھر تاک لگائے بیٹھے رہتے ہیں، اگر ہم نفسیاتی تجزیوں کی طرف جھک چلے ہیں، تو بس اِس خاطر، کہ انسانی ذہن ہی عمل کا پیشہ ضمیر ہے، ہم مینار کا کلس دیکھنے سے پہلے اسکی بنیاد کو کریدتے ہیں، اور چونکہ ہمارا یہ انداز نظر موجودہ ماحول میں اَنوکھا سا ہے، اِس لئے ہمیں نفرت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

لیکن ہم اپنے عقائد کو پتھر پر لکیر نہیں سمجھتے، ہم اپنے رہنماؤں کی قدر کرتے ہیں، صرف اگر ہمارے رہنما اس زہرناک ماحول میں سانس لینے سے اجتناب نہ کریں، جس نے ہمارے ملک کی اکثریت کو موت اور زندگی کے درمیان اُلٹا لٹکا رکھا ہے۔

یہ مجموعہ جدید افسانہ نگاروں کی کس حد تک نمائندگی کرتا ہے، اِس کا فیصلہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے، میں نے کوشش کی ہے، کہ جدید افسانہ کے ہر اسکول کی نمائندگی ہو سکے، افسانہ نگار اور اسکے افسانہ کے متعلق میں نے ہر افسانہ کے شروع میں ایک مختصر سا نوٹ دے دیا ہے، اِس لئے یہاں سب فنکاروں کے متعلق تفصیلی بحث کرنا ضروری نہیں، آپ کو یہاں نڈر اور بے باک منٹو ملے گا، جو نئے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ بدنام لیکن سب سے زیادہ کامیاب ہے۔ **عصمت** ملے گی جس کی صحیح جرات کی داد صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے عصمت کے فاش کئے ہوئے رازوں کو گھروں کی چاردیواریوں میں سرسراتے دیکھا ہے کرشن بھی یہاں موجود ہے جس نے جنتِ کشمیر کے اس پہلو کی بے مثال اور کامیاب نقاب کشائی کی ہے، جو جہنم کو شرماتی ہے۔

عسکری کا نفسیاتی تجزیہ بھی آپ یہاں پائیں گے وہ تجزیہ جس نے سطح بینوں کی حصوں میں کھلبلی ڈال دی ہے، بیدی کی گہرائی ——— مفتی کا تحت الشعوری الجھاؤ۔ اختر انصاری کی حقیقت نگاری اشک کی سماجی آویزش، شفیق کی محبت آلود تلخی اور حسینی کی جزیات نگاری ——— یہ سب کچھ آپ کو انگڑائیاں میں ملے گا۔

مجھے افسوس ہے کہ چند افسانہ نگار اِس فہرست

میں شامل نہیں۔ لیکن انگڑائیاں کا دوسرا ایڈیشن انشاءاللہ اس کمی کو پورا کر دے گا۔

میں اُن افسانہ نگاروں اور پبلیشروں کا ممنون ہوں، جنھوں نے مجھے اِن افسانوں کو "انگڑائیاں" میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ اور ان افسانہ نگاروں اور پبلیشروں سے عذر خواہ ہوں، جن سے میں اجازت طلب نہ کر سکا، مجھے اُمید ہے کہ انگڑائیاں کی افادیت اُن کے اطمینان کے لئے کافی ثابت ہوگی۔

آخر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ یہ چند سطور میں نے بحیثیت نقاد نہیں لکھیں، صرف ایک ایسے افسانہ نگار کی حیثیت سے لکھی ہیں، جو اِس نئی جماعت کا ایک ادنیٰ سا فرد ہے اور جس نے اپنے معاصرین کے فن کو فن کی روشنی میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

فراق گورکھپوری

بطرزِ حافظ[1]

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگِ نشاں ہے کہ جو تھا

آج بھی عشق لٹاتا دل و جاں ہے کہ جو تھا
آج بھی حسن وہی جنس گراں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیثِ دگراں ہے کہ جو تھا

عشق افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت
وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

پھر وہی چشم سخن سنج ہے اور بزم سماع
وہی جادو ہے وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

آج بھی منتظر جلوہ نمائی ہیں فضائیں
آئنہ خانہ ابھی تک نگراں ہے کہ جو تھا

پھر سرا انجمن عشق ہے اِک بارشِ نور
چھلکے جاموں سے چراغاں کا سماں ہے کہ جو تھا

نظر آجاتے ہیں تم کو تو بہت نازک بال
دل مرا کیا وہی اے شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

پھر وہی خیرہ نگاہی ہے تیرے جلووں سے
وہی عالم ترا اے برقِ دماں ہے کہ جو تھا

بھیگتی راتوں کی تصویر ہے رستی ہوئی زلف
نگہِ مست میں صد کیفِ جواں ہے کہ جو تھا

آج بھی صید گہِ عشق میں حسنِ سفاک
لئے ابرو کی لچکتی سی کماں ہے کہ جو تھا

جلوۂ حسنِ رخِ آئنہ پرور اب بھی
دولتِ دیدۂ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا

آج بھی عشقِ سیہ بخت کا قلبِ سوزاں
شمعِ محرابِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

یوں تو بے کیف سی اس دور میں ہے بزمِ حیات
ایک ہنگامۂ سرِ رطلِ گراں ہے کہ جو تھا

ظلمت و نور میں کچھ بھی نہ محبت کو ملا
آج تک ایک دھندلکے کا سماں ہے کہ جو تھا

لاکھ کر ظلم و ستم لاکھ کر احسان و کرم
تجھ پہ اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

تیرہ بختی نہیں جاتی دلِ سوزاں کی فراق
شمع کے سر پہ وہی آج دھواں ہے کہ جو تھا

[1] دیکھئے حافظ کی غزل "جہاں ہست کہ بود جواں ہست کہ بود"

اِشتراکی اَدیب بَاری علیگ

قدیم ایرانؔ کی فتوحاَت

آریہ نسل کے لوگ غالباً دو ہزار قبل مسیح میں اپنے آبائی وطن (بحیرۂ خزر کا شمالی علاقہ) سے جنوب اور مغرب کی طرف روانہ ہوئے۔ کم و بیش اسی زمانہ میں بعض آریائی قبائل بحیرۂ بالٹک کی طرف بھی روانہ ہو رہے تھے۔ آریوں کے وہ قبائل جن میں کسی حد تک منگولی آمیزش ہو چکی تھی۔ اشوری اور بابل سلطنتوں کے شمال اور مشرق میں آباد ہو چکے تھے۔ ان میں سے کئی قبیلوں نے ہندوستان کی راہ لی۔ اِن قبائل نے ایران میں آباد ہو کر آہستہ آہستہ اِتنی قوت پیدا کر لی تھی کہ اُنھوں نے سنہ ۶۵۰ ق م اشوری سلطنت کو ختم کیا ہے اور سنہ ۵۳۸ ق۔م بابل کو فتح کیا۔

ایران میں آریوں نے دو بڑی ریاستیں قائم کی تھیں۔ میڈیا اور پریشس کی دونوں ریاستیں ایک طویل مدت تک آپس میں لڑتی رہیں یہاں تک کہ کیخسرو (یونان کا سائیرس) نے سنہ ۵۵۰ ق۔م میں سلطنت ایران کی بنیاد رکھی۔ اس کی سلطنت لدیہ کی سرحدوں سے ہندوستان کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی تھی۔

اسی زمانہ میں لدیہ پر کروکتن کی حکومت تھی۔ کیخسرو کے تخت نشین ہوتے ہی کروسس نے ایران پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں لیکن کیخسرو نے کروسس کو اس کی راجدھانی سارڈیز میں شکست دی ایرانیوں نے سارڈیز کو آگ لگا دی۔ لدیہ کی مُملکت کے ختم ہوتے ہی ایشیائے کوچک کی یونانی نو آبادیاں (شہری ریاستیں) کیخسرو کے قبضے میں آگئیں۔ اب اُن نو آبادیوں پر سارڈیز کی جگہ سوسہ کا اِقتدار تھا۔ کیخسرو کے سپہ سالار ہرپاگوس نے ایک ایک کر کے ایشائے کوچک کی تمام شہری ریاستوں کو فتح کر لیا۔

کیخسرو کو کئی مرتبہ تورانیوں سے لڑنا پڑا۔ بابل کو فتح کرنے کے بعد اُس نے جھیل یورال کے کناروں پر آباد سیتھی قوم سے لڑائی شروع کی۔ ایرانی روایات کے مطابق کیخسرو سیتھیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا۔

کیخسرو کی موت (غالباً سنہ ۵۳۰ ق۔م) کے بعد اس کا بیٹا کیکاؤس (یونانیوں کا کمبے سیسز) تخت پر بیٹھا اپنے باپ کی سلطنت بڑھانے کے لئے اس نے مصر پر حملہ کیا۔ مصر پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا۔ کیکاؤس نے مصریوں نے ہر اس نشان کو مٹا دیا جو ان کے نزدیک مقدس تھا اس کے اپنے ہاتھ سے اس بَیل کو مار دیا جس کی مصری پُوجا کرتے تھے وہ اَبھی قتل و غارت میں مصروف تھا کہ اس نے خواب میں اپنے بھائی کو بغاوت کرتے ہوئے دیکھا۔ خواب پر سچائی کا گمان کرتے ہوئے اس نے اپنے بھائی کو قتل کروا دیا۔ قاتل بھی تھوڑی مدت بعد قتل کر دیا گیا۔ اَب ایران کسی تاجدار کے بغیر تھا۔ ہر ایرانی اَمیر نے تخت پر بیٹھنے کی جدوجہد کی۔ ایران میں خانہ جنگی کا خطرہ تھا۔ ملک کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے ایران کے

سات امیروں نے دارا (داریوش اوّل) کو ایران کا بادشاہ مان لیا۔ دارا نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سے ایران میں اَمن قائم کیا۔ اس نے ''بے ستون'' پر اپنے جن کارناموں کو کندہ کرایا تھا ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے کئی صوبوں کی بغاوتوں کو فرو کرنا پڑا۔ اُس نے اپنی سلطنت کو کئی صوبوں میں تقسیم کیا۔ ان ایرانی صوبوں کا ہر حاکم خشترپاون کہلاتا تھا۔ یونانیوں نے اُسے سیٹرپ بنالیا۔ اِن حاکموں کو اپنے اپنے صوبوں میں بہت سے اختیارات حاصل تھے لیکن اُن میں سے ہر ایک صوبے کے مقدمین دارا کی فوج رہتی تھی دارا نے بہت سے ٹیکس معاف کر دیئے تھے اس نے موجودہ یورپی روس پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ واپسی پر اس نے ہرپس پر قبضہ کرنے کے بعد بحیرۂ ایجین کے شمالی ساحل کی یونانی نو آبادیوں کو فتح کیا۔ اس کی سلطنت نیل سے سیحوں کے کناروں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس دنیا میں بہت کم لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی کامرانیوں کی انتہا پر پہنچ چکے ہیں۔ دارا بھی اسی قسم کے لوگوں میں تھا۔ دارا نے یونان پر چڑھائی کر دی۔ لیکن شکست کھائی۔ شکست کھانے کے بعد وہ گیارا سال تک زندہ رہا اس نے ۵۸۶ ق م میں وفات پائی۔

ایران کی فتوحات کو جزیرہ نمائے یونان اور بحیرۂ ایجین کے جزیروں تک پہنچ کر رکنا پڑا۔ یونان اور ان جزیروں میں ایرانیوں کے وہ ہم نسل آباد تھے جو صدیوں پہلے یورپ (تھسلی) کی راہ سے ان پر قابض ہو چکے تھے۔ ایران کے تاجدار دارا اور خشایارشاہ (زرکسیز) نے یونان کے شمالی علاقوں پر حملے کئے لیکن وہ دونوں یونان کو فتح نہ کر سکے۔

زرکسیز نے اپنے باپ کی فتوحات کی پالیسی کو جاری رکھا۔ مصریوں کو شکست دینے کے بعد اس نے اِنسانی تاریخ کی ایک اہم ترین مہم کو جاری کیا۔ یونانیوں نے پھر ایرانیوں کو شکست دی۔ یونانی ڈرامہ نگار اسکائی لس ''ایرانیوں'' میں ایران کا اس تباہی کا نوحہ ایران کی ملکہ سے ان الفاظ میں کراتا ہے۔

" اے ساعد سینز! نفرت کے قابل ہے
تیرا نام!

ایتھنز! تیرے نام سے آہ و زاری وابستہ
ہے۔
تو اپنے دُشمنوں کے لئے کِس قدر
خونناک ہے!

اِیتھنز!
ایران کی کنواریوں نے ناحق شادیاں
کیں۔
تو نے اِن سب کو بیوہ کر دیا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائپوری

اَدب اور انقلاب

اُردو کے اَدبی اِنقلاب کے سب سے ممتاز علمبردار کے اَن مقالوں کا مجموعہ جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اِضافہ کیا۔ اِس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ " ادب اور زندگی شامل ہے جس نے اَدبی دنیا میں ہلچل مچادی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے ساتھ بنگال کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام اور سوویٹ روس کے اَدب پر وہ سیر حاصل مضامین ہیں جنھوں نے ہمارے شاعروں اور اَدیبوں کے دل و نگاہ کو وسعت بخشی کتاب کے شروع میں ایک اعلان نامہ ہے جو پنڈت جواہرلال نہرو، منشی پریم چند مرحوم، مولوی عبدالحق اور مصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ قیمت:۔ تین روپیہ آٹھ آنے

کیفِ خیال

ادیبؔ مالیگانوی

ازل کے روز پائی، وہ نگاہ پردہ دَریں نے / کہ ہر پردے میں دیکھا ہے تمہیں جلوہ گریں نے
ہنسا کر زندگی اپنی، لٹا کر گھر کا گھر میں نے / بہر صورت بنا ڈالا "وفا" کو مُعتبر میں نے
کیا اہلِ چمن کو اِس طرح شیر و شکر میں نے / خود اپنی راہ میں کانٹے بچھائے عمر بھر میں نے
ادھر اپنی قسم کا پاس انکو جورِ پیہم سے / مذاق ضبطِ غم سے شرط باندھی ہے ادھر میں نے
مری پَرواز اول ہی، قفس میں مجکو لے آئی / اسی دن کے لئے پائے تھے شاید بال و پر میں نے
وہ اپنے حُسن کی رعنائیوں سے خود نہ تھے واقف / مجھے آنکھیں ملی ان سے نہیں دی ہے نظر میں نے
نظر آتا رہا ہر شام اک بے نُور سنّاٹا / تمناؤں کی اک محفل سجائی، ہر سحر میں نے
تم آؤ، اور خاموشی ہی خاموشی میں سن جاؤ / کیا ہے ماجرائے دل کو اتنا مختصر میں نے
یہ چند آنسو، فقط آنسو نہیں، "نذرِ محبت" ہیں / ترے قدموں میں لاکر رکھدئیے شمس و قمر میں نے
ہزاروں زخم، میری سادگی نے کھائے ہیں دِل پہ / بڑی مدت میں پہچانی ہے دنیا کی نظر میں نے
فرشتے کانپتے ہیں نام سے سوزِ محبت کے / اِسی "آتشکدے" میں زندگی کی ہے بسر میں نے

ادیبؔ، آدابِ گلشن، اہلِ گلشن کو سکھانا تھا
دئیے شبنم کو آنسو، پھول کو خونِ جگر میں نے

محمد امین شرقپوری

آسیب

بیگاں کی ادھر سنگنی ہوئی اُدھر شادی ہو گئی رخصتی کے دو ہی مہینے بعد وہ اُجڑ کر میکے بھی آ گئی اور یہ سب اس طرح ہوا جیسے کوئی بدلی اُٹھی، بڑھی اور چھا گئی گھڑی دو گھڑی برسنے کے بعد پھر وہی دھوپ، اسے اُجاڑنے میں اس کی ماں کا بہت کچھ ہاتھ تھا اور رحمت کی ماں کا بھی، جہاں وہ بیٹے کو بہو کے پاس دیکھ لیتی، پاس پڑوس سے کہتی کہ بیگاں نے میرے بیٹے پر جادو کر دیا ہے، مجھے یہ علم ہوتا تو پہلے ہی روز اس رشتہ سے انکار کر دیتی؛

عورتیں بولیں "چاچی تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اتنی اچھی بہو لے آئی ہو، صورت شکل کے ساتھ مزاج کی بھی اچھی ہے۔"

ماں کو جیسے بیٹے کے سر پر آسیب نظر آ رہا تھا بولی "اچھی صورت شکل کی نہ ہوتی تو رحمت کو کیسے مٹھی میں لیتی، دیکھتی نہیں ہو میرا بیٹا اب وہ پہلا سا نہیں رہا۔"

"چاچی تم تو یوں ہی کہہ رہی ہو" ایک بولی۔ "ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا، پگڑی باندھنی تو اب بھی اُسے نہیں آتی، جب دیکھو گلے میں پڑی ہوتی ہے، بیوی کے ہاتھ کے دُھلے ہوئے کپڑے ضرور پہننے لگا ہے۔"

اس کی ماں مسکرا کر بولی "میں کیا میلے پہناتی تھی۔"

دوسری ہنس کر بولی "جو مزہ بیوی کے ہاتھ سے ہے وہ ماں کے ہاتھ سے کہاں۔"

اُس کی ماں بولی "یہ میں کب کہتی ہوں، میرا بھی حق ہے، کل بیگاں زینت کے گھر چلی گئی، دوپہر کو روٹی کھانے آیا، میں نے کہا لاؤں کھانا، بولا کھا لونگا، ابھی کیا جلدی ہے، جب تک وہ نہیں آئی بھوکا رہا۔"

عورتیں ہنس پڑیں۔

بیگاں مسکرا کر رحمت سے بولی "میں نہیں آتی تو کیا بھوکے ہی رہتے۔"

رحمت ہنس کر بولا "تمہارے بغیر روٹی مزہ نہیں دیتی۔" نوالہ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔ "لو کھاؤ۔"

وہ شرما کر بولی "چاچی نے دیکھ لیا تو خیر نہیں۔"

بڑھیا نے چونک کر دیکھا "ہائے کیسی بے شرمی کی بات ہے، میاں اپنے ہاتھ سے بہو کو کھلا رہا ہے، کبھی یہ باتیں بھی ہوئی تھیں، ہمارا تمہارا کیا بیاہ نہیں ہوا تھا، ساس سسر کے سامنے کیا مجال جو آنکھ بھر کر بھی ایک دوسرے کو دیکھا ہو، مہینوں چہرے سے گھونگھٹ نہیں اُٹھتا تھا۔"

عورتیں پھر ایک بار ہنس پڑیں، اور رحمت ہنستے ہوئے بولا "بیگاں میرا تو جی چاہتا ہے کہ تمہارے ہی پاس بیٹھا رہوں۔"

بیگاں جھکی جھکی نظروں سے بولی "چاچی زندہ نہیں چھوڑے گی۔"

وہ بولا "اس کا تو سر پھر گیا ہے"

بیگاں کلائیوں میں چوڑیاں بجا کر بولی "پھر بھی کچھ تو خیال چاہیئے نا"

رحمت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی خوبصورت کلائیوں کو دیکھ رہا تھا، کہنیوں تک کھلی ہوئی کلائیوں کو، جن میں لال لال چوڑیاں جھنجھنا رہی تھیں، اسکے دل پر محبت کی میٹھی چوٹیں لگا رہی تھیں۔

چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولا "مجھ سے یہ چوڑیاں اچھی ہیں ہر وقت تمہارے پاس تو رہتی ہیں"

"رحمت" ماں چلا کر بولی، بیگاں نے ہاتھ کھینچ لیا،

"کچھ کام کاج کی بھی فکر ہے تجھے، بڈھا اکیلا مر رہا ہے کھیت پر"

رحمت چونک کر بولا "جاتا ہوں"

"یہ چھوڑے تو جائیے" ماں کہہ رہی تھی "ماں اسے کیوں کوستی ہو، میں چلا جاتا ہوں" باہر نکل کر بولا "ماں کو ہمارا ایک ساتھ بیٹھنا برا کیوں لگتا ہے"

سوچتے ہوئے جا رہا تھا "جب اس کے پاس ہوتا ہوں کتنی خوشی ہوتی ہے مجھے، اس کا ہنستا ہوا چہرہ کاجل بھری آنکھیں، لال لال ہونٹ، بات کرتی ہے تو پھول جھڑتے ہیں، اس کی باتوں میں کتنی مٹھاس ہے، کتنا رس ہے"

اسے خیال آیا کہ چراغ کی طرح وہ بھی بیوی کو لیکر ماں سے علیحدہ ہو جائے، احاطے میں مکان بھی خالی پڑا ہے، بولا "بیگاں ایسے مکان میں رہنے کی چیز نہیں اسکے رہنے کے لئے تو کوٹھی چاہیئے"

ایک مرتبہ وہ نہر کے صاحب کی کوٹھی پر گیا تھا، کوٹھی میں ہر طرف پھول کھل رہے تھے، صاحب کی میم کس قدر خوش نظر آ رہی تھی، موم کی گڑیا سی، صاحب بھی بات بات پر مسکرا رہا تھا، بولا عورت چیز ہی ایسی ہے، مسکرا کر دیکھنے کی، پاس بٹھلائے رکھنے کی۔

"بیگاں" وہ بولا۔

"کیا ہے؟" بیگاں مسکرا کر بولی۔

"ماں سے الگ کیوں نہ ہو جائیں روز کا جھگڑا جاتا رہے گا"

بیگاں بڑی بوڑھیوں کی طرح سنجیدگی سے بولی "کہتے تو ٹھیک ہو پر چاچی کو بہت تکلیف ہوگی۔"

رحمت سوچ میں پڑ گیا ماں کے بوڑھے ہاتھ پیر سامنے آ گئے،

"ماں اتنا کام کیوں کرتی ہو؟"

"کام سے بھی کوئی تھکتا ہے بیٹا!"

بیگاں سے بولا "تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیا کرو ماں کا وہ بوڑھی ہے"

بیگاں بولی "جو ہو چاہے کر دیتی ہوں، وہ کام کو مجھے ہاتھ ہی کہاں لگانے دیتی ہے۔ کل صندوق سے کپڑے نکال رہی تھی میں نے کہا لاؤ میں کئے دیتی ہوں۔ بولی تم چپ بیٹھی رہو، میں کیا صندوق میں سے کچھ نکال لیتی"

رحمت مسکرا کر بولا "پھر بھی ماں کو بہت آرام ہے، یوں بھی جو بے فکری اکٹھے مل کر رہنے میں ہے وہ الگ رہنے میں نہیں"

بیگاں بولی "ہاں ٹھیک بھی ہے اور نہیں بھی چاچی کی باتوں سے میرے تو کان پک گئے ہیں، الگ رہنے میں یہ بات تو نہ ہوگی" رحمت نے بیگاں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا،

ماں کو دیکھ کر بیگاں کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے

ماں سمجھی بیٹی سسرال میں تکلیف میں ہے، اس کی ساس سے بولی "بہن بیگاں کا پہلا سا رنگ روپ نہیں رہا بیمار ہے کیا؟"

"نہیں تو،" رحمت کی ماں بولی۔

"ہے کیوں نہیں، لڑکی آدھی بھی نہیں رہی!" آہ بھر کر بولی "سچ ہے اپنے پرائے میں فرق ہوتا ہے۔"

رحمت کی ماں تنک کر بولی "تو کیا میں پرائی ہوں، بیٹی کی طرح رکھتی ہوں، بھلائی کا وقت نہیں رہا۔"

بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی، بیگاں کی ماں بیگاں کا ہاتھ تھام کر بولی "میں اسے ساتھ لے جاتی ہوں۔"

رحمت بولا "ابھی اسے آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔"

وہ بگڑ کر بولی "اس گھر میں نہیں بھیجونگی اسے۔"

رحمت کی ماں غصہ سے بولی "خوشامد کسے ہے، ایک بار نہیں دس بار لے جا۔ میں بیٹے کا دوسرا بیاہ کرلونگی۔"

رحمت نے بہتیرے ہاتھ پاؤں جوڑے، بیگاں کی ماں نے ایک نہ سُنی۔

ماں سے بولا "یہ تم نے کیا کیا ماں!"

ماں بولی "حوصلہ رکھ اور آجائیگی۔"

"نہیں ماں" وہ رکتے ہوئے بولا۔ چاہتا تھا کہ دوڑ کر بیگاں کو روک لے۔

"تمہارے بغیر میرے دن کیسے کٹیں گے۔"

ماں کے خوف سے اس کے پاؤں اُٹھتے تھے، بیگاں کی آمد سے اس کے من کے سونے کھیتوں میں جو ہریالی آگئی تھی، آج یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اُس پر اولے پڑ گئے ہیں، بجلی گر پڑی ہو، بہت دیر دروازے کو ٹکٹکی باندھے کھڑا دیکھتا رہا۔

اُسے خاموش پاکر ماں بولی "کیا ہوا تجھے!"

"کچھ نہیں ماں" گھٹی گھٹی آواز سے بولا۔

"بیٹا تجھے ہو کیا گیا ہے، بات کیوں نہیں کرتے۔"

صبح و شام ماں کے الفاظ اُس کے کان میں پڑنے لگے:

"میرا بیٹا مجھ سے بات نہیں کرتا۔"

"میں نہ کہتی تھی کہ بیگاں نے جادو کر دیا ہے۔"

بڑھیا اڑوس پڑوس میں کہتی پھرتی تھی۔

ماں بیٹے کے گلے میں تعویذ باندھ کر بولی "یہ پیر جی سے لائی ہوں، دیکھوں اب کیسے جادو چلتا ہے چڑیل کا۔"

رحمت کا بدن بخار سے جل رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھے منڈیر کو دیکھ رہا تھا جہاں ایک کبوتر بے چینی سے چل پھر رہا تھا۔

"بولو بیٹا" ماں محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں ماں" وہ چونک کر بولا۔

"اچھا ہو جائے گا تو بڑے پیر جی کی نیاز دونگی" بولی۔

وہ گلے سے تعویذ کھینچ کر بولا "یہ تم اپنے گلے میں ڈالو ماں۔"

ماں مسکرا کر بولی "ماندہ تو ہے یا میں۔"

تعویذ اس کے گلے میں ڈال کر بولی "پاگل نہ بن، پیر جی کا کہنا ہے کہ اس سے ہر طرح کی مصیبت ٹل جاتی ہے، سچ پوچھو تو سوا روپیہ کچھ دام بھی تو نہیں میرے پاس ایک ہی تو لال ہے کئی روپئے وار کر پھینک دونگی۔"

رحمت بدستور منڈیر کو دیکھ رہا تھا۔

اور بیگاں؟ آنگن کے پیڑ پہ کائیں کائیں کرتے ہوئے کوے کو اڑا بولی "کان کیوں کھا رہا ہے پورے تیس دن ہو گئے ہیں آج تک تو کوئی آیا نہیں

وہاں سے پینے "
پھر آپ ہی آپ اُس کی آنکھوں میں آنسو
اُمنڈ آئے ماں کی آہٹ پاکر دوپٹے سے آنسو
پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

احمد ندیم قاسمی

سُہاگن بیوہ کی فریاد

(نارضامندی کی شادی پر)

نہ بزرگ باپ سے کچھ گلہ، نہ غریب ماں سے ملال ہے
نہ کسی کے رحم کی آرزو، نہ دراز دستِ سوال ہے
میری زندگی کے نصیب میں جو خزاں ہی تھی، تو خزاں سہی
مجھے آہ و نالہ سے کام ہے، جو یہاں نہیں، تو وہاں سہی
جو فلک پہ بیٹھے ہوئے خدا کی یہی رضا ہے، تو شکر ہے
جو عدالتِ مہ و سال کا یہی فیصلہ ہے، تو شکر ہے
مجھے اعتراف ہے جرم کا، کہ میں اِک حقیر سی جان ہوں
مجھے اِس قصور کا پاس ہے، کہ میں خانداں کا مان ہوں
مگر اِک عجیب کریدسی میرے دل میں رہتی ہے پر نشاں
کہ مرا مقدرِ غم نشاں مجھے لے چلیگا کہاں کہاں
میرے لالہ زارِ شباب میں ابھی اور آندھیاں آئیں گی
میرے آسمانِ خیال پر ابھی اور بدلیاں چھائیں گی
میرے مرغزارِ حیات پر کئی بجلیوں کی نگاہ ہے۔
میرا احتجاج بھی کفر ہے، میرا بولنا بھی گناہ ہے
مجھے اپنے حال پہ چھوڑ دو، میری غم نصیب سہیلیو
مجھے زیوروں سے بچھاڑ کر نہ کرو ہو غریب سہیلیو
میں وہ جنس ہوں جسے اِک امیر نے زر لٹا کے اٹھا لیا
میری زندگی کو خرید کر میری آرزو کو چبا لیا
یہ رواج، جس کی تباہیاں کئی بستیوں کو جلا گئیں
مجھے پلّے باندھ کے اجنبی کے، ابھی سے بیوہ بنا گئیں

حضرت ثاقب کانپوری

حشرِ جذبات

مری دل پہ حیرت ہی کچھ ایسی طاری
نہ اب بیخودی ہی نہ ہی ہوشیاری

نہ زنداں میں جب آئی بادِ بہاری
تو دامن پہ کی میں نے خود لالہ کاری

محبت میں میرے لئے کم نہیں یہ
کہ ممتاز ٹھہری مری جاں نثاری

جہاں کا ہر اک ذرہ ہی اجنبی سا
کہاں لائی مجھکو غریب الدیاری

توجہ ہوئی میری جانب نہ اُنکی
مرے کام آئی نہ اُمیدواری

محبت کی تکمیل ممکن نہیں ہے
لہو ہو نہ جب تک کہ آنکھوں سے جاری

مری داغ دِل کر گئی اور تازہ
قفس میں جو آئی بھی بادِ بہاری

مجھے رحم آتا ہی اے شیخ تجھ پر
یہ اَبرِ سیہ اور پرہیزگاری

کہیں کر نہ دی مجھکو برباد اک دن
یہ راتوں کو چھپ کر مری اشکباری

ذرا ضبط سی بھی تو لے کام ثاقب
محبت کی توہین ہے بیقراری

پروفیسر
سید احتشام حسین

قدیم اَدب اور ترقی پسند نقّاد

ترقی پسند ادب کا ذکر لوگوں کی زبانوں پر کئی حیثیتوں سے آنے لگا ہے۔ ہمدردی اور مخالفت کے اس طوفان میں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لوگ تو ہمدردی رکھنے کے باوجود "نادان دوست" سے زیادہ کہے جانے کے مستحق نہیں اور کچھ مخالفت کرنے والے مختلف جذبات کا شکار ہیں، اگر انھیں نئے ادب کا مفہوم پوری طرح سمجھا دیا جائے تو اُن کی مخالفت کم ہو جائے گی۔ "نادان دوست" جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں اس لئے وہ سماج اور اَدب، تاریخ اور زندگی کی صحیح رفتار کا اندازہ کئے بغیر بس نئے ادیب ہیں اور نئے ادب کو تاریخی حقیقت نہیں بلکہ ایک جدّت سمجھ کر اُس کی طرف جھکتے ہیں، ایسے لوگ ادب کی تشریح اور تفسیر میں، اس کی تحلیل اور تعبیر میں غلطیاں کر جاتے ہیں کیونکہ حقیقتیں لازمی طور پر جذبات سے ہم آہنگ نہیں ہوا کرتیں۔ ایسے دوستوں کو صرف یہ صلاح دی جاتی ہے کہ وہ اَدب کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے حصولِ علم کی کوشش کریں۔ جذبات کو عقل کے زیر اثر لائیں اور نظر میں زیادہ وسعت، زیادہ گہرائی، زیادہ باریکی پیدا کریں تاکہ اُن کی ہمدردی صرف جذباتی نہ رہے بلکہ اس کی بنیاد اُس ٹھوس چٹان پر ہو جہاں واقعیت اور خیالات میں زیادہ بُعد نہیں رہتا، جہاں خواہشات کی تخیلی کامیابی کا نام کامرانی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں سے ہم میکسم گورکی زبان میں یہ کہیں گے کہ "ہمیں بُری اور بھدّی چیزوں پر زور دے کر اپنے دشمنوں کو ہنسنے کا موقعہ نہیں دینا چاہیئے۔"

گورکی نے یہ بات خاص طور پر ان نقادوں سے کہی ہے جو اَدب کی غرض وغایت سے واقف ہوئے بغیر اُس کے بارے میں خالص جذباتی تصورات سے کام لے کر رائے دیدیتے ہیں۔

ترقی پسند اَدب سے مخالفت کرنے والوں کو کئی گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ ظاہری طور پر اپنی مخالفت کے مختلف وجوہ بتاتے ہیں کہیں اُس کے پردے میں ایک ہی گہری اور بڑی حقیقت ہوتی ہے لیکن چونکہ مخالفین عام طور سے اُس حقیقت سے واقف نہیں ہوتے یا اُس کا اِظہار نہیں کرنا چاہتے اِس لئے طرح طرح کے اعتراضات کرتے ہیں۔ اُن کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے صرف چند قسم کے لوگوں کے تذکرہ سے بھی کام چل سکتا ہے بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ ترقی پسند اَدب کے راستہ سے دہریت، لامذہبیت، اِنقلاب، اشتراکیت اور نہ جانے کیا کیا چیزیں لائی جا رہی ہیں اس لئے یہ اَدب کسی طرح اچھا ادب نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کے اپنے طبقاتی مفاد ہیں جن کو یہ شکل دی جا رہی ہے وہ دنیا کی آج تک کی تبدیلیوں کو تاریخی حقیقت مانتے ہیں، اُس سے اِنکار کی جرأت نہیں کرتے۔ وہ اقبال کے اس مصرع کو ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

سن کر وجد کرتے ہیں لیکن جب عہد جدید اپنے کرب و اضطراب کا علاج تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے، جب اپنی تضادی کیفیت دُور کرنا چاہتا ہے تو وہی لوگ جو ان چیزوں کا سبب بنے ہوئے ہیں، لگتے ہیں اخلاق مذہب، تخریب اور اشتراکیت کا شور مچانے حقیقت یہ ہے کہ تبدیلیاں کبھی آسانی سے نہیں ہوا کرتیں، انقلاب کے آگے اور پیچھے کچھ ناگزیر حالات کا لشکر ہوتا ہے جو تخریب اور تعمیر کی تمام منزلیں طے کرتا ہے، بگاڑتا ہے اور سنوارتا ہے۔ جن ہاتھوں سے طاقت جاتی ہے، جن کے مفاد کو دھکا لگتا ہے وہ ناراض ہوتے ہیں اور تبدیلیوں کو بُرا بھلا کہتے ہیں ایسے لوگوں سے ہمیں زیادہ نہیں کہنا ہے ان کا جواب تاریخ کی رفتار دے گی لیکن نئے ادب پر اعتراض کرنے والوں میں کچھ دوسرے قسم کے لوگ بھی ہیں جو احساس کمتری کا شکار ہیں اور زمانہ کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ دینے کی اہلیت اپنے اندر نہیں پاتے تو ایک نفسیاتی بہانہ تلاش کرکے اپنے اس احساس کو ترقی پسندی کے خلاف صرف کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی حقیقت ہی کچھ نہیں سمجھتے۔ اس پر پروپیگنڈے کا الزام لگاتے ہیں، اُسے افادی کہہ کر اس کی اہمیت کو گھٹا دینا چاہتے ہیں، اُسے بدصورت اور بدہیئت بنا کر دوسرے زمانے کی ادبی تحریروں کی خالص صناعی سے اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، پھر فطرت انسانی تحلیل نفسی کے دریافت کئے ہوئے اثرات قبول کرکے شعوری یا غیرشعوری طور پر جتنی صورتیں اُس کے کمتر ثابت کرنے کی نکال سکتی ہے وہ سب بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ ایسے لوگوں سے بھی کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ احساس شعوری ہے اور اختلافی مقصد کی حیثیت اختیار کر چکا ہے تو ان سے اس مرض کا دُور کرنا آسان نہیں ہے اور اگر غیرشعوری ہے تو البتہ یہ ممکن ہے کہ اس احساس کی غلطی کا شعور وسعت مطالعہ اور صحیح نقطۂ نظر کی تلقین اُنھیں ٹھیک راہ پر لگا دے کیونکہ "گرم تماشا" ہونے کے بعد اُس کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ "چشم تنگ" "کثرت نظارہ سے وا" ہو جائے۔

کچھ ایسے لوگ بھی ملیں گے جو ترقی پسند ادب پر لاعلمی کی وجہ سے اعتراض کرتے ہیں، اس وقت وہی لوگ ہمارے پیش نظر ہیں، اُن کے دل سے شکوک نکالنے، اُنھیں ٹھیک بات بتانے کی ذمہ داری ترقی پسند نقادوں پر عائد ہوتی ہے اِس لئے اس مضمون میں اِسی بات کے ایک رُخ کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ عام طور سے ہمارے کانوں میں یہ آواز پڑتی رہتی ہے کہ ترقی پسند ادیب تخریب کا حامی ہے یہاں تک کہ وہ پُرانے ادب کے بیش بہا سرمایہ کا ڈھیر لگا کر اُس میں آگ لگا دینا چاہتا ہے۔ اُس نے قدیم اُدبیات کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اُس کے اندر موجود نہ ہو، آج صرف بدہیئتی، برائی، اِفلاس، انقلاب، مزدور اور ایسی بہت سی چیزوں کا نام لیا جاتا ہے اگرچہ ان میں کی بہت سی چیزیں پرانے ادب میں بہ کثرت مل سکتی ہیں۔ ترقی پسند ادیب یا نقاد نے اِن چیزوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ وہ اپنے آج کے ادب کو دفن کرکے اسی قدیم ادب کی جلوہ آرائیوں میں کھو جائے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ترقی پسند نقاد کے سامنے کوئی صحیح معیار نقد نہیں بس جن کتابوں میں اُوپر ذکر کی ہوئی چیزوں کا نام آجاتا ہے اُنھیں وہ اچھی کتاب کہتا ہے اور جن میں نہیں آتا انہیں بُری کہہ کر ٹال دیتا ہے، اس کا معیار بہت پست ہے وہ ذوق سلیم کے نام سے واقف نہیں ہے وہ ایسی بھونڈی اور بھدّی چیزوں کو بھی پسند کرتا ہے جنھیں کوئی "شریف" انسان پسند نہیں کر سکتا۔

کم و بیش یہ خلاصہ ہے ان اعتراضات کا جو اکثر

لاعلمی کی وجہ سے ترقی پسند نقاد پر کئے جاتے ہیں ان سب کا جواب دینا تو ایک مضمون میں ناممکن ہے لیکن اس وقت ایک چیز کا واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ترقی پسند نقاد قدیم ادب کے سرمایہ کو ہرگز آگ لگا کر ختم نہیں کر دینا چاہتا کیونکہ اس سے زیادہ کوئی اس کا قائل نہیں ہے کہ ایک تہذیب و تمدن کا دَور اپنے گذشتہ تہذیب و تمدن کے دَور سے مدد لے کر آگے بڑھتا ہے چاہے وہ مدد اثبات میں لے یا نفی میں انسانی خیال آرائیوں کو اِنسانی افعال و اعمال سے متعلق ماننے والے کیونکر ماضی کی تاریخی اہمیّت سے اِنکار کر سکتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ترقی اور تنزل کا عمل سماج میں برابر جاری ہے اور وہی سماجی اور فنی قدروں کی تشکیل کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایسے جملے کبھی کبھی اَدبی دہشت پسندوں کی زبان سے نکل گئے ہوں لیکن پڑھے لکھے ترقی پسند نقاد (اور یہ بات کسی قدر پُرزور طریقہ پر کہی جا سکتی ہے کہ ترقی پسندوں نے چاہے اور کچھ نہ کیا ہو لیکن اُنھوں نے پڑھنے لکھنے میں کمی نہیں کی ہے) اس قسم کی باتیں اپنی زبان اور قلم سے نہیں نکالتے۔ یہ خیال صرف اِس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ترقی پسند نقاد کا معیارِ نقد بالکل دوسرے تصورات سے بنتا ہے جس میں اچھے، بُرے، عمدہ، نفیس، خراب اور اس قسم کے سطحی لفظوں سے نقد نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے جانچنے، پرکھنے، اور دیکھنے کے آلے بالکل جُدا گانہ ہوتے ہیں، وہ عام طور سے کتاب کی اچھائی یا بُرائی پر صرف اندازِ بیان یا طرزِ تحریر کو دیکھ کر رائے نہیں دیتا بلکہ کتاب کے سمجھنے، اس کے مفاہیم کا تجزیہ کرنے، اس کے اندرونی رجحانات کو واضح کرنے اور اُسے انسانی زندگی کے افعال و کردار سے مطابق کر کے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ اس کے سامنے یہ تصویر نہیں ہے کہ اَدیب کوئی مافوق الفطرت شخصیت رکھتا ہے یا اس کی تحریر میں الہام کی شان ہوتی ہے

اِس لئے فوراً یہ سوچنے لگتا ہے کہ وہ کتاب جو اپنے عہد کی یا جس عہد کا تذکرہ کرتی ہے اس عہد کی پوری ترجمانی نہیں کرتی اُس نے اپنا وہ کام ہی پُورا نہ کیا جس کی اُمید اس سے کی جاتی تھی۔ یہ بات کسی قدر تفصیل چاہتی ہے کہ کسی عہد کی ترجمانی یا زندگی سے تعلق رکھنے کا مقصد کیا ہے؟

مولانا حالی تک کو اس بات کا احساس تھا کہ خیال بغیر مادّہ کے پیدا نہیں ہوتا پھر اگر ہم مولانا کے اِس جملہ کو اپنے سامنے رکھیں تو ہماری بہت سی مشکلیں حل ہو جائینگی۔ کوئی تخیُل، کوئی نظم، کوئی کتاب خلاء سے نہیں پیدا ہو سکتی، ہماری مادّی کشمکش، ہمارے خیالات اور تجربات بناتی اور بدلتی ہے؛ اِنسانوں نے عہدِ اوّلین سے آج تک ہزار ہا طریقوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے اس میں اُنھیں تمدن کے بہت سے مدارج سے گزرنا پڑتا ہے وقت کے ساتھ ساتھ ان مدارج میں تغیرات بھی ہوتے رہے ہیں، ایک طرح کی ہیئتِ اِجتماعی نے ایک بالکل دوسری طرح کی ہیئت اِجتماعی کو جنم دیا ہے، دبے ہوئے لوگ اُٹھنا چاہتے ہیں دبانے والے اُٹھنے نہیں دیتے، گھاتیں ہوتی ہیں، طرح طرح کے حربے اِستعمال کئے جاتے ہیں، سماج، قانون، مذہب، سب مِل جُل کر زندگی میں پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں اور نہ صرف افراد کی زندگی میں بلکہ قوم اور ملک کی حیات میں بہت سے مُرکبات پیدا ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ انسان کے افعال اور کردار اور پھر ان افعال سے پیدا ہونے والے خیالات اپنے اندر بہت سی باتیں رکھیں گے جو خود کتاب لکھنے والے کے یہاں کبھی تو جان بوجھ کر پیدا ہوئیں اور کبھی بے جانے بُوجھے داخل ہو گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ پیچیدگیاں چند لفظی خوبیوں کے سمجھ لینے یا رسمی طور پر ایک مطلب نِکال لینے سے حل نہیں ہو سکتی بلکہ اُن کی تہوں تک

جانے کی ضرورت ہوگی اُس وقت گویا ہم پوری طرح اَدب کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔ ترقی پسند نقاد قدیم اَدب کی اہمیت سے کسی وقت بھی اِنکار نہیں کرتا وہ اسے پڑھتا ہے، اُس سے لُطف حاصل کرتا ہے لیکن اُسے تفریح کا آلۂ کار سمجھ کر چھوڑ نہیں دیتا، وہ اِنسانوں کی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کرنے کی اُس جد وجہد کے نقوش اُن اَوراق میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے لیئے اِنسانیت ہمیشہ سے بےچین ہے۔ عام انسانوں کے خیالات اور جذبات اَدیب اور فن کار کے یہاں پہونچکر گہرائی، تاثر اور لطافت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں قوموں اور ملکوں کی حیات اجتماعی اَدب اور آرٹ میں زندہ ہوتی ہے ایسی صورت میں ایک نقاد کیونکر صرف لفظی یا لسانی خصوصیات ہی کو اپنی تنقید کا مرکز بنا کر مطمئن ہو سکتا ہے۔ وہ اس ملک کی تاریخ جاننا چاہتا ہے، وہ فرد اور جماعت کے رشتہ کو سمجھنا چاہتا ہے، وہ مصنف کے نقطۂ نظر کو جاننا چاہتا ہے وہ اُس زمانہ کے مُروج فلسفۂ حیات اور مختلف نظریات کی چھان بین کر کے یہ معلوم کرنے کا متمنّی ہوتا ہے کہ مصنف کا تعلق کس گروہ سے تھا، ان باتوں کے علاوہ وہ اُن مُرکبات کو حل کرنا چاہتا ہے جنھوں نے جنسی یا دوسری سماجی بیماری کی وجہ سے، اخلاق اور مذہب سے خوفزدہ ہو کر، علامات اور اشارات کی شکل اِختیار کر لی۔

ان چند تشریحی کلمات کے بعد بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند اَدیب اور نقاد کا مطمح نظر کیا ہے، وہ کس قدر دوسرے نقادوں سے مختلف ہے! اس کے سامنے یہ نہیں ہے کہ کتاب کی اچھائی اور بُرائی بیان کرے۔ بلکہ وہ تو یہ دکھانا چاہتا ہے کہ کتاب سماج کی کن اچھائیوں اور برائیوں کا آئینہ دار ہے، اس میں زندگی کے کن حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور کتنی گہری نظر سے۔ جب ترقی پسند نقاد کتاب کا تجزیہ اِس طرح کرتا ہے، جب وہ ان باتوں کو بھی کھول کر لکھ دیتا ہے جنھیں لوگ سُننا گوارا نہیں کرتے تو غصّہ کا اِظہار کیا جاتا ہے حالانکہ نقاد نے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیا ہے کہ اُس نے سماج کی اُن بیماریوں کی تشخیص کر دی ہے جن کا شکار یا تو مصنّف تھا یا پورا سماج، یا مصنف ان بیماریوں سے بچ سکا ہے اور دوسروں کو بچنے کی راہ بتا سکا ہے یا خود بھی اُس میں پھنس کر رہ گیا ہے جب کوئی کتاب اِس طرح دیکھی جائے گی تو یقیناً اُس میں سچائی اور مطلق حقیقتوں کے معیار بدلے ہوئے ملیں گے۔ ترقی پسند نقاد اس کا قائل ہے کہ خود ہمارا ذوق سلیم ہمارے تعلقات سے بنتا ہے اِس لیئے ہمیں اُن تعلقات کو بھی بھولنا نہ چاہیئے ہم سماج کے جس نظام سے کسی نہ کسی طرح تعلق رکھتے ہیں چوری چھپے اس کے طرفدار ضرور بن جاتے ہیں اِس لیئے اگر ہم کسی بیماری سے ہمدردی رکھتے ہیں تو یقیناً ہمارے اندر خود بھی بیماری موجود ہے اور شاید ہم اس طرح بیمار رہنا بُرا نہیں سمجھتے حقیقتیں بدلتی رہی ہیں اور بدلتی رہیں گی؛ حقیقتیں کسی ایک زمانہ میں بھی یکساں نہیں رہی ہیں، ایک کی آزادی دوسرے کے لیئے غلامی رہی ہے، ایک کے آرام نے دوسرے کو تکلیف پہونچائی ہے، ایک کے لیئے جو حسین ہے وہ دوسرے کے لیئے بدصورت، ایک جسے عشق کہتا ہے دوسرا اُسے بُوالہوسی کا نام دے کر ختم کر دینا چاہتا ہے، ایسا مختلف دوروں میں نہیں بلکہ ایک ہی زمانہ میں ہوا کرتا ہے۔ پھر حقیقت مطلق ہے کیا جو کبھی نہیں بدلتی؟ حقیقتیں جب اپنے اصل رشتہ میں دیکھی جاتی ہیں تو اُن سے نئے نئے مطلب پیدا ہوتے ہیں اور بہت سی پیچیدگیوں کے بھید کھلتے ہیں ترقی پسند نقاد اسی رشتہ کو سمجھنا چاہتا ہے اور اس سمجھنے کی کوشش میں وہ صرف مصنّف کے کہنے ہی پر اِعتبار نہیں کر لیتا بلکہ دوسرے شواہد سے بھی کام لینا

چاہتا ہے۔ یہ شواہد تحلیل نفسی اور دوسرے علوم کی مدد سے حاصل کئے جا سکتے ہیں، ان تمام اثرات کا پتہ مختلف ذرائع سے چلایا جا سکتا ہے۔ جس نے مصنف کے ادراک کو ترتیب دیا ہے۔

اب ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ترقی پسند نقاد کی جانچ پڑتال کا پیمانہ بہت بڑا ہوتا ہے اور وہ چند سطحی لفظوں کی مدد سے کتاب اور مصنف کے بارے میں رائے دینا پسند نہیں کرتا بلکہ پوری چھان بین اِس امر کی کرتا ہے کہ مصنف کی کاوش، زندگی کے دھارے میں کیا اہمیت رکھتی ہے پھر جب وہ قدیم اَدب پر نگاہ ڈالتا ہے اور تاریخ، جغرافیہ سیاستِ تمدن، عمرانیات اور تحلیل نفسی کی مدد سے اُسے جانچتا ہے تو ہمارے پُرانے نقادوں کو یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے کسی مقدس حصار میں اپنے قدم رکھ دیئے، ہم نے اَدب کے اِلہامی تصور کو ٹھیس لگا دی، ہم نے اَدب کو بھی مادّیت سے تعلق رکھنے والی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی ہے۔ اور گویا ایک طرف تو ہم نے اپنی بد ذوقی کا اِظہار کیا اور دوسری طرف مصنف اور تصنیف کی مٹی برباد کر دی۔

حقیقت یہ ہے کہ نقطۂ نظر کا یہ بنیادی فرق ہے جو ہمیں دو طرح سے سوچنے پر مجبور کرتا ہے ہم اَدب کی پُرانی کتابوں کو صرف تاریخی اہمیت ہی دے کر نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اُن کی اَدبی حیثیت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں لیکن خالص اَدبی حیثیت کوئی چیز نہیں جب تک کہ اس اَدب میں کوئی اور بات نہو۔ تفصیلاً میں جانے کا وقت نہیں ورنہ ہم دیکھتے کہ "اَدب برائے اَدب" اور "اَدب برائے زندگی" کا کیا مفہوم ہے؟ اَدب میں مقصد اور افادیت سے کیا مطلب ہے۔؟ پروپگنڈا کسے کہتے ہیں اور اَدب اور پروپگنڈے میں کیا رشتہ ہے؟ روایات کس طرح جڑ پکڑ لیتی ہیں اور اَدبی اِنقلاب کا کیا مفہوم ہے؟ اَدب میں علامات اور اِشارات کا کیا مقصد ہوتا ہے اور وہ کیوں داخل کئے جاتے ہیں؟ ادیب کا نقطۂ نظر کس طرح صورت اور معنی میں توازن قائم رکھنے اور کبھی کبھی مقصد کو چھپانے کی کوشش کے باوجود واضح ہو جاتا ہے؟ اِنسان کے افعال اور سماج کی پیچیدگیوں کا اثر مصنف کی تخیل پر کیا پڑتا ہے؟ اَدیب کی اِنفرادیت کس طرح اِجتماعی شعور سے بھی تعلق رکھتی ہے؟ یہ باتیں اِس موضوع سے الگ بھی ہیں۔ اِس مقالہ کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ ہم اِس غلط فہمی کا سدِ باب کریں کہ ہم قدیم اَدب کے دشمن ہیں ہم ہر اُس اَدب کے دُشمن ہیں جو انسانیت کو آگے بڑھنے اور پنپنے سے روکتا ہے چاہے وہ قدیم ہو یا جدید۔ کیا آج طبقاتی مفاد کے علمبردار ایسا اَدب نہیں پیش کر رہے ہیں جو ہمیں بھلاوے میں رکھے، جو حقیقتوں کو ہم سے چھپائے، جو ہمیں مذہب، اخلاق، قسمت اور تصوف کے راستوں پر ڈال کر اِس جد و جہد سے باز رکھے۔ جس میں شریک ہونا ہمارا فرض ہے۔ پھر جب یہ ایک حقیقت ہے تو ترقی پسند نقّاد کیونکر خاموشی سے صرف اَدب کے جمالیاتی اور صوری عنصر کی اہمیت کے اِظہار پر اپنا وقت ضائع کر سکتا ہے۔

اَدب کی جمالیاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ اُس کی سماجی اہمیت کو دیکھنا ضروری ہے کیونکہ اَدب زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے، کتاب کی اَدبی اہمیت کے دوش بدوش اس پہلو کو بھی دیکھنا ہے جس میں طبقاتی اور دوسرے رجحانات سانس لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، جس میں رجحانات جذبات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں جہاں شعوری یا غیر شعوری طور پر ادیبوں نے کسی سماجی نظام سے بغاوت یا ہمدردی کا اظہار کیا ہے نئے علوم کی روشنی میں قدیم اَدب کا جائزہ لینا اَدبی اور لفظی موشگافیوں سے آگے لے جا کر ہمیں انسانوں کی اُس بستی میں پہونچا دیتا ہے مصنف جس کا خود ایک

فرد تھا اور جس کی اچھائیوں اور برائیوں کو سمجھ کر اُس نے آنے والی نسلوں یا خود اپنے زمانے کے لوگوں کو زندگی کے سمجھنے کی دعوت دی۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ الزام کس قدر بے بنیاد ہے کہ ترقی پسند نقاد قدیم ادب کو مٹانا چاہتے ہیں یا اُس کی اہمیت سے انکار کرتے ہیں اگر وہ کسی تصنیف میں زندگی کے نقوش تلاش کرنا چاہتے ہیں تو یہ کوئی ناروا بات نہیں جس کے لئے انھیں مجرم ٹھہرایا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ مارکس اور لینن جیسے انقلاب پسندوں کی تحریروں کو پڑھکر وہ صرف ایک مخصوص قسم کے ادب کو اچھا سمجھتے ہیں اور باقی کو نظرانداز کر جاتے ہیں لیکن، ایسا کہنے والوں کو شائد یہ نہیں معلوم کہ خود مارکس اور لینن نے دُنیا کے مشہور ادیبوں اور شاعروں صناعوں اور فنکاروں سے دلچسپی لی اور کبھی یہ نہیں کہا کہ اُن کی کوئی اہمیت نہیں ہے، ہاں یہ ضرور کیا کہ جتنی اُن کی اہمیت ہونی چاہیئے تھی اتنی ہی اہمیت ان کو دی اور ان کی کمزوریوں کو بھی نمایاں کیا۔ لینن نے ایک دو جگہ نہیں نہ جانے کتنے مواقع پر اور کتنے طریقوں سے ماضی کی اہمیت پر زور دیا ہے پھر بھی اعتراض کرنے والے بغیر پڑھے لکھے یہ کہنے میں باک نہیں رکھتے کہ لینن کے اثر کے ماتحت ترقی پسند نقاد ماضی کو مٹا دینا چاہتے ہیں۔ ترقی پسند نقاد جمالیات، لفظی خوبیوں اور دوسری چیزوں کا احساس رکھتے ہیں اُس سے متاثر ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں بھولتے کہ خود ان کا احساس جمال مادّی رشتوں اور رابطوں سے اثر پذیر ہوتا رہا ہے۔

اس بحث کو اس قدر پھیلانے کی ضرورت نہ تھی لیکن شاید اس سے کم جگہ میں یہ بات واضح نہ ہو سکتی۔ اب اصولی بحث سے گزر کر صرف چند سطروں میں مثال کے طور پر یہ دیکھ لینا ہے کہ قدیم اُردو ادب کا جائزہ لیتے وقت ترقی پسند نقاد کے سامنے کون کون سی باتیں ہوتی ہیں

اُردو زبان کی پیدائش کا مسئلہ اُسے ہندوستانی اور ایرانی تمدن کی کشمکش کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ جہاں ایک طرف تو ہندوستانی تہذیب ایرانی اثرات کے بوجھ سے دَبی جا رہی تھی دوسری جانب ایرانی تہذیب نے پوری طرح ہندوستان میں پھلنے پھولنے کا موقع نہ پایا اس لئے ایک طرف فارسی کا انحطاط ہوا اور دوسری طرف ہندی کا، اور ان کے بطن سے ایک ہندوستانی زبان وجود پذیر ہو گئی۔ کیونکہ عوام کی ضرورت اسی کی متقاضی تھی۔ لیکن چونکہ بہت جلد اس کا معیار دربار اور قلعۂ معلّٰی کے اونچے معیار سے جانچا جانے لگا اس لئے اس کی فطری ترقی رُک گئی اور وہ اونچے لوگوں کے اظہار کا آلہ بن گئی دکن میں نئی بادشاہت قائم ہوئی تھی جو ایک طرف تو اپنے کو مضبوط بنانا چاہتی تھی دوسری جانب ان تمام اثرات سے بچنا چاہتی تھی جو اُسے دِلی میں دکھائی دیتے تھے تاکہ ایک خالص دکنی سلطنت کی بنیاد پڑ سکے اس لئے انھوں نے فارسی کو چھوڑ کر دکنی اُردو کو فروغ دیا، مسلمان صوفیوں بادشاہوں اور امیروں نے اسے عوام سے ہٹا کر طبقاتی زبان کی شکل دے دی اور اس کے ادب میں وہی جذبات، وہی خیالات آنے لگے۔ جنھیں درباروں اور خانقاہوں سے پسند کی سند مل سکتی تھی۔ ایسی حالت میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ادب کے اندر کون کون سی باتیں آئیں گی، اس کے حسن اور قبح کا معیار کیا ہوگا، اس کا رشتہ عام انسانی افراد سے کیا ہوگا، اس کے اندر کون کون سی خوبیاں اور برائیاں پیدا ہوں گی، کس طرح کا ادب ترقی کرے گا اور کس طرح کی باتیں آسانی سے جگہ بھی نہ پائیں گی۔ فنکاروں اور ادیبوں کی ذہنیت کیا ہو گی، شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ کس طبقہ کے ساتھی اور ہمدرد ہوں گے اور اگر کہیں پر وہ حساس ہونے کی وجہ سے بغاوت بھی کرنا چاہیں گے تو مطلق العنان

حکومتوں کے زمانہ میں یہ ممکن بھی ہو سکے گا یا نہیں، پھر اگر ممکن نہ ہوگا تو اُن جذبات کے نکلنے کی کیا سبیل ہوگی؟ کیا وہ علامات اور اشارات کی شکل اختیار کریں گے؟ اُردو ادب کا تعلق ویسے تو سارے ہندوستان سے رہا ہے لیکن اس پر زیادہ اثر مسلمانوں ہی کا ہے، مسلمانوں کے مذہبی، اخلاقی اور سیاسی خیالات کا اثر، مسلمانوں کی جنسی اور سماجی زندگی کا اثر، اُن کے بیرونی ممالک سے تعلقات کا اثر، سب ادب میں جگہ پائیں گے اور کبھی کھل کر، کبھی پوشیدہ طریقہ پر ادیبوں سے اظہار چاہیں گے شمالی ہندوستان میں ایک طرف تو اورنگ زیب کے بعد سے انحطاط شروع ہو رہا تھا دوسری جانب عوام کے بل بوتے پر اُردو زبان ہندوستان کی عام زبان بن جانے کی جد و جہد کر رہی تھی اگرچہ بہت حد تک اس کی ترقی درباروں کے حصار نے روک دی تھی۔ اِس کشمکش میں وہ ایک تاریخی فرض انجام دینے کی وجہ سے ترقی تو کر گئی لیکن یہ ضرور ہوا کہ اپنے ذخیرہ میں بہت وسعت نہ پیدا کر سکی، اِنحطاط کی تمام نشانیاں اس کے اندر پیدا ہو گئیں، فرار کی تمام کیفیتیں اس میں شعوری اور غیر شعوری طور پر داخل ہو گئیں، جذبات اور خیالات نے بھیس بدلے، حقیقتوں نے جب اپنے ظاہر ہونے کے سیدھا راستہ نہ پایا تو تشبیہ اور اِستعاروں کی شکل اِختیار کی، باہر سے آنیوالی طاقتوں کے مقابلہ میں ہندوستانیوں کو سپر انداختہ ہونا پڑا اس لئے شکست خوردہ ذہنیت نے غلط قسم کی تعلی، احساس کمتری کے مرکبات، تصوف اور خود ستائی پیدا کر کے اپنی خواہش پوری کی، ادب اور زبان کا تعلق عوام سے نہیں مرکزوں سے رہا، مرکز بدلتے رہے لیکن چونکہ ہندوستان کی عام ذہنیت میں غدر کے پہلے زنگ لگ رہا تھا اس لئے زبان کی تراش خراش تو کسی قدر ہوتی رہی مگر خیالات میں زندگی جد و جہد، ترقی اور اُبھار کے نشان کم دکھائی دیئے شکل بدل بدل کر ادب، طبقات کی طرفداری اور ترجمانی کرتا رہا اور اگر کبھی تصوّف اور اخلاق کے نام پر عام اِنسانوں کا خیال کیا بھی تو ساتھ ہی ساتھ قسمت اور تقدیر کا تذکرہ کر کے اپنے پہلے خیال کو صرف ایک زبانی تصور بنا کر چھوڑ دیا جو ناقابل عمل معلوم ہو۔

اُوپر جو کچھ لکھا گیا وہ بہت تشریح چاہتا ہے اَب تک تو کچھ نہیں ہوا ہے لیکن آئندہ اُمید ہے کہ اُردو ادب کا کوئی سمجھدار مؤرخ اِن حقیقتوں پر روشنی ڈالے گا وہ بتائے گا کہ ایسے سماجی نظام میں ادب کی کیا جگہ ہوتی ہے، اصنافِ سخن کیسے پیدا ہوتے ہیں، مثنوی، غزل، قصیدہ، مرثیہ، واسوخت، ہجو اور ریختی کن حالات میں ترقی کر سکتے ہیں اور کس طرح اُنھوں نے ایک خاص زمانہ میں ترقی کی، اب کیوں اُن کے لئے میدان تنگ ہے، طلسمات کی کتابوں نے ہمیں ایک وقت تک کیوں آسودہ رکھا اَب کیوں اُن میں وہ طاقت نہیں، تصوف سے اَب ہمیں کیوں تسکین نہیں ہوتی۔ جب آج کا نقاد ان چیزوں پر نظر ڈالے گا تو یقیناً اُسے بہت سی ایسی چیزوں کا تذکرہ کرنا پڑے گا جو لکھنے والا خود نہیں سمجھتا تھا لیکن زمانہ کے اجتماعی اثر، وقت کے مقتضاء اور حالات کے ناگزیر نشیب و فراز نے اُسے اُسی طرح لکھنے پر مجبور کیا تھا۔

ایک بات جسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ترقی پسند نقاد قدیم ادب کا دشمن نہیں ہے وہ اُسے اُس کے صحیح ماحول میں سمجھنا اور سمجھانا چاہتا ہے، وہ تاریخ کا بہت خیال رکھتا ہے اور وہ اُوپر لکھی ہوئی پیچیدہ باتوں سے نظر نہیں چراتا، اُس کا معیار نقد چیزوں کے پرکھنے اور دیکھنے کا طریقہ دوسرے نقادوں سے مختلف ہے اِسلئے اس کے سمجھنے کے پہلے اِن حقیقتوں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے جن کا تذکرہ ابھی کیا گیا۔ ترقی پسند نقاد

زمانہ کو منجمد، ساکن اور ٹھہرا ہوا نہیں مانتا زندگی کا ہر لمحہ گریز پا ہے، ہر لمحہ انقلاب انگیز ہے۔ اس لئے ادب کے جانچنے کا معیار بھی بدلے گا۔ اس کا خیال ہے کہ جب آج کا ادب بھی ماضی کا ادب بن جائیگا اس وقت مستقبل کا نقاد اقبال، جوش، گیتا سانے، ہیرا لال گودی والا، سمترا نندن پنت، ٹیگور، اور نذرالاسلام کو پڑھ کر بیسویں صدی کے ہندوستان، اس کے تمدن، اسکی بیچینیں، تبدیلیوں اور رجحانات کا پتہ لگائے گا اور بتائے گا کہ انھوں نے کہانتک ادب اور شاعری حیثیت سے زندگی سے آنکھیں چار کرنے کی جراءت کی تھی اور کہاں تک عام انسانی مفاد کو پیش نظر رکھ کر اپنے فرائض انجام دیتے تھے اسی سلسلے میں وہ یہ بھی دیکھے گا کہ جذبات میں یہ روانی، خیالات میں یہ وسعت، تفکر میں یہ گہرائی، زبان کے استعمال میں یہ تنوع، جمالیاتی احساس کا یہ نیا تصور ان کے یہاں کہاں سے آیا اور انھوں نے اسے کتنا کامیاب بنایا۔ یہ ہے ترقی پسند نقاد کا نقطۂ نظر!

دو نئی کتابیں

قصص و مسائل

از مولانا عبدالماجد دریابادی

قصے اور افسانے تو آپ نے بہت سے دیکھے ہونگے لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں افسانہ نہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا مقام حاصل ہے یہ قصے خود خدا نے اپنی کتاب میں بیان کئے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے جدید عصری تحقیقات کی روشنی میں ان قصص کو ضروری تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے، اور خوب بیان کیا ہے۔ آج سے ہزاروں سال پیشتر کی پوری تہذیب آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اس سے پہلے دنیا کی کسی زبان میں اس موضوع پر اتنی اہتمم بالشان کتاب شایع نہیں ہوئی ہے۔ قیمت:- ۱۲/ عہ

اِدارۂ اِشاعت اُردو۔ حیدرآباد (دکن)

اَندازے

اُردو کے کچھ مشہور شاعروں پر فراق گورکھپوری کے وہ سیر حاصل مقالے جن میں اُردو کا تنقیدی ادب نئی بلندیوں سے گزرتا ہوا نظر آئے گا۔ ہر شاعر کے کلام کے مُوثق اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی آواز کے لہراتے ہوئے آئینے میں شاعر کی تصویر دکھائی گئی ہے۔

کتاب پڑھتے ہوئے آپ قدم قدم پر چونک اُٹھیں گے۔ ہر جملہ ایک دریافت کی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول، افسانہ، ڈراما، شاعری، سب کا لطف فراق کی نثر میں لیجئے۔ اُردو نثر کی سحرکاریاں ہر سطر میں دیکھئے۔ پونے تین سو سے زیادہ صفحات کی خوشنما مجلد کتاب قیمت فی جلد تین روپئے۔ ملنے کا پتہ

ہندستانی پبلشنگ ہاؤس۔ یونیورسٹی روڈ (الہ آباد)

حضرت ضامن کنتوری

غزل

بھلا ہم عشق کو سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے
کیا برباد ہی آخر کو، ظالم سے خدا سمجھے

پڑیں پتھر سمجھ پر ہم تجھے سمجھے تو کیا سمجھے
وفا کی بُو نہ تھی جس میں اسی کو باوفا سمجھے

ڈبویا دل نے لے کر بحرِ عصیاں میں خطا یہ کی
کہ اس کو کشتیِ اعمال کا ہم ناخدا سمجھے

سمجھ لیتا اُسے چھوٹی سی چھوٹی عقل والا بھی
مگر افسوس تم اب تک نہ میرا مدعا سمجھے

چلو ہمراہ ہو لیں کاروانِ عمر کے ہم بھی
نفس کی آمد و شد ہی ہے آوازِ درا سمجھے

بہت کیں کوششیں آخر کو تھک کر چکے ہو بیٹھے
نشانِ ہستیِ اُمید کو نقشِ ہوا سمجھے

جبھی سمجھوں گا ضامنؔ میں تمہاری عقل کو صائب
کہ جب یہ گردشِ قسمت کو دَورِ آسیا سمجھے

مترجمہ
قدوس صہبائی
بی۔ اے (آنرز)

زہرہ - فلسفی کی بیوی

بہت دنوں کا ذکر ہے ——— برانیزا میں ایک مشہور اور مقدس تالمودی رہتا تھا، جو اپنے فہم و ادراک زہد و تقدس اور خوف خدا سے زیادہ اپنی حسین بیوی کی وجہ سے مشہور تھا۔ برانیزا کی یہ حسینہ اپنے حسن و خوبصورتی کی وجہ سے زہرہ کہی جاتی تھی۔ خود اُس نے بھی اپنے لئے اس نام کو پسند کر لیا تھا۔ اس لئے کہ یہ نام اس کلیہ کے خلاف تھا کہ یہودی فلسفیوں کی بیویاں بدصورت مکروہ اور بد اخلاق ہوتی ہیں اور اُن کے بدن میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوتا ہے۔

تالمودی اپنی مذہبی کتاب توریت عجیب انداز سے پڑھا کرتا تھا۔

تمام انسانوں کی شادیاں دوسری دنیا میں ہو جاتی ہیں۔ یعنی جب کوئی لڑکا پیدا ہوتا ہے تو ایک غیبی آواز اس لڑکے کی ہونے والی بیوی کا نام لے کر پکارتی ہے اور اسی طرح جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو وہ آواز اُس کے شوہر کا نام پکارتی ہے۔ اور جس طرح ایک اچھا یہودی باپ عمدہ سامان کو بیچ دیتا ہے اور اپنے لئے اپنے بیوی بچوں کے لئے معمولی سامان اِستعمال کرتا ہے اسی طرح خدا تالمودی فلسفیوں کو ایسی عورتیں عطا کرتا ہے، جنھیں دوسرے آدمی قبول کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔

کچھ بھی ہو اِس یہودی کے معاملہ میں خدا نے اپنے قانون میں لچک پیدا کر لی اور اُسے زہرہ جیسی حسین و جمیل ایک خاتون بخش دی تھی۔ خدا نے شاید یہ اِستثناء اِس لئے ضروری خیال کیا کہ وہ اپنے اُصول کی شدت کو کم کرنے کے لئے اس میں تھوڑی سی لچک پیدا کر دے۔

اس یہودی فلسفی کی حسین و ماہ رو بیوی اس لائق تھی کہ کسی بادشاہ کے تخت کو زینت بخشتی یا کسی نگار خانہ کی رونق بڑھاتی۔ وہ سرو قد اور جذبات میں ہیجان پیدا کر دینے والی زہرہ اپنے مغرور سر اور کاندھوں پر ہمیشہ سیاہ شال ڈالے رہتی تھی۔ لانبی لانبی پلکوں سے گھری ہوئی اس کی سیاہ غزالی آنکھوں میں جوش و سرمستی کے بجائے نہ معلوم کیوں اُداسی برستی تھی۔ اس کے نرم و نازک اور خوبصورت ہاتھ، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہاتھی دانت سے بنائے گئے ہیں۔

اِس حسین نازنین کو قدرت نے اِس لئے بنایا تھا کہ وہ عالم پر حکومت کرے، اُس کے پرستارانِ حُسن اس کے قدموں پر اپنا سر جھکائیں، اُس کا لازوال حُسن کسی مصور کے بُرش کو جنبش دے یا کسی بت تراش کے اوزاروں کو حرکت میں لائے اور کسی شاعر کے قلم کو بیتاب و بے قرار کر دے۔ لیکن اَفسوس قدرت کی اِس خواہش کے خلاف یہ حسین پھول ایک گھر میں تنہا بند کر دیا گیا۔ وہ اپنی قیمتی شالوں میں لپٹی ہوئی دن بھر کھڑکی میں سے دور سڑک پر کوئی رنگین خواب

دیکھا کرتی۔

اُس کے کوئی بچہ نہ تھا۔ اُس کا شوہر تالمودی فلسفی صبح سے رات گئے تک عبادت کیا کرتا تھا اور اپنی مقدس کتابوں کو پڑھا کرتا تھا۔ اپنی حسین بیوی سے اُسے کوئی واسطہ نہ تھا، اس کا منتہائے نظر تو فطرت کا وہ پوشیدہ حسن تھا جسے وہ باطنی تعلیم کہا کرتا تھا۔ یا اُن مذہبی روایات کا کھوج بیان کرتا تھا جو سینہ بسینہ اس کی قوم میں چلی آتی تھیں اِس حسینہ کو بھی گھر سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ کافی مالدار تھی اور اپنی امارت کی وجہ سے ایک گھڑی کی طرح جو ہفتے میں ایک مرتبہ چابی دینے سے اپنے آپ چلتی رہتی ہے، اِسی طرح اس کے گھر کے کام خود بخود مشین کی طرح انجام پاتے رہتے تھے۔ اُس سے نہ کوئی ملنے آتا تھا اور نہ وہ کسی سے ملنے جاتی تھی۔ دن بھر کسی رنگین خیال میں غرق و ملول اور فکرمندانہ انداز سے بیٹھی رہتی تھی۔

. . . .

. . . .

. . . .

ایک دن جبکہ طوفانِ بادباراں، بجلی کی چمک اور بادل کی گرج قصبے بھر میں اپنا جوش و خروش دکھا رہا تھا اور کھڑکیاں اور دروازے بار بار کھل کھل کر حضرت مسیح کی آمد کا استقبال کر رہے تھے، وہ حسین یہودی زہرہ اطمینان سے اپنی آرام کرسی پر گرم شال میں لپٹی کسی خیال میں منہمک کانپ رہی تھی۔ یکایک اس نے اپنی بیخود کر دینے والی نظروں کو اپنے شوہر پر جما دیا جو ہل ہل کر توریت کا مطالعہ کر رہا تھا اور دفعتاً پوچھا۔

"اچھا بتاؤ ابن داؤد اس دُنیا میں کب آئیں گے؟"

فلسفی نے جواب دیا "مقدس توریت میں لکھا ہے کہ جب تک سب یہودی نیک اور ایماندار نہ ہو جائیں گے یا سب کے سب بدکردار اور گناہگار نہ ہو جائیں گے اس وقت تک حضرت مسیح کا ظہور نہ ہوگا۔"

حسین زہرہ نے پھر پوچھا "اچھا کیا تم یقین رکھتے ہو کہ تمام یہودی نیک اور ایماندار ہو جائیں گے؟"

"میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ سب یہودی پاکباز اور پاکدامن ہو جائیں۔"

"اچھا تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب سب یہودی بدچلن اور آوارہ ہو جائیں گے تب حضرت مسیح آئیں گے؟"

فلسفی نے بیوی کا یہ جواب سُنکر اپنے کندھے سکیڑے اور پھر توریت کی ان گتھیوں اور الجھنوں کو سلجھانے میں مصروف ہو گیا جن کے متعلق یہ خیال تھا کہ اس دنیا میں صرف ایک ہی آدمی ایسا تھا جس نے توریت کی پیچیدگیوں کو حل کرنے کے بعد اپنی عقل کو برقرار اور اپنے دماغی توازن کو قائم رکھا تھا۔ حسین و خوبصورت زہرہ پھر کھڑکی کے باہر موسلادھار بارش میں کوئی پرکیف خواب دیکھنے لگی اور غیر ارادی طور پر اُس کی نرم و نازک انگلیاں قیمتی شال سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔

. . . .

. . . .

. . . .

اتفاق سے قریب کے ایک گاؤں میں کچھ مذہبی رسموں کے متعلق جھگڑا ہو گیا اور تالمودی فلسفی کو وہاں جانا پڑا۔ خدا اُس کے علم و فضل کا بھلا کرے اس نے اُمید کے خلاف ذرا سی دیر میں اِس قصّہ کو طے کر دیا اور بجائے دوسرے دن صبح گھر جانے کے

وہ اسی دن شام کو اپنے ایک دوست کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ وہ گاڑی میں سے اپنے دوست ہی کے گھر اتر پڑا اور پھر اپنے مکان تک پیدل آیا۔ جب وہ اپنے گھر پہونچا تو اُسے یہ دیکھکر سخت حیرت ہوئی کہ گھر کی تمام کھڑکیاں روشنی سے جگمگا رہی ہیں اور کسی افسر کا ایک ملازم دروازہ پر نہایت اطمینان سے بیٹھا اپنا پائپ پی رہا ہے۔

فلسفی نے دوستانہ اور تجسسانہ لہجے میں اس سے پوچھا "یہاں بیٹھے تم کیا کر رہے ہو؟"

"میں یہاں بیٹھا نگرانی کر رہا ہوں کہ کہیں حسین وخوبصورت زہرہ کا شوہر خلاف توقع جلد واپس نہ آجائے"

"اچھا غور سے نگرانی کرنا"

فلسفی یہ کہکر چلا گیا اور مکان کے پچھلے دروازے سے جو باغ میں تھا وہ مکان میں داخل ہوا۔ جب وہ پہلے کمرہ میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک میز پر دو آدمیوں کے لئے کھانا چنا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔ دوسرے کمرہ میں اس کی بیوی حسب معمول اپنی شالوں میں لپٹی کھڑکی میں بیٹھی تھی اس کے گال سرخ ہو رہے تھے، اس کی اداس، مایوس اور پژمردہ آنکھوں میں اس وقت سکون واطمینان اور خوشی کی جھلک تھی اس نے ایسی نگاہوں سے اپنے فلسفی شوہر کو دیکھا جو اس کا مذاق اڑا رہی تھیں اور اپنی آسودگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ یکایک یہودی فلسفی کی ٹھوکر کسی چیز سے لگی جس سے عجیب طرح کی آواز پیدا ہوئی یہ ہمیز کی ایک جوڑ تھی اس نے اُسے اُٹھا کر اپنی زہرہ سے پوچھا:-

"یہاں کون آیا تھا؟"

حسین زہرہ نے اپنے کاندھوں کو حقارت سے سکیڑ لیا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا میں یہ سمجھ لوں کہ کسی مسلح رسالہ کا کپتان یہاں تمہارے ساتھ تھا؟"

زہرہ نے اپنی شال کے شکنوں کو درست کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں وہی میرے پاس آیا تھا ــــ اور آخر وہ کیوں نہ آتا؟"

"عورت کیا تو اپنے حواس کھو بیٹھی ہے؟"

زہرہ نے جواب دیا "نہیں میں تو پوری طرح اپنے ہوش وحواس میں ہوں" اور پھر جذبات میں ہیجان پیدا کر دینے والے انداز سے مسکرا کر کہنے لگی "تم ہی نے تو کہا تھا کہ جب یہودی بدکردار وبدکار ہو جائینگے تب مسیح آئینگے تو کیا انکو بلانے کیلئے کہ وہ آکر ہمیں نجات دلائیں میں اپنا فرض ادا نہ کرتی؟"

(بقیہ سُرخ مانگ) کے پاس سے گذرا تو خود بخود آنسو نکل آئے ــــ!

رتنا تو اپنے سسرال چلی گئی موہن کے تحفے بھی ساتھ لیتی گئی جب اُسے فرصت ملتی تو وہ تحفے دیکھتی۔ موہن اُسے یاد آجاتا۔ لیکن موہن کے پاس کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جو اُسے رتنا کی یاد دلاتی۔ اگر کبھی خیال آتا تو سُرخ مانگ دکھائی دیتی۔ شاید وہ یہ جتانا چاہتی تھی کہ رتنا کی شادی ہو چکی ہے۔ جب وہ کسی عورت کو مانگ بھرے دیکھتا تو اسے رتنا کی یاد پھر سے تروتازہ ہو جاتی جس کو وہ بھلا دینا چاہتا تھا۔ جس یاد سے دل کو تکلیف ہو اس کی یاد سے فائدہ ہی کیا ہے۔

رتنا کی سُرخ مانگ نے موہن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اُس کی اُمیدوں، اس کے خیالات، اُس کے ارمان، اس کی آرزوئیں اور اس کی تمناؤں کا خون کر ڈالا تھا اور موہن کو ایک بے جان پتھر بنا کر رکھ دیا تھا ــــ!!!

علمی ادبی کتابیں اور انکا شاندار مرکز

بلند پایہ ادیبوں اور حیدرآباد کے مشہور و معروف ناشرین کی تمام کتابیں ہم سے طلب فرمائیں۔

عصر حاضر آپ کو مجبور کر رہا ہے کہ مسائل حاضرہ کے ہر پہلو سے آگاہ ہوں مطبوعات مسائل حاضرہ سے متعلق ذیل کی ہر کتاب بیش بہا علمی اور معلوماتی خزانہ اپنے سینے میں رکھتی ہے:۔

جنگ اور روپیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر	جنگ اور راتب بندی ۔ ۔ ۔ عہ
جنگ اور اغذیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۵ر	امریکہ میں بین الاقوامی زر کے منصوبے۔ ۶ر
جنگ اور مالیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر	کینیڈا میں " " " ۸ر
اشتراکی روس ۔ ۔ ۔ ۔ ۶ر	انگلستان " " " ۸ر
تنظیم مابعد جنگ ۔ ۔ ۔ ۶ر	ہندوستان " " " ۸ر
ہندوستانکی زر پر جنگ کے اثرات ۲عہ	محصول زائد نفع اندوزی ۔ ۔ ۔ ۸ر
جنگ اور غذاء کا مسئلہ ۱۲ر	ہندوستان کا قومی قرضہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر
حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات عہ	ہندوستان کیلئے ایک معاشی لائحہ عمل۔ ۱۲ر

حیدرآباد اور قیمتوں کی نگرانی ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن

جاوید لطیفی

کس کی خاطر ——؟

..... یکایک کنویں کی گہرائی سے ایک خوفناک چیخ سنائی دی اور دوپہر کے تپتے ہوئے سناٹے میں گھل مل گئی۔ مگر اس دلدوز چیخ سننے کے لئے وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ دراصل یہ آواز کسی بیکس کی اپنی جان بچانے کی آخری اور ناکام کوشش تھی۔

غریبوں اور بیکسوں کی زندگی دنیا میں محنت ومشقت اور خدمت گزاری کرتے ہوئے مرجانے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ شاید قسام ازل نے مزدوروں کا نوشتہ تقدیر ہی ویسا لکھ چھوڑا ہے کہ وہ بیچارے ایک نہ ایک دن موت کے آہنی پنجوں میں گرفتار ہو جائیں —— عیش وعشرت کے مزے اٹھانا تو درکنار وہ اس کا خواب دیکھنے سے بھی محروم ہیں تو پھر بیچارے حسن کی قسمت اس کے برعکس کیونکر ہوسکتی تھی ——؟

سیٹھ منظور حسین کو اپنے بنگلے کے احاطے کے کنویں کا پانی صاف کروانا تھا۔ اس دن اس کام کے لئے انھوں نے ایک مزدور کو بلایا اور اس طرح آج حسن کو کام ملا —— بہت دن سے وہ بیکاری میں دن گزار رہا تھا۔

بیچارہ حسن تین دن سے کام کی تلاش میں پریشان تھا۔ لیکن اس کی بدقسمتی کا کیا علاج ——؟ پیسوں بغیر ایک ایک دن کس طرح کٹے گا۔ کس طرح گزر بسر ہوگی —— ؟ یہی سوچتا مسلسل تین دن سے وہ ناکام ونامراد اپنے گھر واپس لوٹتا تھا —— بڑے بڑے سند یافتہ جنٹلمن نوکری کی تلاش میں خاک چھانتے پھرتے ہیں تو بیچارے اِن اَن پڑھ مزدوروں کی کیا حقیقت —— ؟

سورج اپنے اصول کے مطابق روز طلوع ہوتا اور غروب ہو جاتا۔ لیکن حسن جب گھر کی طرف قدم اٹھاتا تو اس کی حالت ایک مجرم جیسی ہوتی۔ پورا دن گزر جاتا، رات اپنی زلفیں بکھیر دیتی۔ روز حسن جیب خالی اپنے گھر کی طرف قدم اٹھاتا —— اف ری بدقسمتی —— لیکن حسن نے امید واستقلال کا دامن اپنے ہاتھ سے کبھی نہ جانے دیا۔ ہر روز صبح وہ بڑے استقلال اور امید سے شہر کا رُخ کرتا —— مگر وہی مایوسی اپنا خوفناک چہرہ لئے اس کے سامنے آدھمکتی ——

شاید آج حسن کی قسمت زوروں پر تھی آج صبح جبکہ وہ شہر کی طرف قدم بڑھائے جا رہا تھا کہ سیٹھ صاحب نے اپنے بنگلے سے اسے پکار لیا وہ کنویں کا پانی نکالنے پر راضی ہوگیا ——

لیکن آج کیا معلوم کہ گردشیں اب بھی اس کے دامن کے ساتھ چمٹی ہوئی ہیں۔ اگر انسان کو اپنے مستقبل کی خبر ہوتی تو وہ کیوں اپنی زندگی کے دلکش تصورات میں کھو جاتا، اور کیوں ایک

پیاسی ہرنی کی طرح سراب کی طرف لپکتا ــــ اگر حسن کو اپنے مستقبل کی خبر ہوتی تو کیا وہ آج اپنے سامنے آئی ہوئی نعمت زہر سمجھکر پھینک نہ دیتا ــــ؟

سیٹھ صاحب نے حسن سے پوچھا ــــ

"بتاؤ ــــ کنوئیں کا سارا پانی نکال پھینکنے کی اُجرت کیا لوگے ــــ؟"

"حضور ــــ میں غریب آپ سے کیا مانگ سکتا ہوں ــــ آپ ہی خود سوچ سمجھ کر دیدیجئے"

"نہیں۔ نہیں۔ صاف صاف کہو ــــ میں حجت پسند نہیں کرتا"

"تو پھر حضور ــــ پانچ بالٹیوں کا ایک پیسہ اِس حساب سے دیجئے"

"ا ...... چھ ...... ح .. تھا ــــ بڑے چالاک ہوجی تم" سیٹھ صاحب نے حیرت میں کہا "ایک بات کہو، کل کتنے پیسے لوگے"

حسن نے گہرے کنوئیں میں جھانکا ــــ اور جب گردن اُوپر اٹھائی تو اس کی نظروں میں خوف ناچ رہا تھا۔

"حضور پانی بہت گہرائی میں ہے۔ مجھے میری محنت کے لحاظ سے صرف تین روپئے دلا دیجئے"

"اتنے سے کام کے لئے تین روپئے ــــ" سیٹھ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا ــــ "آپ کیا دیں گے"

"ایک روپئے سے زیادہ میں ایک پائی بھی نہیں دے سکتا" سیٹھ صاحب نے لاپروائی سے جواب دیا"

حسن کانپ اٹھا ــــ دن بھر کی محنت اور صرف ایک روپیہ وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھر کا نقشہ پھر گیا ــــ چھوٹے چھوٹے بچے، بیوی ــــ وہ فوراً رضامند ہوگیا ــــ

چلچلاتی دہوپ میں حسن پسینے میں تربتر کنوئیں سے پانی کی بالٹیاں بہا رہا تھا۔ پچاس ہی بالٹیاں نکالی تھیں کہ وہ بالکل تھک گیا ــ لیکن تھک کر کرتا کیا ــــ؟ اس نے تو اپنا پورا جسم دن بھر کے لئے صرف ایک روپیہ میں بیچ دیا تھا ــــ تھکن اور کمزوری کی وجہ سے اس کا کام ڈھیلا پڑ گیا ــــ

اس وقت سیٹھ صاحب برقی پنکھے کے نیچے اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ حسن نے اور دو چار ہی بالٹیاں نکالی تھیں کہ اس کا پیر پھسلا اور وہ دھم سے کنوئیں میں جا گرا ــــ کنوئیں میں ایک خوفناک چیخ گونجی ــــ لیکن وہاں کوئی بھی موجود نہ تھا۔ پھر اُسے بچاتا کون ــــ؟ ایک بالشت پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے اُسے اپنی جان بھینٹ کرنی پڑی ــــ

دو گھنٹے کے بعد سیٹھ صاحب یہ دیکھنے کے لئے کہ حسن نے کتنا کام کیا کنوئیں پر آئے ــــ لیکن وہاں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی ــــ حسن وہاں موجود نہ تھا ــــ "کام کے خوف سے آخر بھاگ گیا نامرد" سیٹھ صاحب بڑبڑاتے ہوئے اپنے بنگلے میں واپس آگئے ــــ دو تین دن کے بعد حسن کی لاش پانی پر تیرتی ہوئی نظر آئی ــــ اُسکی گمشدگی کا راز فاش ہوگیا ــــ اس وقت حسن کی بیوی کا رونا اور بلبلانا دیکھکر پتھر کا دل بھی موم ہوجاتا ــــ موت نے بیچاری کے عمر بھر کے ساتھی کو منٹوں میں چھین لیا ــــ بیچارے معصوم بچے یتیم ہوگئے۔ لیکن سیٹھ صاحب اور دنیا کو اس کا کیا غم ــــ غریبوں کا والی اس دنیا میں کون ہے ــــ!

صحوی

محمد اقبال

(صنعتِ توشیح میں ایک نظم)

م　مرکزِ قلب و نظر اے شاعرِ رنگیں بیاں　|　ناز فرما ہے تری تخلیق پر ہندوستان
ح　حاملِ اسرارِ فطرت شرحِ فرمائے حیات　|　رازدارِ حرّیت آئینہ دارِ کائنات
م　مطرحِ آیاتِ حکمت اے زمانہ کے حکیم　|　شعلہ افگن ہے زمانے میں تری ضربِ کلیم
م　موج زن تھی تیری دل میں جو صدائے الرحیل　|　شعر ہو کر جاگ اٹھی ہے بصوتِ جبرئیل
د　دامنِ فطرت کی اے نقش و نگارِ بہتریں　|　کیوں نہ جھک آئے تری قدموں پہ گردوں کی جبیں

ا　آج بھی روشن وہی ہے تیرا فانوسِ خیال　|　اے کہ تیرا ہر نفس پروردۂ روحِ بلالؓ
ق　قلبِ گیتی وہ تری آہوں کا مدفن ہو گیا　|　تیرا سینہ شعلۂ سوزاں سے روشن ہو گیا
ب　بحرِ بے پایاں تھی آزادی میں تیری زندگی[1]　|　اب بھی تیرے نام کو حاصل ہے اک تابندگی
ا　آہ اب مجھ کو ترا رہ رہ کے آتا ہے خیال　|　دل کی بیداری کو اک چٹکی سی لیتا ہے ملال
ل　لاکھ غم صدہا مصائب ہوں بھی جائینگے کہیں　|　آہ تیری یاد دل سے محو ہو سکتی نہیں

[1] علامۂ اقبال کا مصرعہ ہے "اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی"

پرشوتم سنگھ سیٹھی

سُرخ مانگ

تھا وہ ایک دیہاتی ـــــــ گاؤں کا رہنے والا لیکن بہت کاہل، مجہول، سُست اور اَفیونی۔ حالانکہ دیہاتی بہت چُست و چالاک، پُھرتیلے، محنتی اور بُردبار ہوتے ہیں اگر کسی دیہاتی میں یہ اَوصاف نہیں تو وہ دیہاتی نہیں رہتا کیونکہ اگر سونے کا رنگ خراب ہے تو اُسے سونا تو کہیں گے لیکن اصلی سونا نہیں۔ اصلی اور نقلی سونے میں وہی فرق ہے جو ایک اصلی اور نقلی دیہاتی میں۔ موہن تھا تو سونا لیکن نقلی۔ اس میں وہ صلاحیتیں موجود تھیں جو ایک دیہاتی میں موجود ہوتی ہیں لیکن وہ اِن سے کام نہ لیتا تھا۔ جیسے کسی کے پاس روپیہ تو ہو لیکن وہ اُس سے فایدہ نہ اُٹھا سکے۔

وہ اپنا کام نہیں کرتا تھا اس کا کھیت ویران پڑا تھا۔ پھر فصل کی کیسے اُمید کرتا۔ اس کی بوڑھی ماں اس کی توجہ اس طرف مبذول کراتی لیکن بے سُود یہ تو کہو اس کی ماں کا جوڑ توڑ تھا کہ دونوں وقت روٹی ملتی جاتی تھی ورنہ فاقہ تو فاقہ ایک دن بھی زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ جس درخت کو ہوا، پانی، دُھوپ اور کھاد نہ مِلے اُسے سوکھ ہی جانا چاہیئے لیکن موہن کو کچھ پَروا نہ تھی۔ ملاریں گاتا، کسرت کرتا اور اِدھر اُدھر اینٹھتا پھرتا نہ اُسے گھر کی فکر تھی نہ کھانے کا خیال۔ بس اُسے تو گھومنا، ہنسنا، اور کتاب دیکھنے سے مطلب تھا۔ زمیندار کے لڑکوں کی صحبت میں اُسے کچھ سُدھ بُدھ ہو گئی تھی۔ وہیں سے ایک آدھ کتاب مانگ لاتا اُسے دن بھر پڑے پڑے ہجّے لگا کر پڑھتا۔ شام کو زمیندار کے لڑکوں کے ساتھ شکار کو چلا جاتا یا پھر پنگھٹ کے قریب بیٹھ کر بانسری بجاتا جو عورتیں اور لڑکیاں پانی بھرنے آتیں آنھیں چھیڑا کرتا۔ اُن سے مذاق کرتا۔ زمیندار کے لڑکے موہن کو سَر پر چڑھائے تھے موہن۔ ان کا مُنہ لگا تھا وہ گاؤں کی لڑکیوں کے قِصّے دُہراتا۔ اُن کی باتیں کرتا۔ ان کی صورت کا نقشہ اچھے الفاظ میں پیش کرتا۔ اِس طرح اُن سے کچھ اینٹھ ہی لیتا۔ اپنا دل بھی خوش کر لیتا۔ ایک تیر میں دو شکار مارتا۔ یہ تھا اُس کی زندگی کا مقصد ـــــ!

آخر ایک وقت وہ بھی آتا ہے۔ جب خاموش دریا میں تلاطم بَرپا ہو جاتا ہے۔ خاموش سمندر جو اُس فلسفی کی طرح نظر آتا ہے جو ہر وقت کسی نہ کسی گہرے خیال میں محو ہو۔ اس میں مد و جزر بھی آتے ہیں اِتنے زور شور سے کہ شک ہونے لگتا کہ سمندر بیقرار ہے اور بے قرار رہے گا۔ چاند کی نورانی کرنیں سمندر میں ہلچل پیدا کر دیتی ہیں بالکل یہی حال موہن کا ہوا۔ اس میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ وہ اُس بُھرے مٹی کے ٹیلے کی طرح تھا جو ڈیل ڈول ہوتے ہوئے بھی ایک جگہ پڑا رہتا ہے۔ لیکن ایک وقت آیا جب موہن کی خاموش زندگی میں مد و جزر اُٹھنے لگے۔ اس میں زندگی کی روح سرایت کر گئی۔ سوکھے ہوئے درخت کی طرح جو بارش ہوتے ہی سر سبز اور تر و تازہ ہو جاتا ہے اُسکی لدی پھندی شاخیں جھومنے لگتی ہیں یہی حال موہن کا تھا۔

چاندکی کرنوں کے بجائے وہ حسن کی شاخوں سے متاثر ہو گیا۔ حسن انسانی زندگی میں بہت دخل رکھتا ہے۔ دُنیا کی تمام چیزیں حسن سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ بات یہ ہوئی کہ گاؤں میں ایک کسان آکر آباد ہوا۔ کسان کے ایک لڑکا اور ایک جوان لڑکی بھی تھی۔ لڑکی تھی خوبصورت، منہ لگتی ہوئی۔ گاؤں کی تمام لڑکیوں پر خوبصورتی کے لحاظ سے سبقت لے گئی تھی۔

موہن نے جب رتنا کو پہلے پہل دیکھا تو اُس پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ اس کا دل اَب پہلی مرتبہ متاثر ہوا تھا۔

رتنا اُسے بہت اچھی لگی وہ اپنے دل میں نہ معلوم کیا کیا اُمیدیں باندھنے لگا۔ رتنا اپنے بھائی جگو کے ساتھ دن بھر کھیت پر کام کرتی۔ وہ دیہاتی دوشیزہ تھی۔ دیہات کی روایت کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتی۔ آج موہن کو پہلی مرتبہ اپنے فرائض سے بے اعتنائی کا احساس ہوا۔ رتنا کے کھیت سے ملا ہوا موہن کا بھی کھیت تھا۔ لیکن وہ بیکار پڑا تھا۔

موہن کو اپنے کھیت کی حالت پر ترس آگیا اُس نے اُسے جوتنے اور بونے کے قابل بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اِس طرح رتنا سے قربت بھی رہے گی۔ دل کا اضطراب بھی کم ہو جائے گا۔ اِس طرح رتنا سے بات کرنے کا موقع بھی مل سکتا ہے دوسرے دن گاؤں والوں نے دیکھا کہ موہن تڑکے ہی اُٹھکر کھیت میں کام کر رہا ہے اِس تغیر پر لوگوں کو حیرت تھی۔

موہن نے رتنا کے بھائی جگو سے دوستی کرلی تھی موہن کو جب اپنے کھیت میں ضرورت ہوتی تو جگو اسکی مدد کرتا اور جب جگو کو موہن کی ضرورت ہوتی تو وہ چلا جاتا۔ اِس طرح دونوں ایک ساتھ ملکر کام کرتے۔ موہن کے پاس بیلوں کی جوڑی بھی نہ تھی۔ جگو نے بیل دیئے تاکہ موہن اپنا کھیت جوتے اُس کے بدلے موہن نے دن بھر پرانی چلائی جگو کا کھیت لبریز کر دیا۔ غرض دونوں ایک جسم کے دو حصوں کی طرح مِل جل کر کام کرتے تھے۔

موہن جب کام کرتے کرتے تھک جاتا تو چلم بھرتا ہنڈیر پر بیٹھکر خوب دم لگاتا۔ کھانستا اور چلم لئے جگو کے کھیت میں جاتا جہاں جگو اور رتنا بیٹھے کھیت سے کھونٹیوں کو چُنتے ہوتے۔ جگو چلم پیتا۔

موہن رتنا کو دیکھتا اور مُسکراتا۔ اس کی ساری تھکن دور ہو جاتی۔ وہ پھر ہشاش بشاش ہو جاتا اس میں محنت کا جذبہ پھر تر و تازہ ہو جاتا۔ گرمی میں جب رتنا بار بار پسینہ جھٹکتی تو چوڑیوں سے ایک لطیف آواز پیدا ہوتی۔ موہن کہتا۔ ”رتنا تم گھر جاکر آرام کرو نا۔ ہم دونوں کافی ہیں“

رتنا مُسکرا کر کہتی ”نہیں۔ نہیں مجھے گھر میں مزا نہیں آتا۔ میں تو کھیت میں کام کرونگی۔

کبھی موہن رتنا اور جگو ساتھ ساتھ شانہ بشانہ ملکر کام کرتے موہن کے لئے وہ لمحے نہایت قیمتی ہوتے تھے۔

موہن اور جگو جب بیڑی چلاتے تو رتنا کھرپلئے سوراخ بند کرتی جب دونوں پراہی کھینچتے تو وہ ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھوکر بہت خوش ہوتی۔ جب دونوں کام کرتے تو وہ اُن کی چلم بھرتی تھی۔ اس کی اس عادت پر موہن جان ہی نہیں دیتا تھا بلکہ موہن کی بوڑھی ماں تو اسے ہزار دعائیں دیتی۔ بار بار چپاتی اور چومتی تھی۔ موہن کی نظروں میں رتنا سما گئی تھی نظر سے آہستہ آہستہ دل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ موہن رات کو جگو ہی کے یہاں جاکر باتیں کرتا تھا۔ چلمیں بھری جاتیں۔ مزے دار باتیں ہوتیں مستقبل کے قصے گھڑے جاتے۔ ہنسی مذاق ہوتا۔ اِس دلچسپ محفل میں رتنا کی موجودگی اور جان ڈال دیتی۔ جب رات گئے

موہن واپس ہوتا تو اس طرح لڑکھڑاتا گویا اُس نے شراب پی ہو۔ اُس کے کانوں میں رتنا کی آواز گونجتی ہوتی وہ جدھر دیکھتا اُس کو رتنا دکھائی دیتا ——!

فصل پکی۔ موہن، جگو اور رتنا کی خوشی کی کوئی اِنتہا نہ تھی۔ تینوں اپنی اپنی محنتوں کو پکتا، پھلتا دیکھکر خوشی سے جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے۔ گاؤں والوں کی خوشی کا یہی وقت ہوتا ہے فصل اچھی ہوئی تو وہ بچوں کی طرح ہنستے اور کھیلتے ہیں اگر فصل خراب ہوگئی تو ذرا سی بات پر رو دیتے ہیں جس طرح رباب کے تاروں کو ذرا چھیڑنے سے جھنکار پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے دلوں کے تاروں سے دردناک نغمہ نکلتا ہے۔ موہن فصل پکنے کو اپنے لئے اچھا شگون سمجھ رہا تھا۔ زندگی میں یہی پہلی فصل تھی جو موہن کے ہاتھوں پکی ہو۔ وہ خیالات کے دریا میں ڈوب گیا اور بہتے بہتے دُور نکل گیا وہ سوچنے لگا "وہ دن بھی دُور نہیں جب میری اُمیدیں اِسی طرح پھلے پھولیں گی۔ ایشور میرا حامی معلوم ہوتا ہے۔ یہ اچھا شگون ہے" وہ اپنی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ جگو نے آکر اسے چونکا دیا وہ کہہ رہا تھا "موہن کیا سوچ رہے ہو؟"

موہن کو جواب دینا چاہیئے تھا لیکن رتنا بول اٹھی "اپنی بارات کے متعلق سوچ رہے ہیں" رتنا نے نادانستہ طور پر دکھتے تاروں کو چھیڑ دیا تھا وہ بیقرار سا ہو گیا ہنستے ہوئے رتنا کو دیکھا اور کہنے لگا۔

"تم تو دل کا حال بھی جان لیتی ہو" موہن کی آنکھوں کی چمک اور اس جملے نے رتنا کو اب شرما دیا تھا وہ سوچ رہی تھی وہ کیوں بول اٹھی۔ جگو اور موہن ہنس رہے تھے اور رتنا کی پیشانی عرق آلود تھی۔

جگو اور رتنا فصل کاٹ رہے تھے رتنا اُسے اِکٹھا کرتی جاتی۔ منہ ہی منہ میں گنگناتی بھی جاتی۔ آج اِتنا ہوا کہ لگان بھی ادا ہو گیا، کھانے کو بھی بچا اور کچھ روپئے بِل گئے۔ اچھی فصل نے گاؤں بھر کو مسرور و شادمان بنا دیا تھا۔ ہر طرف اِنسان گنگناتے، ہنستے، کھیلتے ہی نظر آتے تھے یہی نہیں جانوروں کا بھی اچھا حال تھا۔ پیٹ بھرے درختوں کے نیچے بیٹھے جگالی کرتے رہتے تھے۔ زور زور سے ڈکارتے۔

رتنا اِس لئے مسرور تھی کہ جگو نے اُسے زیور بنا دینے کو کہا تھا موہن اس لئے کہ اس کی محبوبہ خوش تھی ——!

حقیقت تو یہ تھی اگر رتنا نہ آتی تو موہن کبھی کھیتی باڑی کا کام نہ کرتا۔ وہ تو دل نے اُسے مجبور کر دیا تھا۔ اس کی حالت اس مریض کی سی تھی جسے مجبوراً دوا کھانا پڑتی ہو۔

موہن نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ وہ اس کام میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر رتنا کو وہ کسی صورت سے بھی حاصل کر سکتا ہے تو وہ صرف روپیہ ہے کیونکہ جگو کہہ چکا تھا کہ رتنا کی شادی اُس سے ہو گی جو سب سے مالدار ہو گا۔

موہن سمجھا کہ یہ اشارہ شاید اسی کی طرف ہے موہن کے دِل میں خلش پیدا ہو گئی وہ بھی کوشش کر کے دیکھ لینا چاہتا تھا۔ اِسی لئے اس نے شہر میں نوکری کی ٹھان لی۔ زمیندار کے لڑکے نے اُسے شہر میں ایک رئیس کے یہاں جگہ دلا دی۔

موہن جب جگو اور رتنا سے رخصت ہونے آیا تو جگو سے پُوچھا "بھیا تمہارے لئے شہر سے کیا لاؤں" جگو ہنسا اور دھواں نکالتا ہوا کہنے لگا "کیوں تکلیف کرو گے۔ جب آنا تو تھوڑی تمباکو اور ایک شلوکا لیتے آنا"

اَب موہن رتنا کی طرف متوجہ ہوا جو ایک کپڑے میں گھر کی بنی ہوئی چیزیں باندھ رہی تھی۔ موہن نے پُوچھا

"رتنا تمہارے لئے کیا بھیجوں؟" وہ اپنا نام سُنکر شرما گئی۔ اس کے چہرے پر سرخی دَوڑ گئی لیکن جواب دینا تھا دھڑکتے دل سے کہنے لگی "کچھ نہیں"۔

"واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے بولو؟" موہن نے اِصرار کرتے ہوئے کہا۔

موہن اس کی پسند کی چیز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ رَتنا بتلاتے ہوئے شرما رہی تھی جب مجبور ہوگئی تو کہنے لگی "یہی چوٹی۔ چوڑی وغیرہ" "اور کیا؟"

اس وقت اس کی سمجھ میں اور کچھ نہ آیا۔ کہتی تو کیا کہتی۔ موہن جگو سے گلے مِلا اور رخصت ہوگیا۔

وطن چھوڑتے کِسے تکلیف نہیں ہوتی۔ موہن کو بھی قلق تھا۔ ایک تو اِس لئے کہ وہ وہاں پیدا ہوا تھا وہیں بڑھا "پلا تھا۔ دوسرے اَب وہ رتنا سے الگ ہوگیا تھا۔ لیکن چھپی ہوئی اُمید نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس طرح شائد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتا تھا اِس لئے یہ جدائی بھی وہ بَرداشت کرنے پر تیار ہوگیا تھا۔

موہن آیا اس کے ساتھ رتنا بھی آئی اب رتنا نے اس کے دل میں جگہ کر لی تھی۔ جہاں موہن جاتا رتنا بھی ساتھ جاتی تھی۔ یہاں موہن مالک کی خدمت کرتا پھر رتنا کی یاد سے دِل بہلاتا۔ یہی اُس کی تنہائی کا مشغلہ تھا یا پھر اِدھر اُدھر شہر کا بھی چکر لگاتا۔ ماہ بماہ تنخواہ جمع کرتا جاتا۔ پانچ روپیہ تو ہر ماہ ماں کو منی آرڈر کر دیتا باقی پیسے جوڑتا جاتا۔ وہ روپیہ جمع کرنا چاہتا تھا تاکہ رتنا کے لئے تحفے لے سکے اور اس سے شادی کر سکے۔ یہی اَب اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ وہ اَسی مقصد کے لئے جی رہا تھا اِس نے اُمید کا دامن تھام لیا تھا۔ اور اُسے اُس وقت تک پکڑے رہنا چاہتا تھا جب تک نا اُمیدی جھٹکا دیکر دامن نہ چھڑا لے یا پھر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوجائے۔ وہ اُمید کے درخت کی پرورش کر رہا تھا تاکہ اس میں ثمر آسکے۔

وہ ہر مہینے ایک خط لکھتا تھا جگو کے نام اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے رتنا کا ذکر ضرور کرتا تھا۔ رتنا بھی ڈاکیہ کا اِنتظار کرتی رہتی نہ معلوم موہن کی چھٹی سے اُسے کیوں لگاؤ ہوگیا تھا۔ اگر چھٹی میں ذرا بھی دیر ہوتی تو وہ پریشان ہوجاتی تھی۔ رتنا کو اَب خاموش رہنا بھی آگیا تھا پہلے ایسا نہ تھا۔ لیکن موہن کے جاتے ہی یہ حال ہوا۔

موہن کو گئے کئی مہینے ہوچکے تھے موہن ایک بار بھی گھر نہ گیا تھا۔ نہ ہی جانے کو جی چاہتا تھا جب تک اس کی جیب روپیوں سے نہ بھری ہو۔ موہن کا مالک باہر جانے والا تھا موہن سے چلنے کو کہا اور یہ بھی کہا تمہاری تنخواہ بڑھا دینگے۔ موہن راضی ہوگیا دوسرے دن موہن نے جانے سے پیشتر ایک چھٹی جگو کو لکھی لکھدیا باہر جا رہا ہوں ایک سال بعد لوٹوں گا۔ ایک سال کی مدت بہت ہوتی ہے لیکن موہن کو مجبوراً یہ طویل جُدائی بھی منظور کرنا پڑی۔ کیونکہ ایک سال بعد جب وہ لوٹے گا تو روپیہ اس کے پاس ہوگا پھر اُسے شاید نوکری کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ اگر پڑے بھی تو وہ رتنا سے بہت قریب ہوجائیگا۔

ایک سال میں کئی نئی باتیں ہوگئیں موہن کو گھر کا کچھ حال معلوم نہ تھا۔ جگو کو موہن کا کوئی حال معلوم نہ تھا موہن نے اب چٹھی بھی بھیجنا بند کر دی تھی۔ رتنا کی بات چیت طے ہوگئی تھی جلد ہی شادی بھی ہونے والی تھی۔ موہن کو اِن حالات کی خبر تک نہ تھی۔ وہ تو بس اِسی خیال میں مست تھا جو دل میں لے کر گاؤں سے شہر آیا تھا۔

پورے ایک سال بعد موہن شہر آیا۔ اُس نے

اب بھی چٹھی نہیں لکھی وہ چاہتا تھا کہ یکایک جگو اور رتنا کے سامنے جا کھڑا ہو۔ اسی لئے وہ پھر خاموش ہو گیا تھا

دوسرے دن موہن نے رتنا کے لئے تحفے خریدنا شروع کئے۔ آج موہن کو دلی مسرت تھی۔ رتنا کے لئے چیزیں خریدنا یہ اس کی زندگی کا نہایت خوشگوار فرض تھا اس نے بہت سی چیزیں خریدیں۔ شہر میں رہتے رہتے اس کے خیالات بدل گئے تھے اسی لئے اس نے کئی چیزیں اپنی پسند سے بھی خریدیں۔ وہ سوچنے لگا "جب رتنا یہ سب دیکھے گی تو کتنی خوش ہوگی" جب خرید چکا تو اس نے چلنے کی تیاریاں کیں رات ہی والی گاڑی پکڑی۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہزاروں خیالات آنے لگے۔ تمام راستہ وہ اُنہی خیالات میں اُلجھا رہا سحر کو گاڑی گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچی۔ موہن گاؤں کی جانب بڑھا۔ اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا معلوم ہوتا تھا خوشی کے دریا میں لہریں اٹھ رہی ہیں۔ ابھی کسان کھیتوں میں بھی نہ آئے تھے کہ موہن گھر پہنچا۔ ماں سے ملا۔ اب رتنا کے گھر چلا۔ اس نے سب تحائف ساتھ لئے دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔ دل میں سوچ رہا تھا یہ جگو اسے دیکھکر حیران ہو جائیگا گلے لگائے گا پھر شکایت کرے گا رتنا بھی ناراض ہوگی لیکن یہ چیزیں دیکھکر خوش ہو جائے گی اس وقت وہ کتنی اچھی لگے گی"

گھر کے سامنے کوئی نہ تھا موہن چپکے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور جھانکنے لگا سامنے دالان میں رتنا زمین پر بیٹھی کنگھی کر رہی تھی۔ موہن وہیں کھڑا دیکھتا رہا۔ وہ چھپ کر رتنا کو اچھی طرح دیکھ لینا چاہتا تھا رتنا نے چوٹی باندھی اور پیالی اٹھا کر مانگ میں کوئی چیز بھرنے لگی ——" ارے یہ تو سیندور ہے" موہن نے دل ہی دل میں کہا "سیندور" کیا کنواری لڑکیاں بھی سیندور لگاتی ہیں؟ یہ معمہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ہاتھ پیر سنسنا رہے تھے۔ دل بیٹھا جاتا تھا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا رہا تھا۔

"کیا رتنا کا بیاہ ہو گیا؟" موہن نے پھر دل سے پوچھا۔ لیکن موہن کی طرح وہ بھی بے خبر تھا۔ موہن پر جیسے اوس پڑ گئی جلتی ہوئی شمعیں بجھ گئیں امید کی کلیاں مرجھا گئیں۔ خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ دل نے باتیں کرنا بند کر دیں۔ وہ اُلٹے پاؤں واپس گھر ہوا۔ ماں سے پوچھا "بوا کیا رتنا کا بیاہ ہو گیا ہے؟"

"ہاں بھیا۔ بیاہ کو سات مہینے ہوئے"

موہن کا سر چکرایا۔ اور وہیں بیٹھ گیا۔

یہ کیا سنا —— رتنا کا بیاہ۔ سرخ مانگ! بڑی دیر بعد اس نے تمام چیزیں جگو کو بھجوا دیں۔ جگو آیا اور ملا۔ باتیں کرتا رہا۔ لیکن موہن کو اب اس کی باتوں میں کوئی مزا نہ آتا تھا۔ اس کی امیدیں مر چکی تھیں۔ سوکھے ہوئے درخت کو کیسے سرسبز کیا جا سکتا ہے۔ شیشہ جب ٹوٹ جاتا ہے تو جڑتا نہیں ہے۔ جس لئے موہن گاؤں آیا تھا وہ اُسے نصیب نہ ہوا۔ اس کا دل گھبرانے لگا اور شام کو چلنے کا ارادہ کیا۔ وہ یہاں کیوں ٹھہرے۔ اب اس کے لئے یہاں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سنہری خواب حرفِ غلط کی طرح مٹ چکے تھے۔ ہوائی قلعے ایک دم مسمار ہو گئے تھے۔ اس کا دل مر چکا تھا زندگی بے کیف ہو چکی تھی۔ شام کو جب وہ پنگھٹ کی طرف سے گذرا تو رتنا پانی بھر رہی تھی۔ رتنا کو دیکھکر موہن کے دل میں ہیجان پیدا ہو گیا وہ ایک لمحہ رکا اور کہنے لگا "رتنا اب میں جا رہا ہوں پھر کبھی نہ آؤں گا" یہ سنتے ہی رسی رتنا کے ہاتھ سے چھوٹ گئی دوپٹہ منہ پر رکھکر زار زار رونے لگی جیسے پہلے سے تیار ہو۔ موہن دوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مبادا وہ بھی نہ رونے لگے لیکن جب موہن رتنا کے کھیت

پولیٹیکل ڈکشنری

مرتبہ

جناب سید عبدالقدوس ہاشمی

عظیم الشان سیاسی لغت جدید ترین معلومات کا خزانہ

جسمیں

سیاسی اصطلاحات، سیاسی معاہدات، سیاسی اشخاص، سیاسی مقامات بین الاقوامی معاملات، اور چھوٹی بڑی تمام حکومتوں کے حالات، انکی تاریخ اور اُن کے سیاسی موقف کو عام فہم اور دلکش انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

کتاب حروف تہجی پر مرتب ہے اور مشہور سیاسی عالم مولٰنا

عبدالقدوس ہاشمی

کی ۱۵ سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے

قیمت (۳ روپے)

سید عبدالرزاق پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس

اعظم بلڈنگ حیدرآباد دکن

ع ا س

ماہنامہ
پیام ادب

ماہ فروری سنہ ۴۴ء

ادارۂ اشاعت اُردو

عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن


رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸
پیامِ آزاد
ماہنامہ
جلد (۱)
نمبر (۶)
ماہ فروری سنہ ۱۹۴۴ء
مسئول
مدیر
ڈاکٹر
مینیجنگ
پروپرائٹر سید عبدالرزاق
سید عبدالوہاب
چودہری اقبال سلیم گاہندری
ناشر
ادارہ اشاعت اردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
فی پرچہ
آٹھ آنے
چندہ سالانہ
چھ روپئے
مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مندرجات

نظرات

پچھلا مہینہ عیسوی سال کا پہلا مہینہ تھا۔ دُنیا میں نئے سال کے نئے افکار اور نئی دُنیا کے لئے نئے حرکات شروع ہوئیں اُردو دُنیا میں بھی اچھی خاصی چہل پہل پیدا ہوئی۔ ارادے اور عزائم بیدار ہوئے، حرکتیں شروع ہوئیں، کوششوں اور مساعی کے دروازے کھولے گئے۔ اجتماعات ہوئے، تجاویز مرتب ہوئیں اور نئے سال کو نئے انداز میں خوش آمدید کہا گیا۔

کل ہند اُردو کانفرنس

کل ہند اُردو کانفرنس کے اجلاس ناگپور میں منعقد ہوئے۔ امسال اجلاسوں کی صدارت استاذ الادباء، نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی نے فرمائی۔ اُردو ادباء شعراء اور علماء کی بہت بڑی تعداد جلسوں میں شریک تھی۔ تقریریں ہوئیں، مقالے پڑھے گئے، اور ڈاکٹر رضی الدین صاحب کی یہ تجویز کہ ایک اُردو یونیورسٹی قایم کرنے کا کام انجمن ترقی اُردو شروع کرے۔ بالاتفاق منظور ہوئی۔ یہ کام جس قدر جلد انجام پائے اُتنا ہی بہتر ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے پچھلے پچیس سال کے عرصہ میں ثابت کر دیا ہے کہ مختلف جدید و قدیم علوم کا اُردو میں پڑھانا نہ صرف ممکن بلکہ ہر پہلو سے ہمارے لئے مفید اور ازبس ضروری ہے تعلیم کا مقصد کچھ بھی قرار دیا جائے لیکن غیر زبان میں تعلیم کے جواز کی کوئی دلیل نہیں دیجا سکتی، ہندوستان بھر بہت سی یونیورسٹیاں ہیں لیکن ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ وہاں اُردو زبان کی تعلیم کے لئے بھی ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ گویا یوں سمجھئے کہ بچہ کو ماں باپ کی زبان سمجھانے کے لئے انگلستان سے گورنس بلائی جاتی ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی صحیح الدماغ یہ اُمید کر سکتا ہے کہ ہمارے بچے اِن یونیورسٹیوں سے جن علوم کی سند لے کر نکلتے ہیں اُن میں وہ کمال حاصل کر سکیں گے جو ملک کو آگے بڑھانے میں ہماری امداد کر سکے۔

اُردو یونیورسٹی

ہم نہیں جانتے کہ مجوزہ اُردو یونیورسٹی کہاں قایم کی جائے گی۔ لیکن ہماری مخلصانہ رائے ہے کہ اس کے لئے پنجاب کا کوئی مقام، بلکہ بہتر ہے کہ لاہور کو تجویز کیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی بہت سی یونیورسٹیاں ملک کے مختلف مقامات پر قایم ہونی چاہئیں، لیکن اس پہلی یونیورسٹی کے لئے ہم بہ چند وجوہ دہلی سے بھی زیادہ لاہور کو مناسب مقام سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ اِس کے بعد دوسری جگہ بھی ایسی یونیورسٹیاں قایم ہونگی لاہور میں ایک اُردو یونیورسٹی قایم ہو گئی تو شمالی ہند کے طلبہ کے لئے ایک سرچیون چشمہ کا کام دے گی جہاں سے یہ اپنی ادبی زندگی کے لئے مایۂ حیات حاصل کر سکیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج جامعہ عثمانیہ جنوبی ہند کے لئے چشمہ حیات بنی ہوئی ہے۔

اُردو کانفرنس جامعہ عثمانیہ

طلبائے جامعہ عثمانیہ کی بزم اُردو نے بھی ایک اُردو کانفرنس منعقد کی۔ حسن اتفاق سے اُردو زبان کے مسلّم الثبوت اور ہندوستان کے مایۂ ناز فاضل علامہ سید سلیمان ندوی اِن دنوں حیدرآباد میں مقیم ہیں اگرچہ حضرت علامہ کی صحت اِن دنوں اچھی نہ تھی مگر اس بزرگانہ شفقت کی بناء پر جو ہمارے بزرگوں کا نمایاں وصف ہے، علامہ نے طلباء کی درخواست کو رد نہیں فرمایا۔

کانفرنس کے دو اِجلاس ہوئے، پہلے اجلاس کی صدارت عالیجناب نواب سر مہدی یار جنگ بہادر صدر المہام

تعلیمات سرکارعالی اور معین امیر جامعہ عثمانیہ نے فرمائی - اس اجلاس میں متعدد مقالے پڑھے گئے، محمد علی صاحب نیر نے نظم پڑھی جو بہت اچھی تھی، مولوی عبدالقیوم خاں صاحب باقی استاذ ادب اُردو جامعہ عثمانیہ نے نہایت ہی پُراز معلومات اور بہت ہی سلجھا ہوا تنقیدی مقالہ پڑھا، آخر میں علامہ سید سلیمان ندوی نے اُردو زبان اُس کی ساخت اور اس کی رفتار ترقی پر ایک تقریر فرمائی - تقریر کا ہر جزء فاضل مقرر کے عمیق مطالعہ اور وسیع نظر کو ظاہر کر رہا تھا - سب سے زیادہ مفید وہ نصیحتیں تھیں جو علامہ نے نوجوان اَدیبوں کو فرمائیں -

دوسرے اجلاس کی صدارت ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ نے فرمائی اس میں بھی اُردو زبان کے اِرتقاء اور تنقید سے تعلق مفید مضامین پڑھے گئے -

اُردو کانفرنس پنجاب ایک عظیم الشان اُردو کانفرنس کے انعقاد کی تیاریاں پنجاب میں ہو رہی ہیں، ہمیں اُمید ہے کہ مخلص کارکنوں کی مساعی جمیلہ ضرور بارور ہونگی - اس قسم کے اجتماعات سے خدمت زبان و ادب کی ایک لگن سی پیدا ہو جاتی ہے، انھیں کبھی بے کار نہیں سمجھنا چاہیئے - آہنگ عمل کا وجود عمل سے پہلے ضروری ہے اور آہنگ عمل خود اپنے وجود کے لئے ایسے اجتماعات کا مرہون منت ہے -

---

رسالہ نگار جدید ادب نمبر پچھلے دنوں اُردو زبان کے مشہور رسالہ نگار کا ایک ضخیم خاص نمبر شائع ہوا، یہ پورا نمبر نگار کے خاص نمبروں کی روایات کے مطابق ایک ہی موضوع پر ہے، وہ موضوع ہے جدید ادب نمبر مضامین فاضلانہ اور اعلیٰ معیار کے ہیں - جدید ادب کے گمراہ شیدائی اپنی ہفوات کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ پُرانے قسم کے مولویوں اور پنڈتوں کے علاوہ خدانخواستہ ساری اُردو دنیا اسے پسند کرتی ہے لیکن نیاز صاحب اور نگار کی مذہبی دشمنی تو اتنی مسلم ہے کہ کوئی اُن پر مولویت اور پنڈت پن کا الزام شاید بدرجۂ ہوش و حواس کبھی نہ لگا سکے گا - غالباً بہتوں نے حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھا ہوگا کہ "ترغیبات جنسی" کے مصنف بھی جدید ادب کی بے حیائی اور ادبی گمراہیوں سے متنفر ہیں - اس نمبر میں اُردو زبان کے جلیل القدر اُدباء اور نقادین کے سنجیدہ اور عالمانہ مضامین ہیں، اور جدید ادب پر اتنا کچھ ہے کہ اس موضوع پر اب کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی -

رسالہ کتاب خاص نمبر کتاب خانہ پنجاب اور اُردو بک اسٹال کے اس رسالہ کی بنیاد پروفیسر سرور نے رکھی تھی، ہمیں اس وقت افسوس ہوا تھا جب کہ پروفیسر سرور اس سے علیحدہ ہو کر تعلیمی مشاغل میں مصروف ہو گئے تھے، لیکن اُردو بک اسٹال اور رسالہ کتاب کے صاحب نظر مالک جناب ایم ظہیر الدین صاحب نے اس کی افادیت میں فرق نہ آنے دیا، اور حضرت شوکت تھانوی جیسے نقاد و مبصر کی خدمات حاصل کرلیں -

اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ رسالہ کے مطالعہ سے اُردو زبان کے بہترین اور قابل مطالعہ مطبوعات کے انتخاب میں مدد مل سکے - جدید مطبوعات کے تعارف اور اُن کے متعلق ایسی مبصرانہ رائے دی جائے جو ذوق مطالعہ کی رہبری کر سکے - اس خاص نمبر کو دیکھ کر ہم اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ جناب ایم ظہیر الدین صاحب کا ذوق عمل کامیابی کے ساتھ اس رسالہ کے ذریعہ اُردو ادب کی وہ خدمت انجام دے رہا ہے جو اس سے مقصود ہے - خصوصاً جناب

شوکت تھانوی کا مطالعہ بڑی دلچسپ اور بڑی مفید چیز ہے۔

نئے سال کے ساتھ "رفتارِ اَدب" کا جائزہ لیتے ہوئے اِس صحبت میں ذرا کسی قدر تفصیل کے ساتھ اُردو کے چند دارالاشاعتوں پر نظر ڈالنا مناسب ہوگا۔

اُردو بک اسٹال | پنجاب کے ناشرین میں ممتاز دارالاشاعت ہے جس نے "شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک" جیسی بیش بہا کتاب شایع کی ہے ظہیرالدین صاحب کتابوں کی تیاری اور انتخاب میں ذوقِ سلیم رکھتے ہیں، اُن کی شایع کی ہوئی کتابوں کا سرورق، گرد پوش اور جلد عموماً بہترین اور اعلیٰ قسم کی ہوتی ہے۔ بڑی خوبی اور نہایت سنجیدگی سے خدمات انجام دے رہے ہیں کتابوں کے اِنتخاب میں افادیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے اس ادارہ کی جدید کتاب "شیش محل" جناب شوکت تھانوی کی تصنیف ہے، اور اپنے قسم کی یکتا کتاب ہے، اِس میں شوکت صاحب نے تقریباً ڈیڑھ سو اشخاص کے قلمی چہرے اپنے خاص انداز تحریر میں لکھے ہیں۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔

اُردو اکاڈیمی لاہور | چودھری محمد حنیف صاحب کے ذوقِ سلیم نے اردو اکاڈیمی کی کارگذاری اور خدمت کو امتیاز بخشا ہے۔ یہاں سے اچھی اور نفیس کتابیں شایع ہوئی ہیں۔ اور خصوصاً اُن کی کتاب دروازہ مصنفہ کرشن چندر اور رنگ و بست مصنفہ نواب جعفر علی خاں اثر بڑی عمدہ ادبی کتابیں ہیں۔

مکتبۂ اُردو | یہ وہ دارالاشاعت ہے جس کی خدمات ناقابل انکار اور جس کے کارنامے ماوراء شک و شبہ، اُس نے قدیم و جدید اَدب کی بیش بہا کتابیں اچھی طرح چھاپ کر پیش کیں۔ اور اُردو ادب کے پرستاروں کے لئے بہت سی کتابوں کو قابل حصول بنا دیا۔ لیکن ان خدمات کا اِعتراف کرتے ہوئے بھی ہم مالکان مکتبۂ اُردو کو مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ نام نہاد ادب جدید کے عریاں اور اخلاق سوز افسانوں کی اِشاعت سے اِحتراز کر کے اپنی خدمات کو اس آلایش سے محفوظ رکھیں۔

مکتبۂ جدید | یہ ناشرین پنجاب کی محفل کا جدید رکن ہے۔ اِس نے صرف ایک سال میں کئی کتابیں شایع کی ہیں اُنھیں دیکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ۔ ع

سالے کہ نکو است از بہارش پیدا

سندھ ساگر اکاڈیمی | اِس ادارہ کی پہلی کتاب "عبید اللہ سندھی" ہے جس میں مولانا عبید اللہ سندھی کے حالات اور اُن کے سیاسی افکار پر بحث کی گئی ہے، یہ کتاب پروفیسر سرور کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ کتاب اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار سے بہترین تصانیف میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

نارائن دت سہگل | یہ وہ ناشر ہے جس نے تیرتھ رام فیروز پوری کی تصانیف پیش کی ہیں، یہ تصانیف اِتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ اُن کا شمار شاید خود کارکنان فرم بھی بتا سکتے ہوں۔ ضرورت ہے کہ یہ فرم اپنی مطبوعات کے ظاہری و معنوی معیار کو کسی قدر اور بلند کرے۔

نقلی پریم چند | پنجاب میں کچھ دنوں سے ایک نقلی پریم چند بھی پیدا ہو گئے ہیں، یہ بزرگ فطرت نگار پریم چند بی۔ اے کے نام سے کہانیوں کے مجموعے شایع کرتے ہیں۔ یہ بڑی چھوٹے درجہ کی

بات ہے، ہمارے لکھنے والوں کو چاہیئے کہ محنت کر کے اپنے آپ کو اہمیت اور شہرت دیں۔ دنیا میں شہرت اور عزت بغیر محنت نہیں حاصل ہوتی، منشی پریم چند آنجہانی نے بھی اسی طرح ادب میں وہ مقام حاصل کیا تھا جسکی یہ نقال صاحب تمنا کر رہے ہیں۔ ذہنی اعتبار سے یہ بہت ہی ذلیل حرکت ہے کہ کسی دوسرے کی شہرت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے تلبیس شخصی کا ارتکاب کیا جائے۔ دنیا میں جو اسباب منشی پریم چند کے لئے شہرت و عزت کے مہیا ہوئے تھے وہ اِن نقال صاحب کے لئے بھی مہیا ہو سکتے ہیں، یہ دون ہمتی اور کم ظرفی ہے کہ محنت کر کے اپنا مقام پیدا کرنے کی بجائے نقالی کو پیشہ بنایا جائے۔

نہیں وابستہ زیرِ گردوں کمال شان سے سکندری تمام ساماں ہیں میسر تو بھی آئینہ سا زہو جا

دہلی اور حیدرآباد کے ناشرین دہلی اور حیدرآباد کے ناشرین کے متعلق کچھ لکھنے کی گنجائش اس نمبر میں نہ نکل سکی، انشاء اللہ آئندہ پرچے میں ہم ان دو مراکز کے متعلق لکھیں گے۔

ہمارا پروگرام اِس ناموافق زمانہ میں بھی ادارۂ اشاعت اُردو نے صرف ایک سال کے اندر جو خدمات انجام دی ہیں وہ ایسی نہیں کہ ہم بیان کریں بلکہ وہ ایسی ہیں کہ آپ محسوس فرمائیں۔ ع

مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید

ہماری جنوری و فروری ۱۹۴۴ء کی کتابیں حسبِ ذیل ہیں

(۱) زندگی کی ٹھوکریں .... رئیس احمد جعفری
(۲) کردار (ناول) .... ماہر القادری
(۳) سیلاب .... احمد ندیم قاسمی
(۴) انگڑائیاں .... احمد ندیم قاسمی
(۵) ضربیں .... قیسی رامپوری
(۶) زلزلے .... قدوس صہبائی
(۷) کروٹیں .... قدوس صہبائی
(۸) پریم پجارن .... قدوس صہبائی
(۹) مجاہد بخارا (امیر بخارا) ....
(۱۰) ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر .... قدوس صہبائی
(۱۱) مردِ انقلاب (شہزادہ کروپاٹکن) .... قدوس صہبائی
(۱۲) موجیں .... کوثر چاند پوری
(۱۳) بچوں کا سٹ (۶ کتابیں) .... خورشید جامی

مخلص
محمد اقبال سلیم ہندی

اس ماہ کی تازہ تصنیفات

زلزلے قدوس صہبائی بی۔اے (آنرز) افسانوں کا مجموعہ۔
ملکوں میں زلزلے آتے ہیں۔ تو در و دیوار اور دشت کانپتے ہیں۔ لیکن جب دلوں اور دماغوں میں آتے ہیں۔ تو تمدن کی بنیادیں اور تہذیب کی سر بفلک عمارتیں کانپتی ہیں۔ ادیب کے ذہن رسا اور خیالات کی دنیا میں جب زلزلے آتے ہیں تو ان کی لرزشیں صفحہ قرطاس پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ اور نقش نگار عالم کی لرزش کا سبب بن جاتی ہیں۔ ایسے ہی چند بیش بہا لرزشوں کے نقش آج آپ کے سامنے پیش ہیں۔ کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد رنگین گرد پوش قیمت دو روپیہ بارہ آنے۔

سیلاب احمد ندیم قاسمی (افسانوں کا مجموعہ)
قاسمی واقعہ کا انتخاب زندگی سے کرتے ہیں۔ دُکھ درد سے کراہتی زندگی، مسرت کے آغوش میں ہنستی کھیلتی زندگی، محبت میں بیقرار اور غم روزگار سے گھری ہوئی زندگی، جس میں لوگ چوٹ کھاتے ہیں۔ چوٹ دیتے ہیں، روتے بسورتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں۔ کامیاب ہوتے ہیں۔ ناکام رہتے ہیں۔ فرشتے بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ شیطان بن جاتے ہیں۔ لغزش کھا کر گرتے ہیں۔ سنبھل جاتے ہیں۔ قاسمی نے ایسے ہی خاکوں میں رنگ بھرا ہے۔ اور اپنی نقوش کو اُبھارا ہے۔
کتابت طباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت۔ تین روپیہ آٹھ آنہ

انگڑائیاں منتخبہ احمد ندیم قاسمی (افسانوں کا مجموعہ)
یہ مجموعہ ہندوستان کے پندرہ مشہور افسانہ نگاروں کے شاہکار افسانوں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ ان افسانوں کا منتخب کرنے والا خود بھی افسانہ نگاروں کی اس نئی جماعت میں شامل ہے۔ اس لئے اس کی نگاہ انتخاب کی صحت مسلّم ہے۔
اس مجموعہ میں عریاں ادب کو دخل ہے نہ بے محل تقریر بازی کو، یہ افسانہ زندگی کے اس ہیرے کے مختلف پہلو ہیں۔ جسے اُردو افسانہ نگاروں نے تراشا۔ کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد رنگین گرد پوش قیمت تین

زندگی کی ٹھوکریں۔ رئیس احمد جعفری۔ (افسانوں کا مجموعہ)
ان افسانوں کا ہر افسانہ زندگی کا آئینہ دار ہے۔ وہ زندگی جو ہم سب گزار رہے ہیں۔ جو ہم سب کے سامنے گزر رہی ہے۔ جسے ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ جس کا نغمہ اور نوحہ ہمارے کان زور سے سنتے رہتے ہیں۔ جس کی ناکامی اور حرماں نصیبی پھر جس کی کامیابی اور کامرانی ہمارے دماغ میں بسی رہتی ہے۔ جسے ہم کبھی یکسر خندۂ و قہقہہ اور کبھی آہ و بکا کی صورت میں دیکھتے ہیں۔
کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گرد پوش۔ قیمت تین روپیہ

تقدیریں از منظور بخاری۔ بی۔ اے۔
انسانی زندگی میں کیسے کیسے جوہر پوشیدہ ہیں۔ اور دنیا میں انسان نے کیسی کیسی مشکلات پر قابو پاکر ترقی کی، بڑے بڑے انسانوں کی ایجادیں اور تصنیفیں کس طرح ظہور پذیر ہو سکیں۔ وہ کیا حالات ہیں جس سے کسی انسان میں بڑا بننے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ کیوں اور کس طرح کوئی انسان یک بہ یک ہماری نگاہوں میں ممتاز شخصیت بن جاتا ہے۔ ایسے روح پرور سوالات کا جواب آپ کو **تقدیریں** دے سکتی ہیں جس سے آپ پر ظاہر ہوگا کہ کس طرح آج کا حقیر پیشہ ور کل کا ذی قوت انسان بن گیا ——— قیمت ایک روپیہ

کروٹیں قدوس صہبائی بی۔ اے (آنرز) (افسانوں کا مجموعہ)
کروٹیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ درد بھری زندگی بھی کروٹیں لیتی ہے، اور مچلتی ہوئی جوانی بھی، زمین بھی کروٹیں لیتی ہے اور آسمان بھی، دنیا کروٹیں لیتی ہے تو زار و زاریت تہ و بالا ہو جاتی ہے اور آسمان کروٹیں لیتا ہے تو آبادی ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہے۔
قدوس صہبائی نے ایسی بہت سی محسوس وغیر محسوس کروٹیں افسانوں کی شکل میں صفحات پر مُرتسم کی ہیں اور کس وقت میں کی ہیں جب کہ خود مصنف جیل خانہ کی تنگ و تار کوٹھری میں بے تابی کے ساتھ کروٹیں لے رہا تھا ———← (زیرِ طبع)

کردار از ماہر القادری (ناول)
کردار نگار کا معجزہ نفسیاتی تحلیل کا نقش رنگین، انسانی زندگی کی صحیح تفسیر، پاکیزہ محبت، دلچسپ رومان۔ تہذیب مغربی پر چھبتی ہوئی طنز سوسائٹی کی سچی تصویر۔
کتابت وطباعت اعلیٰ۔ مجلد۔ رنگین گردپوش۔ قیمت۔ دو روپیہ آٹھ آنے۔

پریم پجارن قدوس صہبائی۔ بی۔ اے۔ (آنرز)
ایک دلدوز افسانہ جو آپ سے آنسوؤں کا خراج حاصل کئے بغیر نہ رہے گا۔
کتابت وطباعت اعلیٰ ——— قیمت چودہ آنے

مردِ انقلاب قدوس صہبائی۔ بی۔ اے۔ (آنرز)
روس کے انقلابی شہزادہ کروپاٹکن کے حالات۔ قیمت۔ بارہ آنے

بخارا کا جمہوری انقلاب قدوس صہبائی بی۔ اے (آنرز)
سلطنت بخارا کے آخری تاجدار **امیر عالم جان** کے خود نوشت حالات جس میں توپوں کی گرج۔ بالشویک انقلاب اور ردِ انقلاب کے ہنگامے آپ اپنی آنکھوں کے سامنے سے گذرتے دیکھیں گے ——— قیمت۔ بارہ آنے

ترکستانی خاتون شاہراہ انقلاب پر قدوس صہبائی بی۔ اے۔ (آنرز)
ترکستانی خاتون کس طرح انقلاب کے ہاتھوں ذلت اور پسماندگی کی گہرائیوں سے نکلی۔ اور اس کے نجات دہندوں کو کیسی کیسی مصیبتیں اٹھانا پڑیں۔ قیمت۔ بارہ آنے

حضرت فراق گورکھپوری

فردوسِ نظر

اک برقِ نظر میری طرف اے گلِ خنداں
اِک موجۂ نکہت اِدھر اے جانِ گلستاں

بس ایک کرن ڈال سرِ دامنِ ہستی
اِک چھوٹ سی پڑ جائے اِدھر اے مہِ تاباں

لہرائی ہوئی قوسِ قزح قامتِ رنگیں
اُٹھتے ہیں قدم یا لہک اُٹھتا ہے گلستاں

اک لوچ بھری لے ہے تری نرمیٔ رفتار
سینے میں جوانی کے اُبھرتے ہوئے طوفاں

سیّال شفق مارتی ہے موجوں پہ موجیں
اک رنگ کا طوفاں ہے کہ ہے جوشِ بہاراں

پو پھوٹ رہی ہے زِ جبیں تا بہ کفِ پا
یا چادرِ شبنم میں جھلکتا ہے گلِستاں

آنکھوں میں جوانی کی چمکتی ہوئی بجلی
سینے میں محبت کے مچلتے ہوئے ارماں

شوخی جو حیا کے بھی دبائے نہیں دبتی
لو دیتا ہے کیا کیا یہ چراغِ تہِ داماں

آگے ترے اے شوخ یہ عالم ہے کہ گلزار
اِک رنگ پریدہ ہے کہ اِک لوئے پریشاں

یہ مست ادائیں ہیں کہ کعبے پہ گھٹا چھائی
یہ موجِ تبسم ہے کہ مندر میں چراغاں

تو تیرگیٔ شام بھی تو نورِ سحر بھی
مستی بھی ہے چھائی ہوئی چہرہ بھی درخشاں

تاروں کی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے فسانے
لیتے ہیں ترے حسن سے کیفیتِ پنہاں

ہر جنبشِ دامن سے سنکتی ہیں ہوائیں
کیا لغزشِ مستانہ ہے اے سروِ خراماں

ہر سانس کوئی جھکی ہوئی نرم سی لے ہے
لہراتا ہوا جسم ہے یا ساز ہے لرزاں

یا مد بھری پروائی میں رس ڈول رہا ہے
یا مست اداؤں میں ہے اِک لہر سی رقصاں

چہرے سے عیاں صبحِ درخشاں کی بہاریں
گیسو میں نہاں تیرگیٔ شامِ غریباں

لرزش سی ہے راہوں میں زہے شوخیٔ رفتار
جنبش سی ہے نظروں میں کہ ہے گردشِ دوراں

تو پاس سے گزرا کہ لپٹ مشک کی آئی
اے دوست جھکتی ہیں ابھی تک وہ فضائیں
ہونٹوں میں دبے خندۂ پنہاں کے شرارے
باتوں میں ہیں جی اٹھنے کو مردوں کو اشارے
عارض کی جھلک ہو کہ چھلک جاتے ہیں ساغر
ابرو کی لچک ہو کہ لپک جاتی ہے شمشیر
رگ رگ میں کسک ہو کہ اک آئی ہوئی انگڑائی
چہرے کی مہک رو کشِ خوشبوئے گلِ خلد
اس نرم نگاہی سے چمک اٹھتا ہے اے دوست
اے دوست یہ تو ہی ہے جسے دیکھ رہا ہوں

بچتی ہوئی نظریں تھیں کہ آہوئے گریزاں
جن میں تھا کھلا تیرے تبسم کا گلستاں
آنکھوں میں زمانے کے بدل دینے کا ساماں
گھاتوں میں ہیں دنیا کے مٹا دینے کے امکاں
ماتھے کی دمک ہے کہ طلوعِ مہِ تاباں
گیسو کی لٹک ہے کہ گھٹائیں ہیں خراماں
سینے کی چھلک ہو کہ لہکتا ہے گلستاں
باتوں کی چہک جلوۂ وہ لعلِ بدخشاں
وہ ذرہ جو انساں کو بنا دیتا ہے انساں
یا خواب ہے شاعر کا کوئی شعلہ بداماں

پڑتے ہی نظر تجھ پہ محبت نے پکارا
نکلا مری قسمت کو جگا تا مہِ تاباں

ادب اور انقلاب

ڈاکٹر اختر حسین رائپوری

اردو کے ادبی انقلاب کے سب سے ممتاز علمبردار کے ان مقالوں کا مجموعہ جنھوں نے ہماری تنقید نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ اس مجموعہ میں وہ تاریخی مقالہ ادب اور زندگی شامل ہے جس نے ادبی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی اور ترقی پسند تحریک کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے ساتھ بنگال کے باغی شاعر قاضی نذرالاسلام اور سوویٹ روس کے ادب پر وہ سیر حاصل مضامین ہیں جنھوں نے ہمارے شاعروں اور ادیبوں کے دل و نگاہ کو وسعت بخشی کتاب کے شروع میں ایک اعلان نامہ ہے جو پنڈت جواہر لال نہرو، منشی پریم چند مرحوم، مولوی عبدالحق اور مصنف کی طرف سے شائع ہوا تھا

قیمت:۔ تین روپیہ آٹھ آنے جلد رنگین گرد پوش کاغذ طباعت اعلیٰ

صمد رضوی

جدید شاعری پر ایک نظر

شاعری کے مفہوم کو معین کرنے کے بعد اب جدید شاعری کو اپنے سامنے رکھ کر اس کا تصفیہ کرنا چاہیئے کہ آیا یہ شاعری اِس مفہوم پر پوری اُترتی ہے؟

جدید شاعری کے نمونوں سے آج کل کے اَدبی رسالے پٹے پڑے ہیں اور میں اِس کی چند مثالیں "جامعہ" میں دے چکا ہوں۔ لیکن بیجا نہ ہوگا اگر چند مثالیں یہاں بھی پیش کردی جائیں۔

"سیّد احمد ملک" اپنی ایک نظم "اجمیری دروازہ" میں فرماتے ہیں کہ

شام کو اجمیری دروازے کے پاس۔
اُنھیں خونخوار درندوں کا شکار۔
"مرد" ہونے پہ جنھیں ناز ہوا کرتا ہے۔
محفلِ رقص
جو آراستہ ہوتی ہے۔
کبھی
تو یہ للچائی ہوئی نظروں سے جھکے ہوتے ہیں۔
تیری عظمت کے نشانوں کا یہی دور تو ہے۔

"اجمیری دروازہ" کا یہ ایک حصہ ہے۔ نظم کا دوسرا حصہ اِس سے زیادہ مہمل اور بے معنی ہے۔ اِس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ "عنوان" سے اُسے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس نظم کا عنوان بجائے "اجمیری دروازہ" کے "چار مینار" رکھدیا جائے تو جب بھی وہ مقصد حاصل ہو جائیگا جس کو شاعر موصوف حاصل کرنا چاہتے ہیں اِس لئے کہ جدید شاعری میں جس طرح معنی و مطلب سے کوئی سروکار نہیں اِسی طرح اِس امر کا بھی نہ کوئی لزوم ہے، اور نہ اس کی ضرورت کہ عنوان اور نظم میں کوئی باہمی رشتہ پیدا کیا جائے ممکن ہے کہ اِس تصور کی تائید میں یہ جذبہ کام کر رہا ہو کہ عنوان اور نظم میں باہمی ربط پیدا کرنا قدیم شاعروں کا طریقہ رہا ہے۔ جدید شاعر جو بلا شبہ اِنقلاب پسند ہے، اور ماضی کے خلاف سخت ترین جہاد کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ پرانے بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرے چاہے یہ آزادی کتنی ہی بے تکی اور بے معنی کیوں نہو۔

مخمور جالندھری اپنی ایک نظم "تضیعِ اَوقات" کی ابتدا اِس طرح فرماتے ہیں کہ ؎

آئے نہیں خوش پوش، خوش اَطوار مرے دوست
تکتا ہوں میں بیٹھا ہوا رہ دیر سے اُن کی
اکثر مجھے ہو جاتی ہے کہا نسی کی شکایت
پی لیتا ہوں رنگین لمونیڈ کے دو گھونٹ

اِس نظم میں شاعر موصوف ایک عالیشان ہوٹل میں بیٹھے ہوئے اپنے خوش اطوار دوست کی آمد کا اِنتظار فرما رہے ہیں۔ اور غالباً جس وقت وہ یہ نظم لکھ رہے تھے اُس وقت

یا جس وقت وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے اس وقت وہ کہاں سی کی شکایت میں مبتلا تھے۔ بہرحال اِن دونوں قیاسات میں سے جو قیاس بھی صحیح ہو، اُن کے تخیل کی پرواز ملاحظہ فرمائیے کہ یکایک ہوٹل کے سامنے والے مکان کی ایک کھڑکی کھلتی ہے اور ؎

کیا دیکھتا ہوں شہر کی دوشیزۂ چالاک
ایک چیتھڑا جس پر ہیں جواں خون کے دھبے

کھڑکی میں سے لوگوں کی "نظروں سے بچاکر" پھینک رہی ہے۔"

میں نے پُوری نظم کو اس لئے نہیں لکھا کہ میں تنقید میں بھی ایسی بداخلاقی، بدتمیزی، اور گندہ ذہنی کو روا نہیں رکھتا جس پر شاعر موصوف نے فکر فرمائی ہے۔ یہ نیا شاعر جو سماجی قوانین میں اصلاح کا نہیں، بلکہ انقلاب کا مطالبہ کر رہا ہے، کن اخلاقی تصورات کا حامل ہے اس کا کیقدر اندازہ اس نظم سے کیا جاسکتا ہے۔ خواہ یہ نظم جدید شاعری کا ایک مکمل نمونہ ہو یا نہ ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ شاعر کی ذہنی عیاشی اور گندگی اُس کے ایک ایک لفظ سے نمایاں ہو رہی ہے۔ شاعر موصوف نے زندگی کا یہ تجربہ اور مشاہدہ حاصل کرنے کے لئے بلاوجہ اپنے "مکان" سے ہوٹل تک زحمت فرمائی۔ ورنہ اُس کے بغیر بھی وہ اِس کا "علم" حاصل کرسکتے تھے۔

سید احمد رضی ترمذی اپنی ایک نظم "مشورہ" میں ایک نادان حسینہ سے اِس طرح مخاطب ہوتے ہیں کہ ؎

تیرا اُبھرا ہوا سینہ، تیری آنکھیں، تیرے ہونٹ
کیوں عطا تجھ کو ہوئے ہیں کبھی سوچا تو نے
دیکھ کس طرح پریشان ہیں تیری زلفیں
آج اُن کو مرے سینہ پہ بکھر جانے دے
دل میں جو حشر بپا ہے تجھے کس طرح دکھاؤں
غم و اندوہ کے شعلے ہیں رگوں میں لرزاں
خوں پینے دے مئے ناب مجھے ہونٹوں سے
تیری عصمت کی قسم رُوح جلی جاتی ہے

جہاں تک معنی و مطلب کا تعلق ہے، اِس نظم میں یقیناً ایک مرکزی خیال موجود ہے۔ اور اُس کے معنی بھی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب اِس قسم کے شاعر غزل گو شعراء پر یہ کہہ کر حملہ کرتے ہیں کہ اب "زمانہ کو عشق و محبت کی فرسودہ اور بار بار کی دُہرائی ہوئی شاعری کی ضرورت نہیں، ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں بھوکے انسانوں کے پیٹ کی آگ جذباتِ محبت کی شاعری سے دُور نہیں کی جاسکتی" تو کیا اُن سے یہ دریافت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ انقلاب پسند شاعر ایسی ہی شاعری سے ہندوستان کی بھُوک اور افلاس کو دُور کرسکتے ہیں۔ کیا یہی "نیک مشورے" دے کر ہندوستانی لڑکیوں کو انقلاب میں حصہ لینے کے لئے تیار کیا جائے گا۔ کیا یہی وہ نئی شاعری ہے جو موجودہ دور کے ناگزیر تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اور کیا یہی وہ اَنوکھے اور نادر خیالات عالیہ ہیں، جن سے اُردو شاعری اَب تک محروم تھی؟

اُردو شاعری میں "معاملہ بندی" کو جو درجہ حاصل ہے۔ اُس کے اظہار کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے شاعروں نے نہایت ہی لطیف اشاروں، اور بلیغ کنایوں میں جنسیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر نیا شاعر اسی موضوع پر ذرا کھل کر "اظہار خیال" کرنے کا عادی ہے اور چونکہ انقلاب پسندی کا جذبہ اس کی رگ رگ میں خون بن کر دَوڑ رہا ہے اِس لئے شرم و حیاء کے تصورات جو بقول اس کے "مہمل اور از کار رفتہ ہوگئے ہیں" اُس کے رستہ میں حائل نہیں ہوسکتے۔

میرا جی اپنی نظم " دوسری عورت سے " کی اِبتداء اِس طرح فرماتے ہیں کہ

میں تھکا ماندہ مسافر ہوں چلا جاؤں گا
اِک گھڑی راہ میں تم مجھ کو بسر کرنے دو
ایک ہی پل کے لئے چاند ستارے بادل
پہلے آکاش پہ آتے ہیں، چلے جاتے ہیں
ایک ہی پل کے لئے راہ میں ہر پیڑ کی چھاؤں بھی گھنی ہوتی ہے
زیست کی راحتیں، ایک پل کے لئے ایک اشارہ سا کئے جاتے ہیں
وغیرہ

نظم کے عنوان اور پہلے شعر کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر موصوف شادی شدہ ہیں اور سفر کی حالت میں ایک اجنبی عورت سے یہ استدعا کر رہے ہیں کہ " میں تھکا ماندہ مسافر ہوں اور ایک گھڑی بھر ٹھہر کر چلا جاؤں گا " لیکن دوسرے دو اشعار اس درجہ اَدق، اور فلسفیانہ انداز میں کہے گئے ہیں کہ باوجود انتہائی کاوش کے مُتعلق اُن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔

میرا جی اِس قسم کی شاعری میں اپنے وقت کے اِمام مانے جاتے ہیں۔ اور اس کی اشاعت میں آپ نے بڑا نمایاں حصہ لیا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہندوستان میں اِس شاعری کو منظر عام پر لانے کا سہرا صاحب موصوف ہی کے سَر ہے۔

جدید شاعری کے جو اعلیٰ نمونے میں نے اُوپر پیش کئے ہیں، کیا اُن پر کسی صورت میں شاعری کا اطلاق ہو سکتا ہے؟

شاعری کی جو تعریف میں پہلے بیان کر چکا ہوں یعنی حُسن کارانہ تصور، وجد آفریں تاثیر وغیرہ، کیا اُن میں سے کوئی خصوصیت بھی اِس قسم کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ کیا ایسی شاعری میں کوئی ایسا جذبہ یا خیال موجود ہے جو زندگی کو آگے بڑھانے کی طرف مائل ہو۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی صحیح الدماغ آدمی، جس کو شاعری میں تھوڑی بہت بھی شد بد حاصل ہو، اِس قسم کی خرافات، اور لغویات کو شاعری قرار نہیں دے سکتا۔

جدید شاعر جو حشرات الارض کی طرح ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اُبل پڑے ہیں، اُس سے زیادہ اپنی بوالہوسی کی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ایسی گندگی کو اُچھالنے اور عوام الناس میں پھیلانے کی ذمہ داری ان رسالوں، پرچوں، اور اخباروں پر ہے جو اس کی اشاعت میں اِنتہائی سرگرمی کے ساتھ مشغول ہیں۔ ملک کی ترقی یافتہ اَدبی رائے عامہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے غیر مہذب جدت پسند شاعروں کو جلد از جلد نیست و نابود کر دینے کی طرف متوجہ ہو جو اپنی ذہنی گندگی اور اخلاقی پستی سے سماج کو گھن لگا رہے ہیں۔ بلاشبہ ہندوستانی سماج میں ہزاروں خرابیاں اور خامیاں موجود ہیں اور اُن کو دور کرنا ہر مخلص شہری کا فریضہ ہے، لیکن اول تو سماج کی اِصلاح " شعرو شاعری " سے نہیں ہو سکتی اور دوسرے یہ کہ اِس قسم کی شاعری سے اِنقلاب کے لئے کوئی ذہنی فضا بھی پیدا نہیں کیجا سکتی۔

بدقسمتی سے ہر جدید شاعر اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہے کہ وہ ترقی پسند ہے اور اُس نے ہر " جدت " کو ترقی پسندی کا معیار قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ اِس غریب کو شاعری کے بالکل ابتدائی اور سطحی تصور سے بھی کوئی دور کا واسطہ نہیں۔

جدت پسند شاعری کی تائید میں جو دلیلیں، اور استدلال ان کی جانب سے پیش ہوتے ہیں اُن کا تجزیہ کرنے سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ دلیل، اور شاعری میں کوئی مناسبت موجود ہے۔ جس طرح عنوان اور نظم میں کوئی باہمی رَبط نہیں ہوتا اِسی طرح اُن کے دلائل اور موضوع بحث میں بھی کوئی منطقی رَبط نہیں پایا جاتا۔ اور یہی وہ مقام ہے

جہاں اُن کے دعوؤں کا کھوکھلا پن اپنی پوری بے بسی کے ساتھ عریاں ہو جاتا ہے۔

"عوامی اَدب"

کہا جاتا ہے کہ نئی شاعری عوامی خیالات و جذبات کی ترجمانی کرتی ہے؟

نئی شاعری کے جو نمونے میں نے اَب تک پیش کیے ہیں کیا اُن کے مطالعہ سے کسی طرح بھی اس دعویٰ کی تائید ہو سکتی ہے؟ کیا کسی نظم پر بھی اِس کا اِطلاق ہو سکتا ہے کہ وہ عوامی خیالات و جذبات کی آئینہ دار ہے؟ اول تو ہندوستان میں بسنے والے عوام الناس اتنے تعلیم یافتہ نہیں کہ وہ شاعری کے مفہوم کو کما حقہ سمجھ سکیں، اور اسکی تاثیر کو محسوس کر سکیں، دوسرے یہ کہ اگر بالفرض یہ "عوامی خیالات و جذبات ہیں" تو کیا اس کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ ایسے "عوامی خیالات وجذبات" رکھنے والے باشندے ہندوستان کے کس حصہ میں آباد ہیں؟ کیا اِن نظموں میں یو۔پی کے عوام الناس کے جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔؟ کیا مدراس اور صوبہ سرحدی کے کسان اور مزدور کے دل و دماغ میں ایسے ہی خیالات وجذبات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا اُڑیسہ اور راجپوتانہ کے عوام الناس اسی طرح سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں جس طرح کہ جدید شاعر سوچتے اور دیکھتے ہیں۔؟ میں سمجھتا ہوں کہ نیا شاعر عوامی شاعری کے موضوع کو اِس طرح محدود اور معین کر کے بحث کرنے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے کہ ہندوستان کے ہر حصہ کے معاشی، تاریخی، لسانی، حالات و روایات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن کی روزمرہ زندگی، رسم و رواج، آداب معاشرت، شادی بیاہ کے طریقے، نفسیاتی اور ذہنی ارتقاء ایک دوسرے سے اِس درجے مختلف اور متضاد ہیں کہ اُن کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ مدراسی کسان کو سرحدی کسان کی صف میں لاکر کھڑا کر دیا جائے۔ اور ٹریونڈرم کے مزدور کو بلوچی مزدور سے مماثلت دیجائے؟ میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کہ ایک مشترکہ خطرہ کے مقابلہ میں ہندوستانی عوام الناس کو ایک مرکز پر لانے اور اکٹھا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اور ہندوستان کے سیاسی اغراض اس کے طالب ہیں کہ وہ اپنی سیاسی غرض کو حاصل کرنے کے لئے متحد و متفق ہو جائیں۔ لیکن اس کا مطلب کسی صورت میں بھی یہ نہیں ہو سکتا کہ مختلف حصوں میں بسنے والے عوام الناس کے مابین جو تاریخی، لسانی، ذہنی اور نفسیاتی اختلافات موجود ہیں اُن کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں۔ اور اُن سب کے جذبات، احساسات، اور خیالات بالکل یکساں ہو گئے ہیں۔ ایسی سیاسی ہندوستانیت نہ تو ہندوستان میں کبھی پیدا ہوئی ہے، اور نہ آئندہ اس کا کوئی امکان ہے۔ مدراس اور صوبہ سرحد کے کسان کی نفسیات اور عادات و اطوار میں جو فرق موجود ہے، اور جس کے مختلف طبعی اور تمدنی وجوہات ہیں، وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہمیشہ قائم رہے گا۔ جب ہندوستان کی آبادی کا یہ عالم ہو کہ اُس کے ہر حصہ کا ماحول اور روایات دوسرے حصہ کے ماحول اور روایات سے مختلف ہیں تو پھر عوامی جذبات وخیالات کا پرفریب جال کہاں بچھایا جائے گا؟

ممکن ہے کہ مذکورۂ بالا بحث کے جواب میں یہ استدلال پیش کیا جائے کہ "عوامی خیالات" ہندوستان کے کسی خاص حصے کے عوام الناس کے خیالات نہیں ہیں۔ بلکہ پورے ہندوستان کے عوام الناس کے خیالات وجذبات ہیں پھر بھی یہ اعتراض باقی رہتا ہے کہ کیا واقعی ہندوستانی عوام کے جذبات و

وخیالات ایسے ہی ہوتے ہیں؟ کیا ہندوستانی عوام کا زاویہ نظر زندگی کے مسائل میں وہی ہے جو جدید شاعروں کا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی سنجیدہ آدمی ایسی نظموں کو جن کا میں ذکر کر رہا ہوں، ہندوستانی عوام کے جذبات وخیالات سے منسوب کرنے کی غلطی نہ کرے گا۔ اِس لئے کہ یہ شاعری نہ تو ہندوستانی ہے اور نہ عوامی بلکہ آزاد اقوام کے دسترخوان سے غلام بھکاریوں کے سامنے پھینکی ہوئی ہڈیاں ہیں۔ جن کو بھوکے اور مفلس غلام ــــــ ایسے غلام جن کی زندگی کا دارومدار ہی آزاد اقوام کی اندھی تقلید اور بہر قیمت اُن کی خوشنودی حاصل کرنے پر منحصر ہے، بھنبھوڑ رہے ہیں اور مزہ لے لے کر چبا رہے ہیں۔ مجھے اختر مدیر "نقش اولین" کی یہ رائے کہ "جس شاعری کو وہ عوامی ادب کے تحت پیش کرتے ہیں وہ خاص الخاص کی عقل وفہم سے بالاتر ہو جاتی ہے" اور باقی کی یہ رائے کہ "لوگ اکثر وبیشتر اپنے ذاتی خیالات، رجحانات اور احساس سے درگزر کر کے مانگے تانگے کے تاثرات اور اغیار کے خیالات پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا دوسروں کی خاطر اپنے رنگ کی قربانی کرتے ہیں تاکہ اُنھیں مقبولیت عامہ حاصل ہو اور مخالفت کم کی جائے" صحیح معلوم ہوتی ہے۔

جو آرٹ اور اَدب کے کسی خاص ماحول میں کسی خاص پروپگنڈہ کے تحت پروان چڑھتا ہے اُس کی بقاء اور استحکام اِسی ماحول اور اس کے محرکات کے زندہ اور باقی رہنے پر منحصر ہے۔ جہاں وہ مخصوص ماحول اور اس کے محرکات ختم ہو جاتے ہیں وہاں وہ آرٹ اور ادب بھی اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

جہاں تک میرے اَدبی معلومات کا تعلق ہے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سوائے دہقانی کے شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو عوامی شاعر کہا جا سکتا ہو۔ دہقانی آپ اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنتا۔ لیکن اِس کی شاعری کا غور سے مطالعہ کیجئے تو آپ یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ یہ وہ دیہاتیوں کی زندگی کی خصوصاً اور عوام الناس کی زندگی کی عموماً ترجمانی کرتا ہے۔ اُس نے دیہاتی زندگی میں جنم لیا ہے عوامی خیالات کی فضاء میں پرورش پائی ہے۔ سرمایہ دار اور ساہوکار کے مظالم کو عملی حیثیت سے محسوس کیا ہے غریبوں کی گود میں پلا ہے۔ مفلس اور بھوکے دیہاتیوں کی جھونپڑیوں میں راتیں بسر کی ہیں۔ اُس نے عوامی دل اور عوامی ذہن کے ہر جذبے اور ہر خیال کا مطالعہ کیا ہے۔ اُس کے کردار عوامی اور دیہاتی ہیں۔ اُس کی زبان، جنوبی ہند کے عوام الناس اور دیہاتیوں کی زبان ہے۔ اُس کی تشبیہات، اِستعارے، اندازِ فکر اور طرزِ بیان، سب کے سب عوامی اور دیہاتی ہیں۔ جس کی کامیاب مثالیں "دیہاتی بیوی کے خیالات" اور "بھایاں ہو ہوشار صبح ہو گئی ہڑی ہڑی" میں پائی جاتی ہیں۔ دہقانی بجا طور پر اس کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ عوام الناس کا شاعر ہے۔ لیکن جب جدید شاعر اِس قسم کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کا دعویٰ اِتنا ہی سچا معلوم ہوتا ہے جتنا کہ یہ احمقانہ اِستدلال کہ رند و ناسخ ہندوستان کے قومی شاعر تھے۔

جدید شاعری کو سَراہنے، اور اُس کی کمزوریوں پر

پردہ ڈالنے کے لئے، دوسرا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ " یہ دورِ عبوری کی شاعری ہے "۔ یہ ایک بڑا دلچسپ عذرِ لنگ ہے جس کی حقیقت اس سے بڑھ کر کچھ نہیں کہ " انگور کھٹے ہیں "۔ ہر شخص اس دشواری کو اچھی طرح محسوس کرتا ہے کہ قدیم طرزِ تفکر کو یکلخت چھوڑ کر کسی جدید طرزِ تفکر کی بنیاد نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس میں یقیناً ایک عرصہ لگے گا۔ اور اس عرصہ تک ایک غیر مانوس نیا پن، ایک بھونڈی اور کچی فکر کے آثار، غیر ارادی طور پر شاعری میں داخل ہوتے جائیں گے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جدید شاعر جان بوجھ کر غلطیاں کرتا جائے۔ دانستہ مہمل ترکیبیں استعمال کرتا رہے۔ ارادی طور پر اپنی نظم کو دیوانے کی بکواس بنا دے۔ اور پھر جب اس پر اعتراض کیا جائے تو وہ یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے بچنے کی کوشش کرے کہ " یہ تو دورِ عبوری کی شاعری ہے "۔ حالانکہ اگر وہ تھوڑی سی توجہ اور معمولی سی سمجھ سے کام لے تو اس کو " دورِ عبوری " سے گزرنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی۔

دورِ عبوری کے لٹریچر میں جو خامیاں، اور نقائص ہوتے ہیں وہ ادیبوں کے اختیاری اور ارادی نہیں ہوتے۔ مگر موجودہ دورِ عبوری کا انوکھا پن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے لٹریچر میں ادیبوں کی ارادی اور اختیاری کوشش کو بڑا دخل ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس "تک بند" کے منہ میں جو آیا وہ اس نے بک دیا۔ اور پھر جب اعتراض کیا گیا تو اس نے فوراً دورِ عبوری کے دامن میں پناہ لے لی۔

تیسرا استدلال اس شاعری کی حمایت میں یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اب زندگی کی قدریں بدل گئی ہیں اور شاعر کا زاویۂ نظر بھی تبدیل ہو گیا ہے۔ وہ زندگی اور کائنات کو اس طرح نہیں دیکھتا جس طرح قدیم زمانہ کا شاعر دیکھتا تھا۔

اس استدلال کے پہلے حصے میں اس وقت تک بحث نہ کروں گا جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو جائے کہ زندگی کی سابقہ اور حالیہ قدریں کیا ہیں اور ان میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ نوعی ہے یا فروعی۔ اور یہ حصہ راست میرے مضمون سے متعلق بھی نہیں ہے۔ البتہ دوسرا جزو میرے مضمون سے متعلق ہے۔ زمانہ کے معاشی، سیاسی، اور سماجی حالات بڑی سرعت سے بدلتے جارہے ہیں جس طرح ہر انسان فطری طور پر اپنے ماحول اور اس کے تقاضوں سے متاثر ہوتا ہے اسی طرح ایک آرٹسٹ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا چونکہ آرٹسٹ ایک حساس دل اور تیز مشاہدہ رکھتا ہے اس لئے اس کے اور دوسروں کے متاثر ہونے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ اور اسی لئے یہ ضروری نہیں کہ معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ برآمد ہوگا بالکل وہی نتیجہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد بھی برآمد ہو۔ اور نہ یہ ضروری ہے کہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے جو نتیجہ نکلے، وہ فلسفیانہ، یا معاشی اور سیاسی حیثیت سے بھی درست ہو۔ ڈاکٹر خلیفہ نے مجلۂ طیلسانین عثمانیہ کی جلد ششم بابتہ ۱۳۵۱ف کے شمارہ دوم میں " فلسفیانہ شاعری" کے عنوان پر جو مقالہ سپردِ قلم کیا ہے اس میں بڑی وضاحت اور عمدگی کے ساتھ " شاعرانہ نقطۂ نظر " کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اس مقالہ میں ایک مثال دی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ ایک باغ میں چار آدمی نظر آتے ہیں جو پھولوں کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک گل چین و گل فروش ہے جو پھولوں کو صرف اس خیال کے تحت دیکھ رہا ہے کہ بازار میں ان کی کیا قیمت آئے گی۔ اس کا تعلق پھولوں کے ساتھ " ایک عملی، مادی اور تاجرانہ تعلق ہے "۔ دوسرا شخص ماہرِ نباتات ہے۔

اُس کی غرض فقط علم ہے۔ وہ یہ غور کر رہا ہے کہ "یہ پھول کس قسم کے ہیں۔ کس صنعت کے تحت آتے ہیں۔ کس پھول میں کتنے قسم کے اجزاء یا عناصر ہیں۔ کس قسم کی زمین، کس قسم کی آب و ہوا، اور کس قسم کی کھاد کا اس پر کیا اثر ہوگا؟" اس کا مقصد گلچین کے مقصد سے زیادہ بلند ہے۔ تیسرا شخص جو فلسفی ہے وہ بھی پھولوں کو غور سے دیکھ رہا ہے "وہ یہ سوچ رہا ہے کہ فطرت میں یہ حسن آفرینی کہاں سے آئی۔ کثیف کیچڑ میں سے یہ لطفِ جمال کہاں سے پیدا ہوا۔ کثافت اور لطافت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ پھول کا حسن پھول میں ہے یا دیکھنے والے کی نظر اور اُس کے تاثرات میں۔ اس جمال سے ماہیتِ کائنات اور مقصدِ حیات پر کیا روشنی پڑتی ہے؟" وغیرہ۔ یہ انداز ماہر نباتیات کے انداز سے اتنا ہی بلند ہے جتنا کہ ماہر نباتیات کا انداز گل چین کے مقصد اور اس کے طرز عمل سے۔"

چوتھا شخص شاعر ہے۔ "پھولوں کے ساتھ اس کا تعلق پہلے تینوں حضرات کے مقابلے میں زیادہ گہرا اور زیادہ قریبی معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے تو کسی نہ کسی غرض کے تحت خواہ وہ عملی ہو یا علمی، پھولوں پر غور کر رہے تھے۔ لیکن یہ حضرت معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں سے باتیں کر رہے ہیں۔ چہرہ پر جذبات کی ہلکی ہلکی لہریں پڑ رہی ہیں وغیرہ۔

مذکورۂ بالا مثال سے مجھے یہ واضح کرنا تھا کہ شاعر کا نقطۂ نظر شاعرانہ ہوتا ہے نہ کہ معاشی، کاروباری اور فلسفیانہ۔ اور شاعرانہ نقطۂ نظر مشتمل ہوتا ہے، جذبات، وجدان، اور تاثر" پر ——

اسی طرح پروفیسر سروری نے بھی اپنی کتاب "جدید اردو شاعری" میں ایک نہایت ہی دلنشین مثال سے شاعرانہ نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کی مثال کا خلاصہ یہ ہے کہ "تین شخص گولکنڈہ کے انتہائی حصہ بالا حصار پر چڑھ کر قطب شاہی پائے تخت کے باعظمت آثار کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔ ایک شخص یہ غور کر رہا ہے کہ "یہ عمارت کتنے سو سال پہلے بنی ہوگی۔ ان میں جو مسالہ صرف ہوا ہے اُس کے لحاظ سے اُنہیں فطری طور پر کتنے عرصہ میں نیست و نابود ہو جانا چاہیئے۔ ان عمارتوں میں ظاہری شکل و صورت سے جو اختلاف ہے اُس کی وجہ وہ دریافت کرنا چاہتا ہے۔ گنبدوں کی شکلوں کے اختلاف سے اسے فن معماری کے ارتقا کا کچھ پتہ لگ جاتا ہے یہ شخص ایک انجینیر ہے۔ اور اپنے فن کے لحاظ سے اُس کا نقطہ نظر بالکل صحیح ہے"۔ دوسرا تماشائی "اس شہر کی ابتدا اور اُس کے اسباب، اُس کے بنانے والوں کے حالات، اور اس کی گذشتہ آبادی کے طریق ماند و بود کی تفتیش میں پڑ جاتا ہے۔ وہ ہر گوشہ کا مشاہدہ کرتا ہے کہ شاید یہاں سے کوئی واقعاتی شہادت اُس کے ہاتھ لگ جائے۔"

یہ شخص مورخ ہے اور اس کا نقطۂ نظر تاریخی ہے۔ تیسرا شخص ان تمام امور سے ہٹ کر شہر کو دیکھتا ہے اُس کا تیز تخیل شہر کو اُس کی قدیم عظمت کے ساتھ اُس کے ذہن میں آباد کر دیتا ہے۔ محل میں رونق اور زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اعیان دولت دست بستہ صف باندھے کھڑے ہیں" وغیرہ یہ شاعر ہے اور اُس کا نقطۂ نظر صرف شاعرانہ ہے۔

اب اگر یہ فرض کر لیا جائے اور اُس پر حجت کیجائے کہ کیوں شاعر کا نقطۂ نظر وہ نہ ہو جو انجینیر کا ہے۔ اور کیوں مورخ کا نقطۂ نظر وہ نہ ہو جو شاعر کا ہے تو اس کا سیدھا سادھا جواب یہی دیا جاسکتا ہے کہ یہ ایک فنی اور بنیادی غلطی ہوگی اور اُس کے اثرات جو "تیتر بیٹر" کی شکل میں ظاہر ہوں گے، تہذیب و تمدن

کی بربادی اور تنزل رمنتج ہوں گے۔

اِسی طرح مقدمہ "شعر و شاعری" میں مولٰنا حالی کی یہ رائے بڑی نکتہ سنجی پر مبنی ہے کہ "ہر ایک شئے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں اُن کا انتخاب کرنا اور اُن کی تصویر کھینچنا شاعر کا کام ہے۔ مثلاً شاعر نباتات اور پھل پھول کو اِس نظر سے نہیں دیکھتا جس نظر سے کہ ایک محقق علم نباتات کا دیکھتا ہے۔ یا وہ ایک واقعۂ تاریخی پر اُس حیثیت سے نظر نہیں ڈالتا جس حیثیت سے کہ ایک مورخ نظر ڈالتا ہے۔ وہ ہر ایک شئے میں سے صرف وہ خاصیتیں چُن لیتا ہے جن پر قوتِ متخیلہ کا عمل چل سکے۔ اور جو عام نظروں سے مخفی ہوں۔ جس طرح ایک نیاریا ریت میں سے چاندی کے ذرات نکال لیتا ہے جو کسی کو نہیں سوجھتے اِسی طرح شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ سے صرف ذوقیات لے لیتا ہے جن میں اس کے سوا کسی کا حصہ نہیں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے۔"

مجھے مذکورۂ بالا بحث سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ خواہ شاعر کسی ماحول اور کسی زمانہ میں کیوں نہ رہے جب کبھی وہ بہ حیثیت شاعر کے زندگی اور کائنات کا مطالعہ اور مشاہدہ کرے گا، اُس کا نقطۂ نظر صرف شاعرانہ رہے گا۔ اور یہ تقریباً ناممکن ہے کہ شاعر کسی مسئلہ پر عالم معاشیات کی حیثیت سے غور کرے۔ اور جو نتیجہ وہ اِس حیثیت سے غور کرنے کے بعد اخذ کرے، اُس کے متعلق یہ دعویٰ کرے کہ یہ "شاعرانہ" ہے اِس لئے اس امر کو تسلیم کرنے کے بعد بھی کہ شاعر کا نقطۂ نظر تبدیل ہوگیا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ غیر شاعرانہ یا معاشی اور سیاسی ہوگیا ہے۔ ہرچند کہ موجودہ دَور ایک معاشی دَور ہے جس میں "حیوانی خواہشات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرنا اُس کا منتہائے مقصود ہے۔" لیکن پھر بھی آرٹ اور زندگی کے سینکڑوں مسائل جن کو معاشیات سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں، معاشی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ اور نہ معاشیات و سیاسیات کے اصولوں کے تحت شاعری کے حسن و قبح پر کوئی رائے زنی کی جاسکتی ہے۔ اِس لئے جدید شاعر کا اپنی تنگ بندی کی تائید میں یہ کہنا کہ اُس کا نقطۂ نظر تبدیل ہوگیا ہے۔ دراصل یہ کہنے کے مترادف ہے کہ وہ غیر شاعرانہ ہوگیا ہے۔ اور چونکہ وہ غیر شاعرانہ ہوگیا ہے اِس لئے اس کا کلام سوائے شاعری کے باقی سب کچھ ہوسکتا ہے۔ اور جو شاعر اِس خبط میں گرفتار ہے کہ شاعرانہ نقطۂ نظر سے زندگی کے مطالعہ کا وہی نتیجہ برآمد ہونا چاہیئے، جو معاشی، سیاسی، منطقی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد برآمد ہوتا ہے تو بغیر طویل اور پیچیدہ مباحث میں گئے ہوئے یہی کہا جاسکتا ہے کہ

"این خیال است و محال است و جنوں"

موجودہ شاعری کی فحش نگاری اور عریاں نگاری پر جب اعتراض کیا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "یہ نظم نفسیاتی تحلیل کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے" یا یہ کہ موجودہ شاعر، قدیم شاعر کے مقابلہ میں "زیادہ بے باک ہے"۔ جہاں تک "نفسیاتی تحلیل" کا تعلق ہے اِن مثالوں میں جو میں اب تک پیش کرچکا ہوں، اور اِس قسم کی شاعری میں جس پر میں بحث کر رہا ہوں، ایک نظم بھی ایسی نہیں ملے گی جس میں نفسیاتی تحلیل کا شائبہ بھی پایا جاتا ہو۔ یہ علمی اور فنی اصطلاح جو عموماً اپنی قابلیت کا اظہار کرنے، اور معترض کو مرعوب کرنے کی غرض سے استعمال کی جاتی ہے، کبھی اِن حضرات کے کلام شرمندۂ معنی نہیں ہوئی ہے۔ نفسیاتی تحلیل کے اعلیٰ اور پاکیزہ نمونے دہقانی کی نظم "بدگمان بیوی کے خیالات" اور شوق قدوائی کی نظم "عالم خیال" میں پائے جاتے ہیں۔

بے باکی کے متعلق ساغر نظامی نے اپنے ایک مضمون "اردو ادب میں نئے رجحانات" میں یہ خیال

ظاہر کیا ہے کہ "محبت پر جتنے پردے تھے نئے شاعروں نے انھیں نوچ کر پھینک دیا۔ عجلت اور غصہ کا زمانہ ہے۔ اس وقت "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے" کا کسے ہوش ہے۔ مگر جنسی رجحانات کو بیان کرنے میں نئے شاعر نہایت بے باک ہیں۔ جو کہتے ہیں کھل کر کہتے ہیں اور مقابل سے ہمت افزا جواب چاہتے ہیں"۔
مجھے اِن جملوں پر تبصرہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر ساغر نظامی محبت کے پردوں کی تشریح کر دیتے۔ اور اُس کا اظہار کر دیتے کہ اِن پردوں کو نوچ کر پھینک دینے کے بعد محبت کی دیوی کے وہ کونسے خد وخال منظر عام پر آ گئے جو اب تک زمانہ کی نظروں سے پوشیدہ تھے۔

جدید شاعری میں بے باکی کا جو تصور کام کر رہا ہے اُس کی ایک مثال میں نے "آنے نہیں خوش پوش خوش اطوار میرے دوست" کی نظم میں اب تک پیش کی ہے۔ ساغر نظامی جہاں بے باکی کا ذکر کرتے ہیں وہاں دراصل وہ موجودہ فحش نگاری کی طرف مصلحتاً ایک مخفی اشارہ کر رہے ہیں۔ اِس بے باکی کی ایک اور مثال اختر شیرانی کی نظم "اپنی نجمہ سے" میں ملاحظہ فرمایئے۔ کہتے ہیں کہ ؎

بہار کے عالم بیگانگی میں جوئے شباب
حباب نور کا عالم دکھا رہی ہو تم
مرے شباب کی دُنیا کا اب خدا حافظ
کہ سینہ تان کے غل چل مچا رہی ہو تم

یہ ہے وہ مایۂ ناز بیباکی جس پر ساغر نظامی اور جدید شاعر پھولے نہیں سماتے ایسی بیباکی کی مثالیں غالب سودا اور داغ کے کلام سے چن چن کر پیش کی جا سکتی ہیں لیکن یا تو غالباً ساغر نظامی کو اس کا علم نہیں یا پھر وہ جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں کہ ایسی بے باکی کو رکیک فحش کلامی اور مبتذل حیا سوز جذبات نگاری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی بیباکی پر نہ خود ان شعراء نے کبھی اپنے فخر اور قادر الکلامی کا اظہار کیا اور نہ ہندوستان کی متمدن سوسائٹی نے کبھی اس کی کوئی ہمت افزائی کی۔ ہر وہ انسان جو حیوانی اور شہوانی زندگی بسر کرنے کا عادی ہے۔ بیباکی کے ایسے نمونے ناقابل قیاس آزادی کے ساتھ پیش کرنے کی جراءت وصلاحیت رکھتا ہے جس کو دیکھ کر جدت پسند شاعری کی بلند و پاکیزہ بے باکی کو بھی اپنی پستی اور ذلت کا احساس ہو جائے۔ لیکن ہندوستانی پریس اور تمدن اس کی اجازت نہیں دیتے۔

ہرچند کہ یہ زمانہ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے" کا نہیں۔ لیکن کیا میں "شاعری کے ہٹلر" سے دریافت کر سکتا ہوں کہ یہ زمانہ "جامن والی" سے عشق بازی کرنے اور "مندر کے پٹ کھول پجارن" گانے کا ۱
زمانہ ہے؟ کیا شاعر موصوف کو موجودہ زندگی کی گہما گہمی میں "تم میرے خواب کی تعبیر نہیں ہو افسوس" کا ماتم کرنے کے لئے وقت مل جاتا ہے؟ معلومات کی کمی' اور استدلال کے نقص کی اس سے بڑھ کر کوئی مثال نہیں ہو سکتی کہ کسی شاعر کے ایک مصرع یا شعر کو یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ اِس کے زمانہ کا وظیفۂ حیات تھا۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ سب جدت پسند شاعر سیاسی اعتبار سے اشتراکیت پسند ہیں۔ اِس لئے بیجا نہ ہوگا اگر میں اُن کی توجہ اِس طرف مبذول کراؤں کہ جس طرح (　　　) کے زمانہ میں ہر شاعر اشتراکی اور ہر اشتراکی شاعر

بن گیا تھا۔ تقریباً وہی دور ہندوستان میں آگیا ہے۔ جس سے ایک طرف اگر مقصدِ اشتراکیت کو نقصان پہنچ رہا ہے تو دوسری طرف اُردو ادب اور زبان کی بھی مٹی پلید ہو رہی ہے۔

سید محمد جعفری نے نئی شاعری کے متعلق بہت صحیح کہا ہے کہ:

طرزِ نو کی شاعری میں مدوجزر بحرِ شعر۔

اُف غضب!!

ایک مصرع فیل بے زنجیر کی زندہ مثال۔

دوسرا شتر کی دُم۔

طرزِ نو کی شاعری کوئی کل سیدھی نہیں۔

شہر بھر میں اُونٹ بے چارہ عبث بدنام ہے۔

آہ اُونٹ!!

احساسِ شعری

اصغر شعری بھوپالی

ابتدائی گناہ کیا کہنا
سب سے پہلی نگاہ کیا کہنا

احتیاط گناہ کیا کہنا
دور جاکر نگاہ کیا کہنا

حشر میں بخششوں سے راز و نیاز
زندگی بھر گناہ کیا کہنا

پھر اُنہیں سے مطالباتِ اَلم
پھر اُنہیں پر نگاہ کیا کہنا

میٹھی میٹھی سی ٹیس رہ رہ کر
یہ چبھتی چبھتی نگاہ کیا کہنا

جن کو حالِ تباہ سے نفرت
اُن سے حالِ تباہ کیا کہنا

جا پڑی خاص اُنہیں کے جلوؤں میں
لڑکھڑاتی نگاہ کیا کہنا

دو جہاں میں کہیں پناہ نہیں
جلوۂ بے پناہ کیا کہنا

رحمتیں مضطرب ہیں اے شعری
میرا عزمِ گناہ کیا کہنا

حضرت ثاقب کانپوری

حشرِ جذبات

آسرے ختم ہو چکے اب کوئی آسرا نہیں
پوچھ رہا ہوں دل سے میں آئینگے بھی وہ یا نہیں

دِل میں ہو آرزوئے درد اِس سے وہ آشنا نہیں
سب کے لئے جفائیں ہیں میرے لئے جفا نہیں

میری یہ نارسائیاں، تیری یہ بے نیازیاں
کوئی نہ کہدے یہ کہیں میرا کوئی خدا نہیں

ناز ہے کس قدر غلط ذوق نظارہ پر تجھے
تیری نظر کے سامنے طور کا ماجرا نہیں

دِل ہے مرا فنا طلب، مسلکِ عشق ہو رضا
تیرا سلوک میرے ساتھ جو بھی ہو نا روا نہیں

دونوں میں تھی برابری کچھ نہ کھلا معاملہ
حسن ہو کیوں فنا پذیر، عشق کو جب فنا نہیں

میری نظر کے سامنے سیکڑوں جلوے ہیں مگر
مجھ سے یہ کہہ رہا ہو کون، حسن کی انتہا نہیں

اُف ری یہ ہجومِ غم، اُف ری یہ میری بیکسی
وقت ہو یہ دعا کا اور لب پہ مرے دعا نہیں

شکوۂ حسن کیا کرو، قصۂ غم سنائے کیا
ہائے وہ بدنصیب جو درخورِ اعتنا نہیں

ثاقب خستہ کیلئے عشق میں صرف درد ہو
حسن کے اختیار میں تو ہی بتا کہ کیا نہیں

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

کایا پلٹ

ڈاکٹر سلمان کے بنگلور پہونچنے سے بہت پہلے اس کی شہرت وہاں پہونچ چکی تھی۔ وہ بمبئی میں ایک اعلیٰ درجہ کا سرجن تھا جس کے عمل جراحی کی چار دانگ عالم میں دھوم تھی۔ اس نے اپنے ہم پیشہ اصحاب سے بالکل جدا ہو کر علم الجراحی میں ایک نئے اور نہایت شاندار باب کا اضافہ کیا تھا یعنی زندہ جسم میں لاش سے قطعہ کئے ہوئے اعضاء اس خوبصورتی سے چسپاں کر دیتا کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ اس کے اس نئے علم کی متعدد مثالیں ہندوستان کے اکثر شہروں میں ملتی تھیں۔ بہت سی ناک، آنکھ، پیشانی رخسار، بازو کلائی وغیرہ جو چلتے پھرتے اور اچھے بھلے انسانوں کے جسم پر دکھائی دیتی تھیں وہ ڈاکٹر سلمان نے لاشوں سے حاصل کر کے اپنے مریضوں کے بیمار عضو کی جگہ پر لگا دی تھیں۔

ڈاکٹر سلمان نے پہلے پہل جب اپنی ایک مریضہ کی ناک بدل دی اور اس کی بھدی اور چپٹی ناک کے عوض ایک خوبصورت ستواں ناک لگا دی تو نہ صرف بیچاری مریضہ کو ایک خوبصورت سا بَر مل گیا بلکہ اس قسم کی دیگر جوان لڑکیوں میں بھی خوشی اور امید کی لہر دوڑ گئی جن کے چہرے یا جسم کا کوئی حصہ بدنما ہونے کے وجہ سے مُرغ دل کو اپنے جال میں پھنسانے سے قاصر تھا۔

ڈاکٹر سلمان نے ہرچند تمام اخباروں اور رسائل میں یہ اشتہار دیدیا کہ اس کے پاس اتنے مُردہ اعضاء جسمانی نہیں ہیں جو اس کے تمام مریضوں کے لئے کافی ہوں اور نہ اس کے پاس اتنا وقت ہے کہ اتنا مشکل اور طویل اپریشن وہ ہر چھ ماہ میں ایک سے زیادہ کر سکے اِس لئے اس کے مطب میں مریضوں کی بھیڑ کے کوئی معنی نہیں اور وہ نہایت افسوس سے اپنے مہربانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ اکثر حالتوں میں وہ ان سے ملنے سے بھی مجبور ہے مگر پھر بھی اُس کے سرجری میں صبح سے شام تک مریضوں علی الخصوص جوان لڑکیوں کا تانتا بندھا رہتا جن کی تیز نظروں اور متجسس نگاہوں سے شاید آسمان کے فرشتے بھی محفوظ نہیں رہ سکتے اُس نے عاجز آ کر اپنے احاطہ میں اونچی اونچی دیواریں اُٹھوا دیں، پھاٹک پر ایک چھوڑ دو دربان بٹھا دیئے اپنے شہر سے باہر چلے جانے کا اعلان کرا دیا مگر اُن تدبیروں کے باوجود یہ شوخ اور رنگین تیتریاں کہیں نہ کہیں سے پھر پھراتی آ دھمکتیں اور اپنے اصرار، خوشامد، لالچ، دھمکی الغرض ہر طرح کے ہتھیاروں سے بیچارے ڈاکٹر پر حملہ کرتیں اور اسے اتنا ہلکان کرتیں کہ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے ماتھے سے پسینہ پُونچھنے لگتا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ وہ واقعی اگر بمبئی چھوڑ کر جلد کسی دوسرے شہر میں نہیں چلا گیا تو اس کا جینا اَجیرن ہو جائے گا اور اس کے حواس مخبوط ہو جائیں گے اس لئے ایک دن وہ چپ چاپ بمبئی سے نکل بھاگا اور بنگلور میں جہاں اس نے پہلے ہی سے شہر کے باہر ایک عظیم الشان کوٹھی لے لی تھی، آ کر دم لیا۔

مگر شہرت اور بدقسمتی انسان کے ساتھ ساتھ موت کے سایہ کی طرح چلتی ہے۔ ڈاکٹر سلمان جسے آرام وسکون کی بندرگاہ سمجھ کر آیا تھا وہاں اس کے سفینۂ حیات کے لئے برق و باد کے زبردست تھپیڑے منتظر بیٹھے تھے۔ وہ ابھی وہاں پہونچ کر اپنے جوتوں کا تسمہ بھی کھولنے نہ پایا تھا کہ ایک بائیس سالہ لڑکی، نہایت کریہہ المنظر اُس کے کمرے میں گھس آئی۔ وہ ہزار کچھ کہتا رہا مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ وہ اس کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئی اور اپنے آنسوؤں سے اُس کے پاؤں دھوتی رہی۔ سلمان دل ہی دل میں بہت جھنجھلایا اور اپنے آپ کو کوسنے دیئے مگر وہ اپنے دل کے اِس دبے ہوئے رحم کرم کے جذبے کو مٹا نہ سکا جس کی پیدا کی ہوئی بے چینی نے اُسے تیس سال کی انتھک کوشش کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اُس نے آج جو کچھ کمال حاصل کیا تھا وہ محض بدنصیب انسان کو دکھ اور تکلیف سے نجات دلانے کے لئے تھا اور یہ اس سے نہ ہو سکتا تھا کہ وہ حتیٰ الامکان کسی کی مدد کرنے سے منہ موڑے۔ چنانچہ اُس نے کہا "بدقسمت لڑکی، میرا کہا نہیں مانتی تو ساتھ والے کمرے میں میرا انتظار کر اور خدا کے لئے مجھے اتنی سی مہلت دے کہ میں منھ ہات دھو کر تھوڑی دیر ستالوں اور چاء کی ایک پیالی پی لوں"۔

سلمان کا یہ جملہ جو واقعی اُس کے دکھے ہوئے دل سے نکلا تھا لڑکی کے دل میں گھر کر گیا۔ وہ اٹھی اور چپ چاپ سر جھکائے ہوئے دوسرے کمرے میں ڈاکٹر سلمان کا انتظار کرنے لگی۔

جنوری کا مہینہ تھا اور سہ پہر کا عمل۔ جاڑے کا مارا ہوا سورج ٹھٹھر کر سرد ہوا چاہتا تھا اور اُس کی کمزور سی زرد کرنیں کچھ یونہی بددلی سے، آڑی ترچھی ہو کر برگد کی پھننگ اور سلمان کے باغیچہ کی ایک کیاری پر پڑ رہی تھیں۔ باغ کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں سردی سے اپنے پر پھیلائے سورج کی ان ٹھٹھری ہوئی کرنوں کا منہ چڑانے کے لئے رقص کر رہی تھیں اور انہیں چھیڑنے کے لئے چہک چہک کر کہہ رہی تھیں۔

"بی کرنیں، یہ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ میرے پَروں کو بھی گرم نہیں کر سکتیں اور جیٹھ بیساکھ میں تو تمہاری شوخی اور چلبلاپن کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

یہ آج تم بڑی بوڑھیوں کی طرح دھرتی ماتا کے چہرے کی جھریاں بنی کیوں بیٹھی ہو۔ اٹھو، اٹھو، ہمیں گدگداؤ کہ ہمارے ہاتھ پاؤں شل ہوئے جاتے ہیں اور جاڑے سے ہمارے دانت بجنے لگتے ہیں؟"

لڑکی خود ہی سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ اُس کے جسم پر جارجٹ کی گلابی ساڑی اور اسی رنگ کا باریک سا جمپر اُس کے دہان پان جسم سے گرمی کی ضائع ہوتی ہوئی لہروں کو روکنے سے قاصر تھے۔ اسے اُس وقت موٹے کوٹ اور اونی شال کی ضرورت تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنی گود میں لے کر گرم رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں وہ سارے جسم سے کبھی کبھی کانپ اٹھتی تھی۔ وہ اپنی اسی کشمکش میں مبتلا تھی کہ ڈاکٹر سلمان کا سفید سر ملحق کمرے سے باہر نکلا۔ اس نے جھانک کر لڑکی کو دیکھا اور اسے سردی سے کانپتے دیکھکر ایک موٹا کوٹ اُٹھا لیا اور اُسے دے کر کہا۔

"پہلے تم اسے پہن لو۔ بڑی سردی ہے" لڑکی نے جھجک کر اس کوٹ کو لیا جو پہننے کے بعد اُس کے ٹخنے تک چلا آیا۔

ڈاکٹر ایک کرسی لے کر بیٹھ گیا اور پوچھا تمہارا نام لڑکی نے جھینپ کر جواب دیا "اوشا رانی"۔

ڈاکٹر نے مسکرا کر بے تکلفی پیدا کرنے والے لہجہ میں پوچھا۔ "اچھا، اوشا رانی، اب تم مجھے بتاؤ کہ تم

مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

لڑکی ڈاکٹر کے اس سوال کو سُن کر کچھ بے چین سی ہو گئی اور اس کی زبان اُس کے اُمنڈتے ہوئے جذبات کا ساتھ دینے سے قاصر معلوم ہوتی تھی۔ وہ کچھ کیا بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ کہاں کچھ دیر پہلے وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔

مگر اب اندرونی کشمکش اور ہیجان کی وجہ سے اُس کی تنگ اور چھوٹی سی پیشانی پر پسینہ کے ننھے ننھے قطرے اُس کی سیاہ جلد پر کالے مخمل کے سلمہ ستارہ کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کی شکل کو سمجھ کر مزید بے تکلفی کے لہجہ میں کہا: "ہاں، ہاں، اوشا رانی، بولو تم کیا چاہتی ہو؟ مجھ سے گھبرانے یا جھینپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھو!"

اوشا سلمان کے منہ سے لفظ باپ سُن کر بے اختیار اُٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے قدم چھو کر کہنے لگی "میرے محسن، آج مجھے زندگی میں پہلی بار کسی نے بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ آہ! میرے باپ سے زیادہ مہربان دیوتا، آپ کو شاید معلوم نہیں کہ مجھے اس کا علم اب تک نہیں ہوا کہ میرا باپ کون تھا۔ میری ماں ایک صاحب کے ہاں اُن کے بچوں کی نگران تھی۔ میں نے اُسی کی گود میں ہوش سنبھالا۔ میری ماں کہتی تھی کہ میرا باپ اس کا دوسرا آقا تھا۔ جس کے ہاں وہ اس کے گھر کی منتظمہ تھی میں نے ہزار کہا کہ مجھے بتا دو میرا باپ کون ہے تاکہ میں بھی اُسے ایک نظر دیکھ لوں مگر وہ ہمیشہ مجھے میرے اِس خیال سے روکتی رہی اور جب کبھی میں اِصرار کرتی تو وہ کانپ کر رونے کے قریب ہو جاتی جیسے اُس کو میرے باپ کے ہاتھوں کافی دکھ پہنچا ہو۔ میں اپنی ماں کے ساتھ اس کا ہاتھ بٹانے میں اور اپنے آقا کے گھر میں دیگر چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول رہتی تھی۔ میرے آقا کا ایک لڑکا تھا، بڑا سندر، بڑا چنچل، لڑکیوں کے کھیل میں اُس کا بڑا جی لگتا اور ہر گھڑی وہ پاس پڑوس کی لڑکیوں کو بھی پھسلا کر اپنے ہاں لاتا۔ وہ ان کو گوپیاں بنا کر خود کرشن بنتا اور احاطہ کے چھوٹے سے کنج میں اُن سے طرح طرح کی چھیڑ خانیاں کرتا جن سے وہ لڑکیاں کبھی درد سے ہلکی سی چیخ لگاتیں اور کبھی لطف سے کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔ میری عمر اس وقت سولہ سال کی تھی اور اور میرے نس نس میں جوانی ہلکا میٹھا درد پیدا کرنے لگی تھی۔ میرا جی خود بخود چاہتا تھا کہ مجھے بھی پیارے کنج میں لے جا کر اپنی گوپی بنائے، اور میرے بند بند کو اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ کر ایسا جھنجھوڑے کہ میں کبھی درد سے چیخ اُٹھوں اور کبھی کھلکھلا کر خوب ہنسوں مگر میرا یہ ارمان دل ہی دل میں گھٹ کر رہا۔ پیارے نے مجھ سے کبھی پیار نہ کیا اور ہمیشہ مجھے دھتکار کر میرے ساتھ خارشتی ہوئی کتیا کا سا سلوک کرتا رہا۔

لڑکی یہاں تک ایک جوش میں ڈاکٹر سلمان سے اپنی زندگی کا دکھ بھرا آغاز بیان کر گئی۔ وہ اپنے سینہ کے اندر بھڑکتی ہوئی آگ سے خود بخود جلی جا رہی تھی اور اپنے اندر کی جلن سے ایسا پھنک رہی تھی کہ اسے اپنے تن بدن کی سُدھ بُدھ نہ رہی تھی۔ اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی مرد کے آگے اپنی نسائیت کی کمزوریاں بیان کر رہی تھی۔ اُس نے ڈاکٹر سلمان کو اپنی طرف ہمہ تن گوش پا کر اپنا قصہ پھر چھیڑا "وہ میرے ساتھ ایسا کیوں سلوک کرتا تھا۔ اس کے کہنے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر صاحب، میں جانتی ہوں اور میرے آئینہ نے مجھ سے بارہا کہا ہے کہ میں حد درجہ بدصورت ہوں، اِتنی بدصورت کہ میرے منہ پر کوئی بھلا مانس تھوکنا بھی منظور نہ کرے گا۔ میرا سیاہ رنگ، میرا یہ چرم واستخوان چہرہ اور جسم جس پر چیچک کے ہزاروں بڑے چھوٹے گڑھے ہیں اور میری یہ آنکھیں جو نہ صرف

بھیگی ہیں۔ بلکہ ان میں سے ایک میں سفید پھولی بھی پڑی ہوئی ہے۔ میرے چہرہ کی عجیب ٹیڑھی کبڑی ساخت جس میں ٹھوڑی کی جگہ ایک ننھا سا ابھار ہے اور میرے گالوں کی ہڈیاں عجیب طرح سے ابھر کر میرے چہرہ کو بھیانک بنا دیتی ہیں۔ الغرض ڈاکٹر صاحب، میں عورت نہیں چڑیل ہوں اور ایسی عجیب چڑیل کہ اگر بھگوان پھر مجھ جیسی چڑیل بنانا چاہے تو شاید نہ بنا سکے۔

میں جانتی ہوں کہ میں عورت کے نام پر بے عزتی اور بدصورتی کا دھبہ ہوں۔ میری پیدائش اور میں جس غریب طبقہ سے تعلق رکھتی ہوں وہ سب مجھے معلوم ہے، پر کیا کروں کہ نگوڑا دل ایک عورت کا ہے جو ہر گھڑی محبت کی بھوک محسوس کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جیسے دنیا جہاں میں ہر عورت کا ایک جوڑا ہے، ویسے میرا بھی کوئی ہو جس کو میں اپنا کہکر پکاروں اور اس پر اپنا تن من دھن قربان کروں۔"

اپنے دل کو ہزار سمجھاتی ہوں مگر یہ کمبخت کسی طرح مانتا ہی نہیں اور ضدی بچے کی طرح اسے جتنا بہلانا چاہتی ہوں یہ اور مچل مچل کر میرا جی ہلکان کرتا ہے۔ پتہ نہیں شاید محبت میرے وجود میں رچی ہوئی ہے۔ ہر پہلو اور ہر لمحہ میں میرے جسم کا ہر تار محبت کے مضراب سے بجنا چاہتا ہے اور میرے دل میں کسک پیدا کرنا چاہتا ہے۔ میں جب کبھی کسی عورت کو مرد کے مضبوط بازو کا سہارا لے کر چلتے دیکھتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ مجھے بھی کوئی اسی طرح سہارا دے کر لے چلے۔ جب کبھی کوئی مرد ہنس ہنس کر کسی عورت سے باتیں کرتا ہے تو میرے جی کو جیسے دُکھ سا ہوتا ہے اور میں بھی چاہتی ہوں کہ مجھ سے کوئی اسی طرح اپنی آنکھوں میں مستی بھر کر میرے سوئے ہوئے دل میں جادو جگائے۔ اور آہ! جب کسی ماتا بھری ماں کی گود میں ننھے سے فرشتے کو ہمک ہمک کر اس کی امرت بھری چھاتیوں سے اپنا جیون آدھار چوستے دیکھتی ہوں تو بس یہی جی چاہتا ہے کہ اس بھولے سے بچے کو اس کی گود سے چھین کر اپنے کھلے ہوئے آغوش میں لے لوں اور اسے اپنے سینہ سے چمٹا کر آنند اور خوشی کے اس سنہرے دیس میں چلی جاؤں جہاں میں ہوں، میرا یہ پھول جیسا بچہ ہو اور ہمارے سر پر ہر گھڑی مسکراتے ہوئے چندرما کی ٹھنڈی جوت ہو۔

ڈاکٹر صاحب، میں بہت دکھی ہوں، میرا جیون ریگستان میں اُگے ہوئے تنہا ببول کے پیڑ کی طرح ہے جس پر نہ کبھی کوئی چڑیا آ کر بیٹھی اور نہ اس پر کبھی ٹھنڈی برکھا کی کوئی بوند ٹپکی۔ میں جب سے پیدا ہوئی ہوں اس اُمید میں کھڑی ہوں کہ کوئی بھولا بھٹکا مسافر آ کر میری چھدری چھاؤں تلے بیٹھے یا نہیں تو کم از کم بے دردی سے میری کوئی ڈالی ہی توڑ ڈالے تو میں سمجھوں کہ میرا جیون سپھل ہوا اور میں بھی کسی کے کوئی کام آ سکی۔

اوشا یہ کہتے کہتے تھک کر خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے نرمل قطرے ڈھلک کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ اُس نے حسرت، تمنا اور اُمید سے ڈاکٹر سلمان کے فکر میں ڈوبے ہوئے چہرے کو یوں دیکھا جیسے کوئی شکستہ بادبانوں والی کشتی کا خستہ حال ملاح دور ساحل کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی کو دیکھتا ہے اور ٹھنڈا سانس لے کر سوچتا ہے کہ وہ اس روشنی تک پہونچ بھی سکیگا یا نہیں؟

جاڑے کا تھرتھرا کر جلنے والا سورج اپنے تمتماتے ہوئے گالوں کی سرخی سے پچھم کے آسمان کو لجاتے ہوئے گلابی رنگ میں رنگ رہا تھا۔ ننھی ننھی چڑیاں نراس ہو کر اپنے اپنے گھونسلوں میں چھپ گئی تھیں۔ ڈاکٹر سلمان کا سیاہ کتا اپنی خوفناک بھونک سے درخت پر سہمی ہوئی گلہری کا خون خشک کر رہا تھا۔ سلمان جیسے اپنے

خیالات کی دُنیا سے دفعتاً چونک پڑا اور کہنے لگا "اوشا دیوی مجھے تمہارے ٹھکرائے ہوئے جذبات سے پوری ہمدردی ہے اور میرا دل ایک باپ کے محبت بھرے دل کی طرح تمہاری بپتا کو سُن سُن کر گھٹا جا رہا ہے۔ میں کوشش کرونگا کہ میری اوشا نک سک سے درست ایسی خوبصورت دیوی بنے کہ سارے جہاں کے لوگ اپنے دل میں ہزاروں تمنائیں لئے اُس کے چرنوں کی پوجا کرنے آئیں اور اُس کے آگے اپنی پیشانیاں ٹیک کر کہیں "اپنے دیوی، اپنے ایک نرمل پجاری پر دیا کی نظر کرو اور اس کے جیون کی کالی بھیانک رات میں اوشا بن کر سورج کی پہلی کرن لاؤ" ڈاکٹر سلمان نے یہ جملہ کہکر اپنے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا کر لی جیسے کوئی بزرگ ضدی بچہ کو بہلانے کے لئے شاندار مستقبل کا نقشہ کھینچ کر اسے سرشار کرتا ہے۔

اوشا مگر ڈاکٹر سلمان کے اس شاندار وعدہ سے نہ خوش ہوئی اور نہ چہک کر اپنی دبی ہوئی خوشی کا اظہار کیا بلکہ وہ جس طرح گردن جھکائے بیٹھی تھی اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی پھر تھوڑی دیر بعد خود ہی بولی "آپ نے شاید اپنی دکھیاری اوشا کا دِل نہیں دیکھا۔ یہ پاپی بس ایک کا ہو چکا اور وہ حد درجہ سندر دیوتا میرا پیارا ہے۔ ڈاکٹر صاحب، اس کا نام پیارا ہے اور وہ بہت پیارا ہے بھی۔ آج چھ سال سے وہ میرے مَن مندر کا دیوتا ہے میں رات کے اندھیارے اور دن کے اُجالے میں اس کے نام کی مالا جپتی ہوں۔ میرے جسم کا رواں رواں صرف اس کے نام کا دیوانہ ہے مگر پھر بھی اس دیوتا نے کبھی آج تک میری طرف مسکرا کر نہیں دیکھا اور نہ کبھی میرے دھڑکتے ہوئے دِل پر ہاتھ رکھکر پوچھا۔

"اوشا، تو اتنی اداس کیوں ہے؟" مگر دیوتا کی بے رُخی شاید میرے جذبِ دل کی کمی سے زیادہ میری صورت کی کمی کے سبب سے ہے۔ میرا دیوتا اپنی محبت کے پھول بکھیرنے میں کم ہمت نہیں۔ اس کی خلوت گاہ میں صبح شام ہر قسم کی عورتیں آتی ہیں اور اُس کے شباب و حُسن کے ہرے بھرے گلدستہ سے دو چار خوبصورت پھول لے کر ہنستی کھیلتی چلی جاتی ہیں اور میں حسرت و یاس کی ماری، تصویر بنی، ان آسودگان خوش کام کو رشک کی نگاہ سے دیکھتی رہ جاتی ہوں۔ میں نے بارہا چاہا کہ جب وہ شدید نشہ میں چور ہو تو میں اس کی خلوت گاہ میں دبے پاؤں چلی جاؤں اور اس کے مسلے ہوئے پھولوں میں سے صرف ایک اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگاؤں مگر میری یہ جسارت ہمیشہ اس کے لئے سخت تکلیف کا باعث بنی اور اُس نے بلاناغہ، ہر بار، مجھے اپنے کمرہ سے دھتکار کر باہر نکال دیا جیسے کوئی سڑے گلے ہوئے بھکاری کو اپنے دروازہ سے للکار کر نکال دیتا ہے میں یوں ذلت کے ساتھ نکلنے کے بعد اپنے دل کی اس طرح تسکین کرتی ہوں "اوشا، تو بدصورت ہے چڑیل کی طرح جب ہی تیرا پران ناتھ تجھے منہ نہیں لگاتا اور تیرے سایہ سے وہ یوں بھاگتا ہے جیسے کوئی کوڑھی سے بھاگے"

اوشا اتنا کہکر بے قرار ہو گئی، ڈاکٹر سلمان نے تسلی کے لئے کچھ کہنا چاہا مگر اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے روک کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب مجھے اپنی دُکھ بھری کہانی کہہ لینے دیجئے، میں کمزور ہوں، غم سہتے سہتے میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے، عرصہ سے دربدر کی خاک چھانتی پھرتی ہوں، صبح یہاں، شام وہاں، کبھی کھایا، کبھی بھوکے سو رہی نہ نیند ہے، اور نہ قرار ہے۔ پارے کے قطرے کی طرح دنیا کی کھردری سطح پر ڈھلک کر ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہوں اس لئے صحت بھی گر گئی ہے اور دل میں اختلاج بھی ہونے لگا ہے۔ ہاں۔ تو وہ مجھ سے متنفر ہی رہا۔ میری دکھیاری ماں نے رو رو کر اپنی جان کھو دی کہ میں اپنی اِس کمزوری سے باز آؤں مجھے اس کے مرنے

اور جان کھولنے کا غم مارے ڈالتا تھا مگر کیا کرتی کہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جو اندر والا کہتا اسی کے حکم پر چلتی۔ کبھی مجھے اپنی ماں سے شدید نفرت ہو جاتی کہ اس ابھاگن نے مجھ جیسی راکشش کو کیوں جنم دیا؟ کبھی خیال کیا یقین ہو جاتا کہ میرا باپ حد درجہ کریہہ الصورت ہوگا جب ہی میں اتنی بدشکل ہوئی ہوں۔ پھر غصہ سے میرا خون کھولتا کہ میری ماں جو نیک سے درست تھی وہ ایسے بدصورت انسان کے پاس کیوں گئی؟ کیا اسے اس وسیع دنیا میں دوسرا کوئی مرد نہ ملتا تھا؟ آپ ہی آپ پھر غصہ اور افسوس سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور میں کہتی ہے ہے ایشور، یہ میں نے کس جنم میں ایسا پاپ کیا تھا کہ اس کی سزا بھوگنے کے لئے تو نے مجھے انسان بنا کر بھی انسان کے لائق نہ رکھا۔ کاش تو مجھے عورت نہ بناتا۔ عورت جو اپنے روپ کے بل پر دلوں میں حکومت کرتی ہے، آنکھوں میں سرور پیدا کرتی ہے اور سنسار میں سندر پھول کھلاتی ہے۔ اگر اس سے روپ ہی چھین لیا تو وہ پھر کس مصرف کی رہی۔ وہ ہیرا ہے مگر پتھر کے برابر۔ وہ چاند ہے بغیر روشنی کے۔"

ڈاکٹر صاحب! ایشور کی اس ناانصافی کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے، میرے تن بدن میں غصہ اور نفرت کی آگ سلگنے لگتی ہے اور یہی جی چاہتا ہے کہ دھرتی ماتا کی بلند چوٹی پر چڑھ کر خوب چلاؤں اور اتنے زور سے بین کروں کہ میری چیخ پکار کی جھنکار سے بھگوان کا اوندھا اکاش کانس کے پیالے کی طرح بجنے لگے اور اس کے اکاش پر کھلے ہوئے ستاروں کے پھول مرجھا کر خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ کر گرنے لگیں۔" اوشا غصہ اور نفرت کے ملے جلے جذبات سے پھنک رہی تھی اور اپنے اندرونی تلاطم کو سکون پہنچانے کے لئے رہ رہ کر لمبا سانس لے رہی تھی۔ سلمان بت بنا ایک عورت کے بپھرے ہوئے غصہ سے اکڑتی ہوئی چنگاریوں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اوشا نے اپنا قصہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے دیکھا کہ میرا پیا رتے کبھی کبھی شہر کے اس کوچہ کی بھی سیر کرتا ہے جہاں بدقسمت عورتیں اپنے حسن و شباب کا سودا کرتی ہیں۔ میرے پاس حسن نہ تھا مگر شباب تھا۔ میں نے شباب کے بھروسے پر اس کوچہ میں اپنا بسیرا کیا۔ اور ہر شام خوب بن ٹھن کر بیٹھتی مگر باہر نہیں، اپنی کوٹھری کے اندر، کہ کبھی تو وہ نت نئے مزے کا رسیا بھولے سے میرے جام کو بھی اٹھا کر اپنے پیاسے ہونٹوں سے لگائیگا؟ اس طرح اس جان لیوا انتظار میں ایک مدت گذر گئی۔ مجھے اپنے جسم و جان کا تعلق قائم رکھنے کے لئے کبھی کبھی کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے گاہک کو شاد کام کرنا پڑتا تھا۔ میری بے آبرو زندگی کی یہ سیاہ ناگن جیسی کالی راتیں میری روح کو ڈس کر میرے جسم کی طرح اسے بھی سیاہ بنا رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ میں آسمان سے ستارہ توڑنے کی دھن میں اپنے دامن کے مرجھائے ہوئے پھول کو بھی لٹا رہی ہوں۔ مگر کیا کرتی، جب زمین سخت ہو اور آسمان دور ہو تو پھر گھٹ گھٹ کر مرنے کے اور کیا چارہ ہوسکتا ہے؟ آخرش، ایک دن وہ آیا اور اس طرح کہ نشہ میں اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے، آنکھیں بوجھل خمار سے مندی جا رہی تھیں اور ہوش و حواس کسی حسینہ کی باریک ساڑی کی طرح ہوا میں اڑنا ہی چاہتے تھے۔ میری کوٹھری کی مدھم روشنی میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ بھوکے اور کمزور انسان کی طرح ڈگمگاتا ہوا میرے قریب آیا۔ اس کے لب اور زبان شراب کے نشہ میں شل ہو کر بھرائی ہوئی آواز نکال رہے تھے "میری زان ..... مزا نیکسے ہیں ..... ادھر آؤ .... میری زان ادھر آؤ" آہ! یہ الفاظ نہ تھے امرت رسیلا کی برکھا تھی جس کے لئے میرے شریر کا رواں رواں

پیا سا تھا۔ میرے کانوں کی راہ اس برکھا کی ٹھنڈک میرے
دل میں اُتر گئی اور میری جلی بھنی ہوئی آتما نے پہلی بار انند
محسوس کیا۔ اب میں اپنی خوشی میں مدہوش ہو کر، پروانہ وار
اپنے پران ناتھ کے چرنوں پر گرنا چاہتی تھی۔ وہ ٹھوکر
کھا کر خود میرے قدموں پر آتا رہا؟
"آہ" شاید یہ کہکر بے قرار ہو گئی جیسے پیارے ابھی
ابھی اُس کے قدموں پر گرا ہو۔
اُس نے کانپ کر کہنا شروع کیا: "میرے من
مندر کا دیوتا میرے قدموں پر منہ کے بل پڑا تھا! میں
کانپ اُٹھی، لرز گئی اور جھک کر اُس کے سر کو اپنی گود
میں لے لیا۔ دیکھا وہ بے ہوش تھا۔ اُس کے ہوش
آنے تک کا مختصر سا وقفہ میری زندگی کی سہاگ رات
تھی۔ میں نے خوب بھینچ کر اس کے پیار لئے۔ اُسے
اپنے دھڑکتے ہوئے دل سے لگایا۔ اس کی آنکھ، پیشانی
لب، رخسار، اور گردن کے ہزاروں پیار لے ڈالے۔
میری حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ میرا بھی جی
چاہتا تھا کہ پیارے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یونہی بے ہوش
ہو کر میری گود میں لیٹا رہے اور میں جھک کر اس کے
سینے سے لگی قیامت تک پڑی رہوں۔ مگر یہ لمحے میری
خوشیوں کی طرح مختصر تھے۔ یہ خوشبو کی ہلکی سی لہر کی طرح
میری روح کو سرشار کرتے ہوئے گذر گئے۔ پیارے
ہوش میں آکر جاگنے لگا تھا۔ اس نے اپنی باہیں میری
گردن میں ڈالکر لیٹے لیٹے کہا۔
"میری رانی، موہنی، آج تم مندر پر بڑی مہربان
ہوئیں" میں اپنا نام موہنی سنکر اپنے دل میں شرمائی۔ آہ!
میرے ایسے کہاں نصیب کہ میرا سوامی مجھ جیسی ابھاگن
کے پھٹکار برستے ہوئے چہرے کو دیکھکر موہنی جیسا پیارا
نام دے۔ پھر بھی، ہائے رے نگوڑا دل، یہی جی چاہتا
تھا کہ اس کی بات کا اعتبار کروں اور سچ مچ کی موہنی
بن کر گھونگھٹ نکال لوں اور آنچل کے اندر سے اپنے
دیوتا کی للچائی ہوئی نظروں کو دیکھکر خود بھی شرما جاؤں
اور اُسے بھی تڑپاؤں۔ اس وقت میری گردن میں
وہ بازو حائل تھے جن کو صرف چھونے کے خیال سے میرے
تن بدن میں کنکھجورے سے رینگنے لگتے تھے آج مجھے
اپنی قسمت پر ناز تھا۔ چاند اپنے ہالے میں تھا، برسات
دھنک میں لپٹی ہوئی تھی، بچہ اپنی گود میں تھا۔ میرے
نس نس میں کوئی شراب پی رہا تھا۔ مجھے نیند آنے
لگی۔ میرا دماغ ہلکے پھلکے روئی کے گالے کی طرح کہکشاں
کی سمت اڑتا چلا جا رہا تھا۔
میری آتما پھول بنکر مہاراج کرشن کی بنسری
میں پھنس گئی تھی۔ میں دیوی تھی اپنے دیوتا کی گود میں
مجھے دیکھکر ہوا گا رہی تھی، ستارے آنکھیں مٹکا رہے
تھے، چاند اپنی کرنوں کی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں سے
مجھے گدگدا رہا تھا۔ میں ننھی منی پری کی طرح ہمک کر
ناچنا اور گانا چاہتی تھی اور منڈلاتے ہوئے بھونرے
کی پیٹھ پر بیٹھکر الوپ کی سیر کو جانا چاہتی تھی جہاں
رقص کرنے کو پھولوں کی پنکھڑیاں بچھی رہتی ہیں اور
ساز بجانے کے لئے شاما چہکتی ہے۔ میرا خیال کا ذرہ
ذرہ رقص کر رہا تھا اور اس رقص کی جھنکار سے میں
مدہوش ہوئی جا رہی تھی۔ تمنائیں اور آرزوئیں ہر
طرف برسات کے سبزہ کی طرح مچل کر میری کوٹھری کو
رشک فردوس بنا رہی تھیں۔ میرا دل گا رہا تھا "میں
موہنی ہوں، میں موہنی ہوں، میرا روپ نکھر کر بیکنٹھ
کے اپسراؤں جیسا ہو گیا ہے، آج میرے سوامی چندرما
کی جوت بنکر میری کٹیا میں آئے ہیں۔ آج سارا پت
بن گا رہا ہے۔
میں شکنتلا ہوں، شکنتلا۔ آج میرے
مہاراج نے مجھے پہچانا ہے اور اپنے کئے کی لاج مٹانے
کو میری گردن میں باہیں ڈالکر میرے دکھ کی تلافی
کر رہے ہیں"

اوشا کا جوش بڑھتا جاتا تھا۔ سلمان بت بنا ایک عورت کو اظہار جذبات کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید اس راز سے اب تک ناواقف تھا کہ ہر عورت خواہ وہ حسین ہو یا بدصورت امیر ہو یا غریب، شریف ہو یا رذیل، ایک جیسا حساس دل رکھتی ہے اور اس کے جذبات، جب محبت سے آشنا ہوتے ہیں تو تخیل کے پر لگا کر بہت بلندی پر پرواز کرنے لگتے ہیں۔ عورت اور جذبات لطیف، دونوں ایک ہیں صرف اُن کے نام جدا ہیں۔ کوئی مرد اس بلندی کو چھو بھی نہیں سکتا جہاں ہر روز ایک عورت محبت کی تلاش میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ عورت، پرواز تخیل کی دوسری شکل ہے۔ یہ زمین کی ہوتے ہوئی بھی آسمانوں پر رہتی ہے اور وہاں ستاروں کے پھول اُسے اپنے جوڑے اور بالوں کو طرح طرح سے سجاتی ہے۔

اوشا کہتی گئی، "میں اپنے خیال میں مدہوش، اپنے ماحول سے بے خبر بہت بلندی پر کھڑی تھی کہ پیارے نے جھنجھوڑ کر مجھے نیچے گرا دیا۔ وہ کچھ دیر تک میری گردن میں باہیں ڈالے پڑا رہا۔ پھر اُٹھ بیٹھا اور مجھے دیکھتے ہی متلی کرتے ہوئے بولا" چھی۔ تو ہے، تو، اوشا، دھتکار ہے مجھ پر، میں کہاں کس چڑیل کے گھر آ پہنچا؟" یہ کہہ کر وہ تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور میری آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر کے اپنے پیچھے تاریکی کی سیاہ چادر بچھاتا چلا گیا۔ میں تلملا کر اُٹھی اور ٹٹولتی ہوئی اپنے چھجے کے کنارے جا کر کھڑی ہو گئی اور اس بدنصیب چکور کی طرح نیچے کی طرف دیکھ کر بے چین ہونے لگی جس کا جوڑا آسمان کی بلندی سے چکر کھاتا ہوا نیچے گرے اور تاریک خلا میں گم ہو جائے۔

اوشا پھر رونے لگی جیسے اس سے ابھی ابھی اُس کا پیارا الگ ہوا ہو۔ وہ ایک ٹھنڈا سانس لے کر کہنے لگی "اب میرے لئے اس گلی میں کوئی آس کا سہارا نہ تھا۔ میں نے جس روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے یہ روپ دھارا تھا۔ وہ آ کر چلا بھی گیا۔ اُس نے آ کر بھی مجھے جی بھر کر دیکھا بھی نہیں اور اپنی ٹھوڑی پر سیکڑوں بل ڈالے ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔ میں اس طرح اس کی امید میں بیٹھی کب تک اپنے شباب کو روپے پیسوں سے تولتی بیچتی رہتی۔ کیا یہ کسی کی امانت میں خیانت نہ تھی؟ کیا میں جس دیوتا کو راضی کرنے کے لئے جوگن بنی تھی وہ دیوتا اپنی جوگن کی اس خیانت سے دل ہی دل میں ناراض نہ ہوگا؟ میں نے اس گلی سے نکلنے سے پہلے دریافت کیا کہ میرا پران ناتھ اس رات کس موہنی کے دھوکے میں مجھ سے مختلط ہو رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ موہنی اس کوچۂ بدنامی کی بدنام ترین ہستی ہے جو ہر رات اپنے حجلۂ عروسی کو ایک نئے جوان رعناء کی انگڑائیوں سے رنگین بناتی ہے۔ وہ ہر شب اپنی بھوک اس شکار سے مٹاتی ہے جس کی جیب بھاری ہوتی ہے اور دوسری شب اسے دھتکار کر نکال دیتی ہے۔ یہ سنکر میرے دل کو جیسے چوٹ سی لگی کہ ہائے پران ناتھ نے دل بھی لگایا تو کس جلاد سے جس کے نکھرے ہوئے رنگ اور روپ میں بے وفائی کا زہر ملا ہے۔ اُس نے آج تک یہ نہ جانا کہ محبت کیا ہے اور محبت کرنے والے کس عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں؟ اسے اپنے پروانوں کو جلانے میں لطف آتا ہے اور یہ ہنس ہنس کر پروانوں کو آگ میں جلتے دیکھکر مرنے لوٹتی ہے۔ میں نے پتہ چلایا تو معلوم ہوا کہ پیارے موہنی کی محبت میں بُری طرح گرفتار ہے۔ وہ رات دن نشہ میں چور موہنی موہنی پکارا کرتا ہے اور خود موہنی کا یہ حال تھا کہ پیارے کے نام سے وہ اپنا منہ بسورنے لگتی اور اپنی تیوری پر بل ڈال کر جلی کٹی سنانے لگتی ہے۔ میں نے پیارے کی یہ حالت دیکھکر ایک ارادہ کیا۔

جاڑے کی شام اور رات کا وہ باریک ساخط

اِمتیاز نہ جانے کب کا غائب ہو چکا تھا اور جاڑے کی لمبی اندھیری رات اپنے سیاہ بال کے گھنے جال میں دنیا کو لپیٹ چکی تھی۔

سلمان نے اُٹھکر روشنی جلائی اور خاموشی سے پھر آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

آدشا کا ضعف دمبدم بڑھکر اس کے جذبات کے تلاطم کو دھیما کر رہا تھا۔

سلمان نے پُوچھا "آدشا، تم بہت تھکی ہوئی معلوم ہوتی ہو، کیا تمہارے لئے چاء اور کچھ ناشتہ منگواؤں؟"

آدشا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"ڈاکٹر صاحب، آپ کی مہربانیاں مجھے کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہیں۔ مجھ سے آج تک کسی نے اتنے مہربان لہجہ میں بات نہیں کی، میں چاء پیونگی اور اپنی زندگی میں پہلی بار اِخلاص و شفقت کا ذائقہ چکھوں گی مگر پہلے مجھے اپنی داستان ختم کر لینے دیجئے۔ میں نے یہ سُنکر اپنا بوریہ بستر سمیٹا۔ اور ایک دن نوکرانی بن کر مُوہنی کے ہاں خدمت کرنے کی غرض سے پہونچی۔ اُس نے مجھے دیکھکر نفرت سے منہ بنایا اور اپنے چہرے پر سلک کا خوشبودار رومال رکھکر سِسکنے لگی۔

میں نے پُوچھا "بی بی جی مجھے نوکر رکھو گی؟ میں آپ کے سب کام کروں گی اور تنخواہ بھی جو دینگیں وہ لے لونگی؟"

یہ سُنکر وہ ہنسی، اِتنا ہنسی کہ اُس کے سفید گال گلاب کے پھول بن گئے، اس کی بڑی بڑی رسیلی آنکھوں میں آنسو کے قطرے موتی کی طرح چمکنے لگے۔ وہ ہنسکر اور حسین معلوم ہونے لگی پھر نفرت سے اس نے کہا "ارِی مردار، تجھ جیسی چڑیل کو نوکر رکھ کر کیا کرونگی، تجھے دیکھکر میرے نفیس مزاج رئیس منہ بنائیں گے" مجھے اپنی ایک ہمجنس کے ہاتھوں یوں ذلیل ہونا بڑا ناگوار گذرا۔ میرے پہلو میں بھی عورت کا دِل تھا اور شاید موہنی کے دِل سے بدرجہا بہتر۔ جی چاہا کہ میں بھی کچھ کہوں مگر پھر خیال آیا کہ کہاں وہ بھاگ ونتی اور کہاں میں اَبھاگن، وہ اس چیز کو ٹھکراتی ہے جس کے لئے میں دَر دَر کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہوں۔ جی مسوس کر کہا۔

"بی بی میری بدصورتی سے تمہارے حُسن کی قدر اور بڑھ جائے گی جیسے رات کی تاریکی سے دن کا اُجالا اُجاگر ہوتا ہے۔

میں باہر نہ آؤں گی کہ آپ کے نفاست پسند گاہکوں کو میری صورت دیکھکر تکلیف پہونچے؟" قصہ مختصر وہ بڑی مشکل سے مجھے اپنے ہاں نوکر رکھنے پر راضی ہوئی۔ آہستہ آہستہ میں اپنے اخلاص، خدمت اور وفاداری سے اس کی نفرت کو کم کرسکی۔ اب مجھے اس کی اجازت تھی کہ میں چپکے سے اس کے پاؤں داب دوں اور اس کے کنول جیسے بدن پر تیل کی مالش کردوں۔ رفتہ رفتہ اُس کو مجھ پر اعتبار ہوگیا اور اب وہ مجھے اپنی محبت گاہ کے کڑوے اور شیریں دونوں طرح کے قصے سنانے لگی۔

"وہ کہتی "آدشا۔ یہ راکھشش پیارے میرے جیون کا کانٹا ہے۔ اس کے پلے پھوٹی کوڑی بھی نہیں مگر اب تک اُس کے دماغ میں وہی اگلی اِمارت کے خواب آتے ہیں۔ میں نے کل رات اسے دھتکار کر نکال دیا۔ اور اپنے استاد جی سے کہا کہ موئے شرابی کو پھٹے جوتوں سے خوب پیٹو؟"

میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا "پر بی بی، وہ تو تم پر اپنی جان چھڑکتا ہے۔ پہروں تمہارے کوٹھے کی سیڑھیوں پر تیاگی بن کر تمہارے نام کی مالا جپتا ہے۔ بی بی اس سے تم کو کبھی تو محبت ہوگی؟ تم کو اپنی اسی محبت کا واسطہ، اسے یوں ذلیل کرکے نہ نکالا کرو؟"

موہنی نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔
" پگلی، روتی ہے، کیا دیوانی ہوئی ہے، ارے رکس مردار کو اس نکمّے شہدے سے کبھی بھی محبت تھی؟ وہ تو اس کو خوش کرنے کو میں نے اپنی زندگی کی دو ایک رنگین رات قیمتاً اسے دیدی تھی۔ اب میں مفت اس کے ساتھ اپنی زندگی کیوں تباہ کروں، وہ مجھے لے جا کر کہاں رکھیگا، کیا کھلائے گا؟" یہ کہکر موہنی ہنسنے لگی اور مجھے چھیڑنے کے لئے طرح طرح کی رنگین باتیں کرنے لگی۔ میں نے باتوں باتوں میں اس کا دل پھیرنے کی بہت کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا۔ وہ اپنی جگہ پر اٹل تھی اور پیارتے کا نام سنتے ہی اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔

ایک رات میں سو رہی تھی کہ موہنی کے کمرے سے شور و غل کی آواز سنائی دی۔ میں بھاگتی ہوئی پہونچی، دیکھا پیارتے تیز چھری سے موہنی پر قاتلانہ حملہ کرنا چاہتا ہے۔

میں اس خون خرابے کے ہولناک نتائج سوچ کر کانپ اٹھی اور چیختی ہوئی پیارتے سے جا کر لپٹ گئی اور کہا۔

"میرے پران ناتھ ایسا نہ کرو، بھگوان کے لئے ایسا نہ کرو، میں نے پیارتے کے دونوں ہاتھ پیچھے سے جا کر پکڑ لئے تھے اور اس مضبوطی سے کہ وہ ہل نہ سکا۔

موہنی کو موقع ملا اور وہ چیخ کر اپنے سازندوں کو جگانے لگی۔ میں نے دفعتاً محسوس کیا کہ کوئی دم میں پیارتے گرفتار ہو جائے گا۔

میں نے اپنی باہیں ڈھیلی کر دیں اور کہا "میرے جیون جوت، بھاگو اور پھر کبھی ایسے کٹھور ہردے والی بیسوا سے اپنا دل نہ لگاؤ۔ بھگوان کے لئے جلد بھاگو۔"

پیارتے بھاگ کر نیچے اتر گیا۔ موہنی یہ دیکھکر مجھ پر برس پڑی۔ پہلے اس نے خوب مجھے سڑی سڑی گالیاں سنائیں اور پھر اسی وقت مجھے اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

" چڑیل ہے چڑیل، نکل میرے گھر سے۔
رات کے ۹ بج چکے تھے مگر ڈاکٹر سلمان اسی صبر و سکون اور ایکسوئی سے اوشا کا قصّہ سن رہا تھا۔ باہر برآمدہ میں کچھ پیروں کی آواز سنائی دی۔ اس آواز سے دونوں چونک پڑے۔

کسی نے پکار کر کہا " حضور، ایک حادثہ ہو گیا ہے، مریض باہر موجود ہے۔ جلد باہر تشریف لائیے۔

ڈاکٹر سلمان نے باہر جا کر دیکھا۔

ایک حسین عورت زخموں سے چور پڑی تھی اور اس کا آخری سانس بجھتے ہوئے چراغ کی طرح جھلملا رہا تھا۔

ڈاکٹر سلمان نے جھک کر نبض دیکھی، پھر اس کا دل دیکھا، دونوں ننھی سی چڑیا کی طرح پھڑک پھڑک کر خاموش ہو چکے تھے۔

سلمان نے غم اور افسوس سے اپنی گردن جھکالی اور لاش کو اپنے دارالعمل میں اٹھا کرلے جانے کا حکم دیا۔ تانگے والے سے صرف یہ معلوم ہو سکا کہ اس عورت کا قاتل دفعتاً اندھیرے سے نکلا اور عورت پر قاتلانہ وار کرکے پھر اسی تاریکی میں کھو گیا۔ وہ عورت کی چیخ سنکر پلٹا اور مریضہ کو جس حال میں دیکھا اسیطرح اٹھا کر یہاں لیتا آیا۔

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد ڈاکٹر سلمان نے اپنی ایک مریضہ کو سارے جسم سے تہ بہ تہ چپکی ہوئی پٹیاں ادھیڑتے ہوئے ہنسکر کہا۔

" اوشا نہیں موہنی، نہیں موہنی کا چہرہ اور

اوشا کا دل، نہیں نہیں کچھ بھی نہیں۔ یہ ہے موہنی کی تصویر اور یہ رہا قد آدم آئینہ، میری بیٹی اُٹھ کر آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر کہو کہ تم اوشا ہو یا موہنی؟ مریضہ نے بے تابی سے اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں اور وہ بے اختیار ڈاکٹر سلمان کے قدموں پر گر کر بولی "میرے باپ میرے محسن، میں باپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں آپ نے ایک گری ہوئی عورت کو اُٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور اُسے وہ سب کچھ دے دیا جو وہ چاہتی تھی"

غزل

ماہر ترمذی

پہلے پہل دل دیکے انھیں یہ دل کا سودا مول لیا
اِتنی گرانی کس لئے تھی آنکھوں نے یہ عقدہ کھول لیا

حسن و محبت دونوں کو ہستی میں سمونا کھیل نہ تھا
بادہ بہ قدر ظرف دیا نظروں نظروں میں تول لیا

دِل ہی کہ اُمڈا آتا ہے آنکھیں ہیں روئے جاتی ہیں
عشق کے ہاتھوں دامن نے موتی کا خزانہ رول لیا

عشق کی آنکھیں کیسے جھکتیں حسن کا سر کیونکر اُٹھتا
دونوں خودی میں یکساں تھے کانٹے میں برابر تول لیا

حضرت آثر لکھنوی

غزل

نگہِ شوق کو یوں آئینہ سامانی دے
عشق کو حسن بنا، حسن کو حیرانی دے

دلنوازی میں بھی ایذا ہے محبت کی قسم
تجکو فرصت جو کبھی شغلِ ستم رانی دے

کچھ تری چشمِ فسوں ساز کا ایمانہ کھلا
لبِ مینوش کو تکلیف گل افشانی دے

حشر کے دن بھی تجھے آنکھ نہ بھر کر دیکھا
ان ستمکشوں کو کچھ دادِ پشیمانی دے

"ہے وہی پھول جو سر جو چڑھے" سنتا تھا
اب کھلا، دل کی رہِ عشق میں قربانی دے

آئنہ سنگِ درِ دوست ہوا تبھی تو کیا
سر جو سجدے میں جھکے، لو تری پیشانی دے

شمع درکار ہے قربانگہِ الفت کے لئے
دل کو اک شعلہ بنا، شعلے کو عریانی دے

کسی منزل میں ہو بیتاب ہے شبنم کیطرح
پرتوِ مہر جسے ذوقِ پر افشانی دے

اُف وہ پرکار جو سنتے ہی تغافل کا گلہ
عشوہ و ناز کو تعلیمِ پشیمانی دے

دلِ بیتاب تماشا کی تسلی معلوم
اپنے ہر جلوے کو اک پیکرِ انسانی دے

عشرتِ ذبح تقاضا ترا سر آنکھوں پر
جب تڑپنے کی اجازت بھی گراں جانی دے

ہر جراحت کو ہے اک تازہ جراحت کی ہوس
اور کچھ غمزۂ خونریز کو جولانی دے

اسکی انگڑائی کا عالم تو کبھی دیکھ اے گل
اور ہی حسن تری چاک گریبانی دے

چمن آرائیِ الفت کا اگر سودا ہے
اشکِ گلرنگ سے ہر شام سحر پانی دے

آؤ، شیرازۂ ہستی کو پریشاں کر دیں
یوں۔ کہ اس زلف کو پیغامِ پریشانی دے

روحِ اسلام اخوت ہے، وہی ہم میں نہیں
کفر بھی ورنہ آثر جلوۂ ایمانی دے

سید اعجاز علی

"اشتراکیت"

"نوٹ:- زیر نظر مضمون کمترین کی ان کوششوں کا ایک دھندلا سا خاکہ ہے جو مختلف مواقع پر اشتراکیت کے ضمن میں اپنی معلومات میں اضافے کی غرض سے کی گئیں۔ امید کہ ناظرین "پیام ادب" کے آئندہ صفحات میں فاشزم اور اصل دارانہ نظام پر بھی اسی سلسلے کے مضامین ملاحظہ فرمائیں گے۔"

اشتراکیت ایک ایسا معاشی و معاشرتی نظام ہے جسے سرمایہ داری کا ردِ عمل کہہ سکتے ہیں۔ سرمایہ داری میں خانگی املاک کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشتراکی خیالات بھی نشو و نما پاتے رہے۔ اور ان میں اسی نسبت سے شدت ہوتی گئی۔ جس نسبت سے کہ خانگی املاک کو سرمایہ داری میں اہمیت حاصل ہوتی گئی۔ اگر ہم اشتراکیت کی تاریخ کا خالص علمی نقطہ نظر سے مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس سے قبل بھی اشتراکی خیالات موجود تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے اشتراکین میں مارلے فرانس نیول اور بے بف قابلِ ذکر ہیں۔ سائمی (۱۷۶۰ - ۱۸۲۵) پہلا شخص تھا۔ جس نے غیر مبہم الفاظ میں اصل اور محنت کے حقیقی تضاد کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

اشتراکیت کے ارتقائی منازل کو ہم کسی طرح بھی صحت و درستی کے ساتھ مختلف ادوار میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ لیکن بہ نظر سہولت اشتراکیت کے ارتقاء کی تاریخ کو نظریاتی پہلوؤں میں تغیر و تبدل کی بنا پر تین دوروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت کا پہلا دور

اشتراکیت کا پہلا دور چارلس فوریر (۱۷۷۲-۱۸۳۷) سے شروع ہو کر ولیم تھامسن (۱۷۸۵ - ۱۸۳۳) پر ختم ہوتا ہے۔ اس کی اہم خصوصیات یہ ہیں۔

پہلے دور کے اشتراکین زیادہ تر خیالی لوگ تھے یہ اخلاق۔ تعلیم و تربیت اور انسانی فطرت کی عمدگی پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اور اتحاد باہمی کے بہت قائل تھے۔ معاشرے کی اصلاح بتدریج چھوٹے چھوٹے گروہوں سے شروع کرنا چاہتے تھے۔ اور معاشرے میں یکسانیت اور ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے خیال کے مطابق معاشرے کی مختلف جماعتوں میں کوئی فطری تضاد موجود نہ تھا۔ بلکہ جو کچھ بین فرق نظر آتا تھا۔ وہ حالات و واقعات کا نتیجہ تھا۔ جن کا حل وہ اتحاد باہمی بتلاتے تھے۔ اگرچہ ان لوگوں نے بہت کچھ بلند حوصلگی دکھائی ہے اور اس زمانے کے لحاظ سے اُن کے خیالات بہت ہی عجیب و غریب اور اشتراکیت کی پر زور حمایت میں سمجھے جاتے تھے۔ لیکن سابقین نے ان کو بھی بورژواہی قرار دیا ہے۔

ان میں چارلس فوریر (۱۷۷۲-۱۸۳۳) کو معاشی نقطہ نظر سے کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ہر محنت فی نفسہٖ خوشگوار ہے۔ مگر اس کی زیادتی اُس کو

غیر معتدل بنا دیتی ہے۔ اور اس بے اعتدالی کو دور کرنے کے لئے وہ اتحاد باہمی کے اصولوں پر انسانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں قائم کرنا چاہتا ہے جن کے افراد کی تعداد وہ (۵۰۰ اور ۲۰۰۰) کے درمیان مقرر کرتا ہے لیکن ایک معیاری بستی کے افراد کی تعداد اس کے نزدیک ۱۸۰۰ ہونی چاہیئے۔

رابرٹ اوون - (۱۷۷۱-۱۸۵۸)

اوون کو تحریک اتحاد باہمی کا بانی ہونے کی حیثیت سے بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ایک کارخانہ دار تھا اور میکانی زندگی کی تمام قباحتوں سے متاثر ہو کر وہ نفع اندوزی سٹے بازی اور مبادلے کی تمام معیشت کو سرے سے اڑا ہی دینا چاہتا ہے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے وہ فوریر سے متفق ہے۔ یعنی یہ کہ اتحاد باہمی کی بستیاں قائم کی جائیں۔

ولیم تھامسن (۱۷۸۵-۱۸۳۳)

تھامسن ہی وہ باکمال ہستی ہے جس کے خیالات سے مستفید ہو کر کارل مارکس نے اپنا مشہور نظریہ قدر زائد قائم کیا۔ تھامسن نے یہ بتایا کہ پیداوار کا انحصار صرف مزدور کی محنت پر ہے اور اس کا سب صلہ صرف مزدور ہی ملنا چاہیئے۔

دوسرا دور

اس دور کو عبوری دور کے نام سے موسوم کرنا زیادہ مناسب ہے کیونکہ اس دور کے اشتراکین اگر ایک طرف حقیقت سے روشناس معلوم ہوتے ہیں تو ساتھ ہی ساتھ ان میں دور اول کے اشتراکیں کی خصوصیت یعنی خیالی پن بھی موجود ہے۔ ان لوگوں میں سب سے پہلا لوئی بلانک ہے۔

لوئی بلانک - (۱۸۱۳-۱۸۸۲)

لوئی بلانک بھی اوون اور فوریر کی طرح مزدوروں کی اتحادی بستیوں کا قائل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ سمجھتا تھا کہ یہ مقصد حکومت کی امداد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنی کتاب "تنظیم محنت" میں بتایا ہے کہ کس طرح ہر شخص کی شخصیت کی نشوونما کی جا سکتی ہے تمام معاشرہ ایک برادری کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا افراد کو ان کی محنت کا معاوضہ ہر فرد کی پیداوار کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کی ضروریات کی بنا پر ملنا چاہیئے۔

مارکس کی طرح لوئی بھی اس بات کا قائل تھا کہ تاریخ محض جماعتوں کی جدوجہد کی داستان ہے۔

پیری جوزف پیرودھن (۱۸۰۹-۱۸۶۵)

یہ لفظ کے اصلی معنوں میں دور دوم کا اشتراکی ہے اس کے خیالات انجلز اور مارکس سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب "املاک کیا ہے" میں بتایا ہے کہ "املاک چوری ہے اور اس کے مالک چور"۔ پیرودھن کے نزدیک معاشرے کی تمام خرابیاں سود۔ لگان۔ اور زر میں مضمر ہیں۔ جن کے ازالے کے طور پر وہ ایک "مبادلہ بنک" قائم کرنا چاہتا ہے۔ جو ہر صناع سے اس کی پیداوار خرید لے اور اس کے عوض اس کو ایک نوٹ دے دے۔ جو اس کی محنت کے مماثل ہو جس سے وہ اپنی ضروریات خرید سکتا ہو۔ نیز صناع کو یہ بنک بلا سود قرض دے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر اس بنک کا قیام عمل میں آ جائے تو پھر سرمایہ داروں کو استحصال کا قطعی موقعہ نہ رہے گا۔

تیسرا دور

پیشتر اس کے کہ اشتراکیت کے مجدد اعظم کارل مارکس کی تعلیمات پر روشنی ڈالی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

تیسرے دو کے دیگر قابل ذکر اشتراکین یعنی فرڈنینڈ لاسیل اور روڈبرقس کے خیالات کی وضاحت کر دی جائے۔

روڈبرقس

روڈبرقس کو عموماً اشتراکیت کا ریکارڈو کہا جاتا ہے۔ وہ معاشی نظام کی تنظیم جدید کا حامی ہے۔ اور اس کے لئے حکومت کی امداد پر خاص زور دیتا ہے۔ معاشرے کی اصلاح کے لئے وہ مندرجہ ذیل سفارشات پیش کرتا ہے۔

(۱) پیداوار کو اس طرح منظم کیا جائے کہ اس سے ضروریات پوری ہو سکیں۔

(۲) ذرائع پیدائش کو پورے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

(۳) پیداوار کو پیدا کنندگان میں انصاف کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔

وہ اپنی تینوں سفارشات کو روبعمل لانے کے لئے مدلل تجاویز پیش کرتا ہے جن کا تذکرہ چند ان موزوں نہیں۔

گھٹتی ہوئی اجرت کے نظریہ سے وہ ایک اور اہم نظریہ اخذ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب مزدوروں کی اجرت کم ہوتی ہے۔ تو وہ کمی اجرت کے باعث اشیاء نہیں خرید سکتے جس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ طلب کم ہو جاتی ہے۔ اور تاجر رسد کو محدود کرنے کی ٹھانتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ بے روزگاری۔ بحران اور کساد بازاری کی شکل میں نمونما ہوتا ہے۔ اس نے اوقات کار کے تعین کو قانونی جامہ پہنانے پر بھی زور دیا ہے۔

فرڈنینڈ لاسیل (۱۸۲۵ - ۱۸۶۴)

فرڈنینڈ لاسیل اپنے ہمعصر اشتراکی روڈبرقس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اور ایک اعلیٰ درجے کا مقرر بھی تھا

نظریاتی طور پر وہ مارکس کی اشتراکیت سے متفق ہے۔ اس کو شہرت محض اس وجہ سے حاصل ہے۔ کہ اس نے ریکارڈو کے نظریات اجرت کو آہنی نظریوں کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے نزدیک سرمایہ داری میں مزدور کا مستقبل بہت زیادہ تاریک اور غیر یقینی ہے۔ وہ سرمایہ داری کا بہت شدید مخالف ہے۔ اور انفرادیت کا بھی سخت دشمن ہے۔

جرمنی میں مُلکتی اشتراکیت کی ترقی

اشتراکیت کی ہماری یہ داستان ادھوری رہ جائے گی اگر ہم جرمنی میں مُلکتی اشتراکیت کے ارتقاء پر روشنی نہ ڈالیں۔ ہمارا یہ بیان کرنا اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے جبکہ اس امر کو پیش نظر رکھا جائے کہ کارل مارکس ایک جرمن تھا اور جرمن مکتب خیال اور ماحول کا اس کی ابتدائی زندگی پر جو اثر ہوا اس کی تصانیف میں اسکی جھلک موجود ہے۔

مُلکتی اشتراکیں کا خیال ہے کہ حکومت کا کام محض امن و امان قایم رکھنا نہیں ہے۔ حکومت ایک زبردست اخلاقی بندھن بھی ہے جو معاشرے کے مختلف افراد اور جماعتوں کو منسلک کرتی ہے۔ اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ معاشی مرفہ الحالی اور تہذیب و تمدن کو برقرار رکھے۔ اس خیال کو کہ حکومت میں ان تمام امور کی انجام دہی کی قابلیت موجود نہیں واگنر نے اپنے اجتماعی نظریئے سے باطل کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ واگنر مُلکتی اشتراکیت کے مندرجہ ذیل فرائض بتلاتا ہے۔

(۱) معاشرے کے ادنیٰ طبقے کو اعلیٰ بنانا۔

(۲) اعلیٰ طبقات معاشرہ پر بھاری بھاری محاصل عاید کر کے ان کی آمدنیوں کو کم کرنا۔

(۳) ایسی تمام صنعتوں کے انفرادی اجاروں کو ختم کرنا جو بہ حیثیت مجموعی قومی مفاد کے لئے ناگزیر ہو جیسے نمک سازی۔

کارل مارکس کی اشتراکیت!

اشتراکیت کی مفصل اور مکمل تعلیم کارل مارکس کی مشہور کتاب کیپٹل میں ملتی ہے جو تین حصوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس کی پہلی جلد مارکس کی زندگی میں ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی اور باقی دو جلدیں اس کے دوست اینجلز نے ۱۸۸۵ء و ۱۸۹۴ء میں شائع کیں۔ علاوہ ازیں منجملہ مارکس کی اور تصانیف کے "اشتمالی اعلانیہ" جس کو اینجلز اور مارکس نے مل کر تصنیف کیا ہے اشتمالیت کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔

کارل مارکس کو خاص شہرت اس وجہ سے حاصل ہے کہ اس نے اشتراکیت کو بالکل نئے رنگ میں پیش کیا۔ اس کے دور میں اشتراکیت معاشیات کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مارکس کی اشتراکیت معاشی دلائل کا سہارا ڈھونڈتی ہے۔ اور ہر دلیل معاشی حقائق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ اور تاریخ عالم کو اسی کی روشنی میں پڑھا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی سے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔

مارکس کی تعلیم کا خلاصہ:۔

(۱) تاریخ کی مادی تعبیر۔

اس سے یہ مراد ہے کہ تمام تاریخی جد وجہد کی تہ میں معاشی اسباب کارفرما ہیں۔

(۲) اس سے یہ ثابت ہوا کہ جماعتوں میں باہمی تضاد ہوتا ہے اور تاریخ محض اس تضاد کی داستان ہے۔ ایک جنگ کے اختتام پر دوسری جنگ کے لئے تیاری شروع کر دی جاتی ہے۔

(۳) نظریۂ قدر۔

کسی چیز کی قدر محض وہ محنت ہے جو اس کی تیاری پر صرف ہو۔

(۴) اسی نظریئے سے مارکس قدر زائد یا متزاید کا نظریہ حاصل کرتا ہے۔ مارکس لکھتا ہے کہ مزدور اپنی محنت فروخت کرتا ہے۔ اس کی محنت سے اتنی شئے پیدا ہوتی ہے جو اس کی مزدوری سے زائد ہوتی ہے۔ ان دونوں کا فرق، فرق زائد ہے۔ جس کو اصل دار خود قابو کر لیتا ہے۔ اور اس طرح مزدور کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ اور یہی اصل و محنت کے تضاد کا بڑا سبب ہے۔ مارکس اس بات کا قائل ہے کہ اصل دار کی اس ہوس پر قابو نہ رکھا جائے تو یہ اصل دار کو استحصال پر مجبور کرے گی جس سے مزدوروں کے مصائب میں اضافہ ہوتا جائے گا اور صنعتی مزدوروں کی ایک ایسی جماعت بنتی چلی جائے گی جو یا تو کلیتہً بے کار رہو گی اور یا اس کو پورا کام نہ مل سکے گا۔

(۵) قانون اجتماع اصل۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ذرائع پیدائش ایک بہت ہی مختصر جماعت کے لئے مختص ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ بڑھتی ہوئی کساد بازاریوں کا شکار ہوتا جاتا ہے۔ اور بالآخر خود شکاری شکار بن جاتا ہے۔

(۶) بورژوائی طبقے کی مخالفت کے باوجود وہ اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ طبقہ بالکل بے کار ثابت نہیں ہوا جاگیریت کے نظام کو تباہ کرنے میں اس نے نہایت اہم خدمات انجام دیں ہیں۔ اور پیدائش اور صرف میں بین الاقوامیت پیدا کر دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس طبقہ نے یہ نقصان پہنچایا ہے کہ پیدائش و صرف سے اجتماعیت کا خیال بالکل دور کر دیا ہے۔ اور معاشرے کو خودغرض بنا دیا ہے۔ اس جماعت نے ایک یہ بھی خدمت انجام دی ہے۔ کہ معاشرے کے ایک بڑے حصے کو دیہی زندگی کی کلفتوں سے نجات دلائی۔ اور

اُن کو شہروں کے تہذیب و تمدن سے روشناس کرایا۔ لیکن جس طرح جاگیریت کی زنجیریں پیدائش کے لئے اس قدر بھاری ہوگئی تھیں کہ اُن کو توڑے بغیر چارہ نہ تھا۔ اب یہی حال اصل دار طبقے کا ہے۔ اور اب اُن کی زندگی کا چراغ ٹمٹما رہا ہے۔ چنانچہ مارکس لکھتا ہے وہ ہتھیار جن سے بورژوائی طبقے نے جاگیریت کے نظام کو فتح کیا تھا۔ اب وہی ہتھیار اُن کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ بورژوائی طبقے نے نہ صرف وہ ہتھیار تیار کئے جو اُن کے لئے موت کا سامان بنیں گے بلکہ ایک ایسا طبقہ بھی پیدا کر دیا ہے۔ یعنی پرولتاری طبقہ جو اُن کو اُن ہتھیار سے موت کے گھاٹ اتار دے گا"

مارکس کی اشتراکیت کلیتہً طبقہ پرولتاریہ کے لئے ہے اور اس کی مقبولیت کی یہی سب سے بڑی وجہ ہے دوسرے اشتراکیین جن کی تعلیم کسی زمانے میں بہت مقبول تھی۔ وہ بالکل بھلائے جا چکے ہیں۔ اور اُن کی تعلیم فنا کے گھاٹ اتر چکی ہے۔ جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کی "اپیل" کلیتہً عام تھا۔ اس لئے وہ خاص طبقوں کی انیسویں صدی کے نصف اول کے اشتراکیین کی تعلیم اس قدر عام تھی کہ اس میں سوسائٹی کا ہر فرد شامل تھا۔ اُن کی تعلیم مزدوروں کے لئے اور امیروں کے لئے یکساں تھی اوون۔ فوریہ۔ سامئی زیادہ تر امیروں پر ہی سہارا رکھتے تھے۔ اور تمام مشکلات کا حل اتحادی بستیوں کا قیام گردانتے تھے۔ لیکن مارکس اس کے بالکل برعکس ہے وہ بورژوائی طبقے کو مزدوروں کا دشمن اور معاشرے کا قاتل خیال کرتا ہے۔ اور معاشرے کی نجات اس طبقے کی فنا میں سمجھتا ہے۔

یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکیت کا ہمیشہ سے یہ مفہوم رہا ہے کہ وہ غریبوں کی امداد اور دولت کی صحیح طور پر تقسیم کرے۔ لیکن مارکس اس کو ایک حکیمانہ اصول کی حیثیت دیتے ہوئے۔ اسے طبقہ واری جنگ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ جنگ مزدور اور آجر یا غریب اور امیر کے مابین ہے یہ جماعت واری جنگ" ان الفاظ میں اس قدر سحر پنہاں ہے کہ جو لوگ مارکس کے نظریوں کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اس کی پیروی کرنا اپنی معراج سمجھتے ہیں۔

ایک آخری چیز جو مارکس کی اشتراکیت کی نمایاں خصوصیت ہے وہ اس کا انقلابی عنصر ہے۔ یہاں پر انقلابی عنصر کی تشریح کر دینا زیادہ مناسب ہے۔ مارکس کے نزدیک انقلاب سے مراد کشت و خون کی ندیاں بہا کر اوپر کی مٹی نیچے کرنا نہیں بلکہ وہ انقلاب سے محض موجودہ قوانین کی جگہ نئے قوانین کا اجراء مراد لیتا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ مارکس گاندھی جی کی طرح عدم تشدد کا حامی تھا۔ بلکہ وہ تو کہتا ہے کہ اگر تشدد سے کام لینا پڑے تو اس میں ہرگز ہرگز دریغ نہ کیا جائے۔

مارکس کے اشتراکی نظام میں مذہب کا کوئی دخل نہیں وہ مذہب کو معاشرے کے لئے سم قاتل قرار دیتا ہے یعنی

مارکسی اشتراکیت میں معاشرے میں ہم آہنگی نہیں بلکہ تضاد ہے اور مارکس کو صرف مزدوروں کی ہی حکومت چاہیئے اور اس کا نظام طبقہ واری جنگ سے قائم کیا گیا ہے۔ اس نظام میں نہ تو خانگی املاک کے لئے کوئی جگہ ہے نہ وراثت کے لئے اور نہ ہی شخصی آزادی کے لئے۔ یہ ایک شدید مرکزی نظام ہے۔ جس میں پیدائش دولت کے جملہ کام مرکز ہی کے تحت سرانجام پاتے ہیں۔

اشتراکیت کے اساسی اصول

اشتراکیت کا مقصد محض یہ نہیں کہ وہ سرمایہ داری کی برائیوں کو دور کرے۔ بلکہ وہ بذات خود ایک مکمل نظام ہے جو سرمایہ داری کی جگہ لینا چاہتا ہے اور معاشرہ کو

خوشحال بنانا چاہتا ہے۔ اس خوشحالی کو حاصل کرنے کے لئے جو مختلف اصول بیشتر اشتراکین نے پیش کئے اُن کا مختصر بیان اُوپر گزر چکا ہے۔ مگر وضاحت کی خاطر اب اُن کو یکجا طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

"اشتراکین کے نزدیک معاشرے کی اہم ضروریات حسب ذیل ہیں اور اُن کی عدم موجودگی میں بنی نوع اِنسان کی اجتماعی خوشحالی ناممکن ہے۔

(۱) املاک کی اجتماعیت۔ خانگی اِملاک کو اڑا دیا جائے۔

(۲) وراثت کو نابود کر دیا جائے۔

(۳) دنیا میں مساوات قائم کی جائے۔

(۴) عالمی ریاست قائم کی جائے۔

(۵) مزدور پیشہ جماعت کی حکومت۔

(۶) غیر مکتسب آمدنی کو ناممکن بنا دیا جائے۔

(۷) مرکزیت۔ معاشی زندگی کا جملہ نظام مرکزی حکومت کے تحت ہو۔

(۸) اِنفرادی آزادی کی تحدید۔

(۹) مذہب کا اخراج۔

موجودہ اِشتراکیں مندرجہ بالا امور کو ہی اشتراکیت کے اساسی اُصول گردانتے ہیں۔ اور تقریباً تقریباً انہی اصولوں پر روسی معیشت کا تناور درخت قائم ہے جو بادِ مخالف کے شدید ترین سے شدید ترین جھونکوں کا مقابلہ بھی نہایت ہی اولوالعزمی اور دلیری سے کر رہا ہے لیکن روس میں اِشتراکیت کے پورے اصولوں پر ابھی مکمل طور پر عمل نہیں ہو رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں تاحال پرولتاریہ کی آمریت ہے جو اس وقت تک قائم رہے گی جب تک کہ تمام عالم سمٹ کر اشتراکیت کے دامن میں پناہ نہ لے لے۔ اور فی الوقت اِس قسم کی عالمی اِشتراکیت کے اِمکانات پر کچھ کہنا نہایت ہی قبل از وقت ہے۔ یہ محض آنے والا زمانہ ہی بتا سکتا ہے کہ اِشتراکی طرزِ معیشت کس حد تک ہمیں معاشی و معاشرتی مشکلات سے نجات دلا سکتا ہے۔ یہ امر قابلِ غور ہے کہ اشتراکیت ہی وہ نظام ہے جس میں کسان کاشت کر کے اس کا پھل خود حاصل نہیں کر سکتے بلکہ وہ مرکزی حکومت کی ملک متصور ہوتا ہے۔ تجارتی اَفراد کو آزادی حاصل نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فرد واحد کو ایک شئے حقیر سے زیادہ وقعت حاصل نہیں۔ شائد اِسی لئے علامہ مرحوم نے فرمایا تھا۔

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

اِشتراکیت کے منجملہ اور قبیح پہلوؤں کے یہ بھی ایک پہلو ہے۔ جس پر سرسری رُوشنی محض اس وجہ سے ڈالی گئی ہے کہ کہیں ہمارے نوجوان پرجوش قارئین شیشی کی رنگت دیکھ کر ہی مست نہ ہو جائیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ملاحظہ کر لیں کہ اُس کے اندر کیا ہے۔ بزرگوں کا قول ہے کہ رنگ والی (بہ معنی رنگین) شیشی بیچ میں سے خالی ہوتی ہے۔ اور پھر فہم و فراست کا بھی تو یہ تقاضا ہے کہ ہم کونین کی اس گولی کو جس پر شکر کی تہ جمی ہوئی ہوتی ہے۔ محض شیرینی سمجھ کر ہی نہ نگل جائیں بلکہ پہلے اِطمینان کر لیں کہ یہ مریض کو تندرست بھی کر سکتی ہے یا نہیں؟

علامہ بہزاد لکھنوی

غزل

میری دعا یہ ہے کہ میری چشم تر نہ ہو
میرے ملال عشق کی اُس کو خبر نہ ہو

مجھکو نہیں پسند یہ الجھن کی زندگی
وہ شام چاہتا ہوں کہ جس کی سحر نہ ہو

بیتابی جبین محبت میں لطف ہے
سجدہ وہاں کرونگا جہاں سنگ در نہ ہو

یارب اسی طرح رہے راز و نیاز شوق
روداد زندگی کی کبھی مختصر نہ ہو

کھویا ہوا ہوں لذت جام شراب میں
ساقی کی چشم مست ابھی ادھر نہ ہو

اک درد لا دوا تو عطا کر دیا کریم
ایسی بھی ایک آہ جس میں اثر نہ ہو

اب تو سکون پذیر سی ہے کاوش حیات
بہزاد کاش کوئی میرا چارہ گر نہ ہو

مرسلہ پرشوتم سنگھ سیٹھی

از خان اصغر حسین خان
نظیر لودھیانوی

تاثرات

دھوم ہے سارے جہاں میں کہ خدا کوئی نہیں
اپنا ایمان یہ ہے تیرے سوا کوئی نہیں

رنگ و نکہت کا یہ سیلاب کہاں سے آیا
کس طرح مان لیں ہم جلوہ نما کوئی نہیں

سحر و شام بصد شوق رواں ہوں اس میں
جس بیابان میں نشان کف پا کوئی نہیں

زندگی ایسے زمانے میں ملی ہم کو کہ جب
مرد حق کوئی نہیں اہل وفا کوئی نہیں

خاتمۂ سلسلۂ جور کا دیکھا کس نے
اُس جہاں میں ہیں جہاں حد جفا کوئی نہیں

چارہ سازوں کو رہی چارہ گری کی حسرت
درد وہ ہم کو ملا جس کی دوا کوئی نہیں

کس قدر اہل گلستاں کو ہے صیاد کا ڈر
موسم گل ہے مگر نغمہ سرا کوئی نہیں

حال اس عہد پر آشوب کا کیا کہیئے نظیر
مختصر یہ ہے کہ جینے کا مزا کوئی نہیں

وہ کتابیں جن کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں کہی جاسکتی؟

گرداب، رنگ محل، زندگی کے نئے زاویئے، یقین و عمل، ٹیگور اور انکی شاعری
سیاست جاپان، جنگ اور روپیہ، اقبال کا تصور زمان و مکان، جناح کے خطوط اقبال کے نام
۱۰ ر   ۱۰ ر   ۱۲ ر   ۵ ر

اخلاق حسین عارف

ضمیر کی آواز

ونود کی میز پر سبز غلاف سے ڈھکا ہوا، برقی قمقمہ، محدود دائرہ میں اپنی روشنی پھیلا رہا تھا جس کے گرد دو چار پروانے چکر لگا رہے تھے، ورنہ دفتر کے بڑے ہال میں ہلکی ہلکی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سامنے کی کھڑکی کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا جس میں سے تاروں بھرا آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔

کبھی کبھی سیاہ و زرّین سحاب پارے گم کردہ راہ مسافر کی طرح بھٹکتے ہوئے آتے اور ایک لمحہ کے لئے ہنوز ماہتاب کو اپنی آغوش میں چھپا کر فضا میں تیرتے ہوئے دوسری طرف نکل جاتے تھے۔ اُفق پر ستارے بھی آپس میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ہوا کی لطیف سرسراہٹ کبھی کبھی ایک ترنم پیدا کرتی ہوئی کھڑکی سے اندر داخل ہوتی مگر ہال کی خاموشی اور سکوت سے گھبرا کر پچھلے پاؤں واپس چلی جاتی تھی، عمارت کے باہر احاطہ میں آراستہ گل میز روشیں اور رنگا رنگ کے پھولوں سے لدی ہوئی بیلیں، شمیم فرحت افزا سے مست و بے خود ہو ہو کر جھوم رہی تھیں۔

ونود، میز کے سامنے، وسطی کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے دِل اور ضمیر کی نبرد آزمائی کے کرشمے محسوس کر رہا تھا۔ دل اندر ہی اندر کہہ رہا تھا—— ایسے مواقع شاذ و نادر ہی آیا کرتے ہیں . . . . ملتی ہوئی چیز کو ٹھکرانا سب سے بڑا کفرانِ نعمت ہے . . . . . ایک ذرا سی ہمت سے کام ——، تو چشم زدن میں رئیس بن جائے گا . . . .

دِل کہہ کر خاموش ہوا تو ضمیر بول اُٹھا——
نہیں، نہیں، . . . . تیرا مُشیر نادان ہے . . . . . .
یہ تجھے آقا کا نمک حرام ہونے کی دعوت دے رہا ہے . . . . .
شریفوں کا یہ شیوہ نہیں کہ جس ظرف میں کھائیں اُسی میں چھید کریں . . . . . تیرے پائے صداقت میں لغزش نہیں آنی چاہیئے . . . . چاہے تیری موجودہ زندگی میں کبھی فرحت افزاء انقلاب رونما ہو . . . . . . اپنے قوتِ بازو پر بھروسہ رکھ، اور میرے مشورہ پر عمل پیرا ہو . . . .

دِل نے یہ باتیں سنیں، پھر ایکبار گویا ہوا——
تیرا ضمیر تجھے دھوکا دے رہا ہے—— اگر تو اس کی نصیحتوں پر عمل پیرا ہوا تو یاد رکھ تو اپنے دُوست پر تھوڑی سے جھوٹا بھی بننے لگا اور دنیا کی لطافتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم رَہ جائے گا—— شرافت—— عزت؟—— نمک حلالی؟—— ایمان داری؟—— یہ سب چیزیں دَولت سے خریدی جاسکتی ہیں! —— عاقبت نا اندیش ہیں وہ لوگ، جو آئے ہوئے سُنہری موقع کو ہاتھ سے جانے دیں——

وہ گھبرا کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے ! وہ سوچ رہا تھا کہ دل کے مشورہ پر تجوری کھولکر ڈائرکٹر شانتا رام کے شام کے رکھے ہوئے لفافہ کو نکال کر رات کو گیارہ بجے کی ریل سے بھرت پور کے لئے روانہ ہو جائے؟—— ایک لاکھ کے نئے نئے نوٹ

——— ہاں! اس طرح وہ پرتھوی کے ساتھ کوئلہ کی کان میں شرکت کرکے تھوڑے دنوں میں رئیس ہو جائیگا ——— کیا مضائقہ ہے؟ ——— پھر تو ذاکر کشور شاقا رام کو وہ رقم واپس بھی کر سکتا ہے ———؟

مگر ضمیر؟ اس کے دل کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے تھا ———!

وہ بھاری بھاری قدم رکھتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے آسمان کو دیکھا، رات کا ابتدائی حصہ ..... پھر اس کی نگاہیں رفتہ رفتہ شہر کی سر بہ فلک عمارتوں پر پڑیں، ..... بڑی بڑی حویلیاں .... اُن کے رہنے والے رئیس اور دولت کی آغوش میں پلے ہوئے سرمایہ دار ...... عیش و عشرت کے نشہ میں سرمست و سرشار، اُن کے دن اعیانیت کی ہنگامہ آرائیوں سے لبریز، اُن کی راتیں دلچسپیوں اور دلفریبیوں سے بھری ہوئی ——— ہر طرف مسرت و شادمانی کا دور دورہ ———

دِل نے کہا .... دیکھ! .... آنکھیں کھول کر دیکھ!! .... انسان انہیں لطافتوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور یہ لطافتیں انسان کے لئے .... کیوں نادان بنتا ہے اچل... ... ہمت کر، ذرا دیر میں ہی مسرت و انبساط تیرے حصہ میں فراوانی کے ساتھ آجائے گی۔ اور ابھی؟ وہ تجھ سے دُور بھاگتی ہے! .... ونود پر دل کا جادو چل گیا ———!

سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سرعت سے وقت کے گزرنے کا اعلان کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ میز کے قریب گیا اور برقی قمقمے کا بٹن دبا دیا۔ ہال میں گھپ اندھیرا ہو گیا۔ بعد ازاں اس نے کھڑکی کا پٹ بند کرکے چٹخنی لگادی اور تجوری کی طرف بڑھا۔ گھبراہٹ میں اس کی پیشانی پر پسینہ کے قطرات مجتمع ہو گئے تھے۔ مگر اس کا دل اس کی معاونت کر رہا تھا۔

ضمیر کے تاثرات بھوکے اور لاغر مزدور کی طرح مغلوب ہو چکے تھے۔ اگرچہ ونود کی انگلیاں پھرتی سے مصروفِ عمل تھیں مگر اس کا دماغ بے قابو ہوا جا رہا تھا اپنے کام میں آسانی اور عجلت کے پیشِ نظر اس نے اندرونی جیب سے برقی لیمپ نکالا اور اس کی مدد سے اس نے تجوری کے کھٹکے میں چابی ڈالکر گھمائی تجوری کھولکر اس نے اپنا ہاتھ اندر ڈالا۔ ٹارچ کی محدود روشنی کی مدد سے اس نے زرد مہر شدہ سرخ فیتہ سے بندھا ہوا لفافہ نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھا اور جلد جلد تجوری کو بند کرتے ہوئے وہاں سے ہٹ آیا۔

اَب اس کے دل نے اپنے قرب میں وزنی لفافہ کو رکھے ہوئے محسوس کرکے اظہار اطمینان کیا دِل اپنے مقصد میں کامیاب و سرخرو ہو چکا تھا ———!

ایک لاکھ کے نوٹ! .... بینک کے مختار کی ذاتی ملکیت، .... وہ ان روپوں کو اپنے تصرف میں لاکر بہت جلد اصل کا اصل ایک قلیل عرصہ کے کاروباری ردّو بدل کے بعد شاقا رام کو کوڑی کوڑی ادا کر دیگا ——— اس نے سوچا!

دِل نے ونود کو اطمینان دلایا، اَب تیری قسمت چمک اُٹھی .... حاسدین تیری خوشگوار زندگی دیکھ کر کڑھیں گے! اور تیرے دوست مسرور ہوں گے .... روپیہ کو روپیہ کھینچتا ہے۔ چندہی ماہ کی مسلسل تگ و دو میں ہزاروں کا اضافہ ہو جائے گا .... زندگی جدوجہد کا نام ہے، اس میں ایسے مواقع آیا ہی کرتے ہیں! .... صحیح معنوں میں زندگی کا اب سے آغاز

ہو رہا ہے! . . . . گداگری اور غلامی بھلا زندگی میں شمار کی جاسکتی ہے ——— ؟

وہ اِنھیں تخیلات میں شاداں و فرحاں باہر کی طرف اندھیرے میں بڑی احتیاط سے ٹٹولتا ہوا دیوار کے سہارے چلا جا رہا تھا کہ تصویر کے دوسرے رُخ نے نمایاں ہو کر اپنا عکس بلیغ دکھایا۔

خاندانی روایات کو پس پشت ڈال کر، اخلاق و فرائض سے بے بہرہ اور بے نیاز، ایک تعلیم یافتہ نوجوان اگر دوسروں کی گاڑھی کمائی سے ناجائز فائدہ اُٹھائے ———

اپنے آقا کی نمک حرامی کر کے اُس کی لاعلمی میں اسکی دولت پر قبضہ کر کے ناجائز سرور حاصل کرے ——— اندھیرے میں دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر فرار ہو اسے عرفِ عام میں کیا کہیں گے ؟

. . . . . . چور! . . . .

ونود آخری لفظ پر چونکا اور ٹھٹک کر اسی مقام پر کھڑا ہو گیا۔

ایک مرتبہ پھر اُس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالکر لفافہ پکڑا وہ تذبذب کے عالم میں پڑا ہوا تھا ——— !

اُس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ دوسرا ہاتھ وزنی لفافہ کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا ——— اور! . . . . اُس کا ضمیر' اس کے مرے ہوئے باپ کی شبیہ بنکر اُس کی نظروں کے سامنے موجود تھا' جو ایمانداری اور نیک نیتی کا نمونہ تھا' وہ باپ' جس کی زندگی دوسروں کے لئے درسِ عبرت تھی اور اس نامور' ایماندار اور مخلص باپ کا بیٹا' ایک ادنیٰ' چور ——— ؟

ونود نے وزنی لفافہ اپنی جیب سے نکال لیا۔ اور تاریکی میں اپنی منفرد تحقیر آمیز نظریں اُس پر جما دیں

وہ تجوری کی طرف مڑا ——— ہال میں لگی ہوئی گھڑی نے اُس کے تخیلات کو اپنی ٹِک ٹِک، ٹِک سے منتشر کر دیا۔

ضمیر کی تمام نصیحتوں اور مُردہ باپ کی شبیہ پر پانی پھیرنے کے لئے دل ایک مرتبہ پھر آمادہ بہ پیکار نظر آیا۔

اور آخر اُسی کی فتح ہوئی . . . . !

ونود جلد جلد قدم بڑھاتا ہوا باہر کے دروازے کی طرف جھپٹا مگر جب وہ ڈائرکٹر کے کمرہ کے قریب سے گزر رہا تھا' تو اُسے ایک دبی ہوئی نسوانی چیخ سنائی دی اور ایک ہی لمحہ بعد شیلا کے مُنہ سے نکلی ہوئی مبہم اور بے ربط الفاظ سُنائی دیئے۔ ونود کے قدم بھاری ہوگئے۔ اُس کا سر چکرانے لگا اور نہ معلوم کونسا خیال اُس کے لئے سوہانِ روح بن گیا۔

اگر شیلا نے اُس کی تمام کارروائی دیکھ لی ہو تب ؟

اُس کے ضمیر نے اُسے بروقت متنبہ کیا۔

وہ ہنوز کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ کمرے کے اندر سے کسی نے سوال کیا۔

"کیا ہال میں کوئی ہے ——— ؟"

ونود موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے جلدی سے بول اُٹھا "ہاں' . . . . میں"

شیلا کمرے سے گھبرائی ہوئی نکلی اور ونود سے بے تحاشا لپٹ گئی۔ ونود نے اُسے تشفی آمیز انداز میں اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اُس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"کیا ہوا مِس شیلا! کیا آپ اندھیرے سے ڈر گئیں ——— ؟"

شیلا کو ونود کی موجودگی سے گونہ ڈھارس ہوئی

اَب وہ اپنے ہوش وحواس میں آچکی تھی۔

وہ جلدی سے ونود کی آغوش سے علیحدہ ہوتے ہوئے بولی:۔

" اوہ، معاف کیجئے گا مسٹر ونود۔

" نہیں۔ نہیں کوئی بات نہیں ——— "

" مسٹر ونود! دراصل میں تنہائی کی غرض سے پاپا کے کمرے میں بیٹھ کر " کلا تسٹرا اینڈ دی ہرتھ" کا مطالعہ کر رہی تھی ——— کمبخت کی کل میعاد پوری ہو رہی ہے اور مجھے یونیورسٹی لائبریری کو کل ہی واپس کرنی ہے ——— مجھے دفتر میں کسی کی موجودگی کا علم نہ تھا۔ . . . . گر یکایک میز کی برقی روشنی گل ہوجانے سے چونک پڑی۔ پہلے تو میں اُس کے وجوہ کے متعلق غور کرتی رہی ——— میں سوئچ تک اندھیرے میں ٹٹول کر پہنچنا میرے بس کی بات نہ تھی ——— ایک پل کے لئے میں نے آنکھیں بند کرکے سکون حاصل کیا اور جب میں دہشت کی تاب نہ لاسکی تو میرے منہ سے خوف میں ایک چیخ نکل گئی۔

اَب یہ دونوں باتیں کرتے کرتے دفتر سے نکل کر روشوں پر آپہنچے تھے۔ شیلا کی گفتگو ختم ہونے پر ونود بولا۔

" مس شیلا! مجھے واقعی اپنی غلطی کا از حد افسوس ہے، میں سمجھتا تھا کہ میرے سوا آفس میں کوئی نہیں ہے اور میں حسب معمول دیر سے اپنا کام ختم کرکے روشنی بجھا کر چلا تھا کہ چابی چوکیدار کو دے کر مکان کو جاؤں ——— اگر اجازت دیجئے تو میں آپکو بنگلہ تک پہنچا دوں ——— بھلا ڈائرکٹر صاحب اس حماقت بھری حرکت کو سنیں تو مضحکہ ہی تو اڑائیں ——— " ونود نے زہریلی ہنسی کے ساتھ اپنا جملہ تمام کیا۔

" مگر میں . . . . " شیلا کے جملہ کو ونود نے قطع کرلیا۔

" رات کافی ہوجائے گی اور وہ بے چینی سے آپ کا انتظار کرنے لگیں گے!"

" مگر میں اس وقت بنگلہ پر جانا نہیں چاہتی مسٹر ونود! . . . . چلئے کسی فرحت افزاء مقام پر چند گھڑی بیٹھ کر اِس پریشان کن حادثہ کو فراموش کردیں۔

اُس نے ونود پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہوئے بڑی معصومیت سے کہا۔

وہ لوگ اِس سے پیشتر بھی کئی بار مل چکے تھے مگر اُن کی ابتدائی ملاقاتیں آقا زادی اور ملازم کے امتیازات کی حامل تھیں۔ ہاں ایک مرتبہ، جب سے ونود نے شیلا کو ایک موٹر کے حادثہ سے بال بال بچایا تھا، اس وقت سے رفتہ رفتہ یہ لوگ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے چلے گئے تھے۔ ونود اور شیلا تقریباً ہم عمر تھے، اس لئے ان کا فوری اشتراک حیرت انگیز نہ تھا مگر ونود کاروباری مصروفیات میں اس قدر اُلجھا رہتا تھا کہ وہ شیلا کی محبت کے معاملہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی دلچسپی نہ لے سکا۔ شیلا بھی ونود کے مردانہ حسن اور ذاتی محاسن وقابلیت کی دل ہی دل میں والہ وشیدا تھی مگر نسوانی حیا، اُس کے اظہار خیال پر غلبہ پائے ہوئے تھی ——— اس طرح نہ اِدھر سے کبھی ابتداء ہوئی نہ اُدھر سے۔ مگر

آج ——— !

آج حسنِ اتفاق نے ان دونوں پرستاروں کو اپنی محبت کے اظہار کا موقع دیدیا تھا۔ اگرچہ ونود کا دل شیلا کی تجویز پر عمل پیرا ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ گر وہ انکار بھی نہ کرسکا ——— !

کیوپڈ اپنا کام کرکے فضا کی لامحدود وسعتوں میں گم ہوچکا تھا ——— !

یہ لوگ اِسی طرح ٹہلتے ہوئے ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے، قریب کے ایک خوشنما باغیچے میں پہنچے جو ایک چھوٹی سی پہاڑی پر واقع تھا۔

اب ماہتاب بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سارے عالم پر نور کی بارش کر رہا تھا۔ دونوں باغیچہ کے سبز مخملی فرش پر بیٹھ کر فطرت کی رنگینیوں میں کھو گئے۔

ماہتابی رات! ——— تقویٰ شکن سماں! خوشگوار جھلکتی ہوئی نورانی چادر، بادِ صبا کے لطیف جھونکے! وِنود بظاہر خوش تھا مگر اُس کی کوئی باطنی قوت اپنی کبیدگی کا اظہار کئے جا رہی تھی ———!

پھر بھی ———

بہت دیر تک دونوں نقرئی چاندنی کی مستی و سرشاری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ بعض اوقات وِنود فطری طور پر اپنی ہم جلیس کے انتہائی قرب کے احساس سے اپنی رگوں میں تلاطمِ جذبات اور جوششِ ترنگ کی سیابی کیفیت پیدا ہوتی ہوئی محسوس کرتا ———!

شیلا نے وِنود کو پیامِ محبت دیا، وِنود نے بے خودی میں اُسے سر آنکھوں پر قبول کیا اور ——— کچھ لمحہ اور یہ لوگ فطرت کی رنگینیوں میں جذب رہ کر پیمانِ وفا کا اقرار کرتے ہوئے اپنی اپنی جائے قیام کو واپس ہوئے۔

وِنود باغیچہ کی واپسی پر بڑی تیز گامی سے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اُس کے بہکے ہوئے قدم مکان کی طرف اُٹھ رہے تھے اور اُس کا دل مسرت و انبساط میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر بھی ضمیر تصویر کے بھیانک رُخ پر روشنی ڈال ہی رہا تھا۔ اسی فرحت و وحشت کی کشمکش میں مبتلا نہ جانے وہ کن کن خیالات کا سامنا کرتا ہوا مکان پہنچ گیا۔

اُس نے جلدی جلدی سامانِ سفر کی تیاری کی اور شیلا کو ایک پہلا اور آخری خط لکھنا شروع کیا۔ اُس نے تقریباً آدھا خط لکھا، پھر نہ معلوم کن جذبات سے متاثر ہو کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور اپنی اندرونی جیب سے وزنی لفافہ نکال کر کھولنے لگا۔

اور شیلا ———؟

وہ وِنود سے رخصت ہو کر جس وقت مکان پہنچی، تو شانتا رام دارالمطالعہ میں تھے!

اُنھوں نے شیلا کے قدموں کی چاپ سُنی، معاً اُن کی نگاہیں دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف اُٹھ گئیں۔

"اُف دس بجنے والے ہیں! آج یہ خلاف معمول دیر سے کیوں آئی؟"

اُنھوں نے دل سے سوال کیا "گو، میری شیلا کو تعلیم نے اس قدر پختہ کار اور دور اندیش بنا دیا ہے کہ وہ معمولی لڑکیوں کی طرح فضا سے متاثر نہیں ہو سکتی، پھر بھی زمانہ کی زبان کون پکڑے گا۔ وقت بڑا نازک آ گیا ہے! ——— زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو ———" اِن خیالات کے آتے ہی اُنھوں نے شیلا کو آواز دی تاکہ نصیحتاً اُسے چند باتیں سمجھائیں "کاش اس کی ماں زندہ ہوتی!"

اُنھوں نے شیلا کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر ایک آہ سرد کھینچتے ہوئے کہا ———

"بیٹی شیلا!"

"ہاں پاپا ———" شیلا معصومیت سے بولی۔

"بیٹی ——— تم آج خلاف معمول اس وقت تک سیر گشت کر رہی تھیں، یا اپنی پڑوسن چچی کے ہاں تھیں ———؟"

"نہیں پاپا، میں جی کے یہاں بھی نہیں تھی اور سیر گشت بھی نہیں کر رہی تھی۔"

"تو پھر؟"

"پاپا! آج میری زندگی کی ...... سب سے بڑی اور سب سے مسرور کن رات ہے ... . میں آج اُس شخص کے ساتھ تھی جسے میں مستقبل میں اپنا بناؤں گی" وہ گردن جھکائے کہتی ہی گئی۔

شیلا سے اِس قسم کے الفاظ وہ عمر بھر میں آج پہلی بار سن رہے تھے۔ انھیں اس کی جسارت پر حیرت بھی تھی اور خوشی بھی۔ وہ مغربی خیالات کے انسان تھے اور حقوقِ نسواں کے معاملہ میں بہت فراخدل واقع ہوئے تھے۔ شیلا نے اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کرسی کھینچ لی اور اس پر بیٹھتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

"دِل پیتا ـــــ اِس ضمن میں بحث غیر موزوں ہے ـــــ میں اُنھیں ایک عرصہ سے جانتی ہوں اور آپ بھی ـــــ مگر پاپا! ـــــ آج رات، .... ابھی ابھی نقرئی چاندنی میں وہ میرے اظہارِ خیال پر ورطۂ اِستعجاب میں غوطہ زن ہوگئے ـــــ بالکل سکتہ کے عالم میں ـــــ"

پہلے شانتا رام کی چوڑی پیشانی پر موٹی موٹی شکنیں پڑیں۔ اِس کے بعد اُن کے چہرہ کا رنگ متغیر ہوا ـــــ غصّہ، نفرت، حقارت، خوف، اُمید، حسرت، آرزو اور تمنا ـــــ یہ تمام ملے جُلے جذبات یکے بعد دیگرے طوفانی موج کی طرح اُن کے دِل میں اُمڈے اور آناً فاناً معدوم ہوگئے ـــــ آخرکار انھوں نے بڑی نرمی سے اِستفسار کیا۔

"کون ہے وہ، شیلا؟"

ناامیدی، یاس اور ناکامی کا ایک دھندلا سا عکس شیلا کی نگاہوں کے سامنے آیا اور فوراً ہی مفقود ہوگیا۔ اور وہ پھر ایک مرتبہ اپنی پوری معصومیت سے بولی:

"ڈیڈی! اگر بطور مربّی، انتخاب کا حق آپ کے ذمہ ہو اور آپ کو زندگی کا ایسا ساتھی منتخب کرنا پڑے جس میں صفائی قلب، خلوص، ایمانداری، وجاہت قابلیت خاندانی عظمت، حسن اور جملہ اوصافِ حمیدہ ہوں تو آپ اپنی بیٹی کو کس سے وابستہ کریں گے؟"

شانتا رام نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی چکلی پیشانی کو سہلاتے ہوئے ایک لمحہ کے لئے غور کیا پھر گویا ہوئے۔

"بیٹی! ـــــ میری دانست میں اسکے لئے ونود سے بڑھکر دوسرا موزوں شخص نظر میں نہیں جچتا بشرطیکہ وہ اقتصادی طور پر بھی موزوں ہوتا ہے؟"

"مگر ڈیڈی! ان کی اقتصادی مشکل کا حل تو آپ کے ہاتھوں میں"

شیلا نے خوشی سے اُچھل کر کہا "پاپا! گو مجھے آپ سے کہتے ہوئے شرم آتی ہے مگر میں نے انھیں ...... اپنی قسمت سے وابستہ ...."

شانتا رام بات کاٹتے ہوئے بولے: "تمہارے انتخاب میں کوئی مضائقہ نہیں بیٹیا! پر وہ تمہاری ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہیگا وہ اپنی استطاعت کے مطابق ترقی کی آخری منزل پر پہنچ چکا ہے جہاں اُسے صرف دو سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ ترقی کرنا اس کی دسترس سے باہر ہے ـــــ بھلا تمہیں بتاؤ اِن حالات کے پیشِ نظر وہ تمہیں کس طرح سکھی رکھ سکتا ہے ـــــ؟"

وہ بعجلت ہوتے ہوئے بولی:

"نہیں پاپا! اُن میں ترقی کے اور مدارج

طے کرنے کی صلاحیت موجود ہے؟

"ارے ہیں بیٹیا! تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتیں، وِنود میں کاروباری فروغ اور اُصول کی گرفت کے طریقے، تجارت کا اُلٹ پھیر اور اُن کے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے ——— وہ اُن لوگوں میں سے نہیں ہے جو قطرہ کو دریا اور ذرّہ کو آفتاب بنانے کے طریقوں پر دسترس رکھتے ہیں۔

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں پاپا! ہے اُن میں یہ صلاحیت ابھی بمشکل ایک گھنٹہ گزرا کہ مجھے انھوں نے بینک کی ایک شاخ بھرت پور میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی تھی ——— دورانِ گفتگو میں اپنے ایک انجینیر دوست مسٹر پرتھوی کا بھی تذکرہ کیا، جو وہاں کوئلہ کی کان دریافت کرکے ایک اعلیٰ پیمانہ پر اپنا کام شروع کرنے والے ہیں۔ اگرچہ میں نے ان کی تمام منطقی باتوں کی تفصیل پر اپنی پوری توجہ مبذول نہ کی پھر بھی مجھے اِتنا ضرور اندازہ ہوا کہ اِن معاملات میں وہ شدّت سے آپ کی سرپرستی اور تعاون کے محتاج ہیں اور اگر اُن کی ہر دو تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں دلچسپی سے کام لیا جائے، تو وہ دن دور نہیں کہ چند ماہ کے الٹ پھیر میں وہ اپنی لگائی ہوئی پونجی میں کئی گنے کا اضافہ کرلیں ——— مگر یہ اُس وقت ہو سکتا ہے جب آپ دلچسپی لیں تاکہ انھیں اپنی قابلیت کے اظہار اور اپنے کو پروان چڑھانے کا موقع مل سکے۔

شانتا رام اس دوران میں ٹکٹکی باندھے شیلا کے چہرہ کو دیکھتے اور اُس کی باتیں بغور سنتے رہے اِس کے بعد اُنھوں نے اِس معاملہ پر خاموشی سے غور کرنا شروع ہی کیا تھا کہ باہر کی برقی گھنٹی نے بجکر اُن کے سلسلۂ خیال کو منقطع کر دیا۔

"ڈیڈی! میرا خیال ہے کہ وہ باتونی ڈاکٹر ——— آپ کا دوست، آپ کا مغز چاٹنے آگیا۔

بہرصورت میں نے جو کچھ کہا ہے اُس پر آپ غور و خوض فرماکر کسی نتیجہ پر ضرور پہنچیں ——— اور میں اب چلی، گڈ نائٹ، ڈیر ڈیڈ!"

یہ کہتی ہوئی شیلا اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلدی۔

اُسے اپنے باپ کے پرانے دلچسپ دوست ڈاکٹر وبھاکر کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کے خیال میں باتونی اور لفاظ واقع ہوا تھا۔ ڈاکٹر، حسبِ معمول شب کو آکر شانتا رام کی دلچسپی کا مرکز بنتا تھا۔ مگر وہ اِن صحبتوں میں شریک نہ ہوتی تھی۔

رات بھیگ چکی تھی، فضا ساکن تھی، ہر طرف سکوتِ مطلق چھایا ہوا تھا جبکہ کسی نے ڈاکٹر شانتا رام کے بنگلہ کی گھنٹی بجاکر اپنی آمد کا اعلان کیا۔

شیلا کے خیال کے مطابق آنیوالا بڈھا باتونی ڈاکٹر وبھاکر نہ تھا بلکہ اس کی جگہ وِنود کھڑا ہوا تھا جو اپنے ضمیر کی آواز پر کشاں کشاں اِتنی رات گئے اپنی لغزش کے اظہار کے لئے آیا تھا۔

وہ اندر بلالیا گیا۔ اُس کی ذہنی کیفیت ناقابلِ بیان حد تک خراب ہوگئی تھی۔ آنکھیں پتھرائی ہوئی بے نور سی، چہرہ زرد، اور اس پر شکنیں پڑی ہوئی، تمام اعضاء میں اِضمحلال، شانتا رام نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور شیلا والی کرسی اُس کی طرف بیٹھنے کے لئے بڑھا دی مگر اس نے ادھر بالکل توجہ نہ کی بلکہ اپنی نظریں فرش پر گاڑتے ہوئے بولا۔

"سب سے پہلے مجھے اِتنی رات گئے خلل انداز ہونے پر معاف کیا جائے؟ وہ کہتا رہا

"دراصل معاملہ کی نزاکت کے سبب مجھے اسوقت

آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑا تاکہ حتی الامکان اُس کا ازالہ کر سکوں ——— اور جہاں تک ممکن ہو سکا میں اِختصار برتوں گا۔ مگر آپ متوجہ ہو کر سنیں ——— آج شام کو میں نے آپ کی تجوری سے آپ کے سورگ باشی چچا کملاپت جی کے ہاں سے آئے ہوئے لفافہ کو نکال لیا' جس میں میری دانست میں ایک لاکھ روپوں کے نوٹ تھے ——— مگر ابھی نصف گھنٹہ قبل مجھے شدت سے اپنی لغزش کا اِحساس ہوا' جس سے میرا رواں رواں لرز اُٹھا ———"

ڈاکٹر شانتا رام ونود کی گفتگو سُن کر اپنی کرسی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وِنود کے متعلق' ایک ایسے لڑکے کے متعلق' جو اُس کی تمام تر توجہات کا مرکز ہوتا چلا جا رہا تھا' ایک ایماندار اور شریف لڑکا جو اپنی خاندانی روایات کے مطابق ہر چیز میں برتری اور فوقیت رکھتا ہو ——— شانتا رام ایک خواب دیکھ رہا تھا ——— گویا موذن سحر سے قبل ہی فضا کی تمام رعنائیاں دور ہو گئی ہیں اور طلسم خواب کے ٹوٹتے ہی وہ اس دُنیائے آب و رنگ میں آگیا ہو جہاں ۔ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

تجربہ کار ڈاکٹر کا دِل زور زور دھڑکنے لگا۔ اور ایک لمحہ تک وہ کوئی جواب نہ دے سکا پھر بولا۔

"تو تم اب میرے پاس کس لئے آئے ہو؟"

"اِس لئے کہ میں مس شیلا سے عہد و پیمان کر چکا ہوں اور اُس کے بعد مجھے اِحساس ہوا کہ مجھ سے ایسی لغزش سرزد نہ ہونی چاہیئے تھی جو میری بربادی کا پیش خیمہ بنے۔"

اس نے پشیمانی کے لہجہ میں جواب دیا۔

شانتا رام نے یہ جملہ بڑے اِنہاک سے سُنا۔ اور اُس کا دماغ شیلا کی گفتگو کو ایکبارہ دہرا رہا تھا۔ ڈیڈی! میں نے اُنھیں اپنی قسمت سے وابستہ کرنے کے لئے منتخب کر لیا ہے .... نہیں پاپا! ان میں ابھی ترقی کے اور مدارج طے کرنے کی صلاحیت ہے۔ .... وہ شدت سے اِس معاملہ میں آپ کی سرپرستی کے محتاج ہیں .... یہ چیز صرف آپ کے تعاون سے ہو سکتی ہے' تاکہ اُنھیں اپنی قابلیت کو پروان چڑھانے کا موقع مِل سکے۔

اِن تمام خیالات کے آتے ہی اُنھوں نے وِنود سے نہایت نرمی سے پوچھا۔

"مگر ونود! میرے پاس آنے سے تو بہتر تھا کہ تم بھرت پور جا کر اپنی قسمت آزمائی کرتے؟"

جواب میں ونود کی زبان لڑکھڑا گئی" لے ...... لیکن .... لفافہ میں نوٹوں .... کے بجائے وصیت نامہ تھا ———" یہ کہتے ہوئے اُس نے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔

"بندۂ خدا! تم بھی عجیب آدمی ہو! اَرے سمجھدار انسان! جب لفافہ نوٹوں سے خالی تھا تو تم اِلزام سے قطعی بری الذمہ ٹھیرے ———"

"یہ ٹھیک ہے کہ میں نے اپنی چوری میں کچھ دستیاب نہ کیا ——— یہ بھی صحیح ہے کہ میں اپنے مقصد میں ناکامیاب رہا۔ مگر اس سے میری نیت کا وہ فعل ہرگز نظرانداز نہیں ہو سکتا جس سے پشیمان ہو کر میں اِعتراف کے لئے آپ کے سامنے آنے پر مجبور ہوا ہوں ——— میں کامیاب رہا یا ناکامیاب مگر ——— میں نے چوری کا قصد ضرور کیا تھا اور مقصد ہی اِرتکاب جرم کا بانی ہو کر مجھے اخلاقی ملزم قرار دینے کو کافی ہے۔"

شانتا رام نے اپنے سُنہرے سگرٹ کیس سے دو سگرٹ نِکالے اور اُن میں سے ایک وِنود کی طرف

بڑھاتے ہوئے بولا:۔

" لو سگرٹ پیو۔ یہ چیز شیطانی وسواس کو رفع کرنیکا علاج ہے ——— اب رہی وہ رقم، جو لفافہ میں تھی آسے میں نے آج گوکل پورہ کی اس سہ منزلہ عمارت کو خریدنے میں لگا دی جسے تم جانتے ہو، اور اسے میں نے شیلا کے نام پر لکھدیا۔ اب وہ اس کی ملکیت قرار پا چکی ہے۔ میری دانست میں میرا یہ اقدام ایک حد تک عمدہ رہا۔ اسے چھوڑو اور اب مجھے اپنی اس تجویز کا خلاصہ بتاؤ جس کا ذکر شیلا سے تم شام کو کر رہے تھے ——— میرا مطلب پرتھوی والی کوئلہ کی کان سے ہے "

شانتا رام نے سگرٹ کا کش لے کر اس کا نیلگوں دھواں برقی قمقمہ پر پھینکتے ہوئے دریافت کیا۔

" وہ تجویز! ——— ہے تو کسی قدر قابلِ توجہ مگر ——— مگر میں ہنوز اپنے تئیں انسانوں کی اس صف میں پاتا ہوں جو اپنا وقار کسی رکیک حرکت سے تبدیل کر چکے ہوں ——— میں چور ہوں ——— یہ میرے ضمیر کی آواز ہے "

قریب تھا کہ ونود شدتِ غم سے ضبط گریہ نہ کر سکے مگر شانتا رام نے اس کے شانے پر اپنا بھاری ہاتھ رکھدیا اور نظریں اس کی نگاہوں میں گاڑ دیں۔ ان کا لہجہ نہایت متین اور پر وقار تھا۔

" سنو ونود! میں نہیں چاہتا تھا کہ تم اِس خفیف خیال کو زیادہ اہمیت دینے پر مصر رہو!

بس تمہاری اصلاح کے لئے ایک احساس ہی کافی ہے جو تمہیں تمام عمر کبھی ایسی لغزش پھر کرنے سے مجتنب رہنے کی دعوت دیتا رہیگا۔ مجھے تم سے اب بھی کئی وجوہ سے ہمدردی اور انس ہے، جن میں دو وجوہ زیادہ قابلِ اہمیت ہیں۔

پہلا شیلا کو تمہیں اپنا شریکِ حیات منتخب کر لینا اور دوسرا تمہاری ذاتی قابلیت اور خاندانی عظمت ——— "

ونود کے ہونٹوں پر زہریلا تبسم تھا اور نگاہوں میں انتہائی خفت۔ وہ بولا:۔

" خاندانی عظمت تو میں اپنی رکیک الحرکتی سے کھو بیٹھا؛ اب رہا میں شیلا کا انتخاب، تو وہ بھی میرے اس فعل کے مشتہر ہونے کے بعد ختم ہو جائیگا ——— ڈائرکٹر صاحب!

میں اب شیلا کو منہ نہیں دکھانا چاہتا اور نہ آج کے بعد سے آپ کو .... "

" نہیں ونود تم نادان ہو۔ اس کے علاوہ شیلا کے مزاج سے کلیتہً ناواقف، اس کی ماں کے انتقال کے بعد سے میں نے اس کی نگہداشت کر کے اتنا بڑا کیا۔ جہاں تک مجھے یقین ہے وہ باوجود موجودہ سوسائٹی میں اٹھنے بیٹھنے اور زندگی کے ہر شعبہ میں شرکت کر کے اپنی علمی قابلیت اور تجربات میں اضافہ کرنے کے آج تک کسی غیر جنس سے مانوس نہیں ہوئی .... مگر اب جبکہ وہ تم سے دلچسپی لینے لگی ہے تو یہ اس کا پہلا اور آخری فیصلہ ہوگا "

" مگر مجھے صبح کی گاڑی سے بھرت پور جا کر پرتھوی سے ضرور ملنا ہے۔ کیونکہ اس کو میری طرف سے اب اقتصادی معاونت سے معذور ہونے کا علم ہو جانا ضروری ہے "

" ونود! " شانتا رام نے قدرے بھاری آواز میں کہا " تم شیلا کو چاہتے ہو یا نہیں ——— ؟ "

" مگر .... "

" مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے آج کے واقعہ کا اس کو علم نہ ہوگا بشرطیکہ تم خود اس سے نہ کہدو .... بتاؤ! اب تمہارا کیا خیال ہے ——— ؟ "

وہ گردن جھکائے کھڑا رہا۔ شانتا رام نے

پھر سوال کیا۔

"اب تم اپنی تجویز کے سلسلے میں کیا چاہتے ہو ——— ؟"

"کونسی ؟"

"وہی جس کا ذکر تم شیلا سے شام کو کر چکے ہو"

دیکھو، میں تمہیں ماہروں کے ایک جتھے کے ساتھ بھرت پور جا کر اپنے دوست مسٹر پرتھوی سے تعاون کرنے اور کوئلہ کی کان کے متعلق پوری معلومات حاصل کرنے کا مشورہ دوں گا اور اگر حالات اچھے رہے تو تم وہاں بینک کی ایک شاخ بھی کھول سکتے ہو .... تمہیں پورے پورے اختیارات بھی دیئے جائیں گے تاکہ معاملات کو تم اپنی نوعیت اور مرضی کے مطابق کر سکو۔ تم بھرت پور کے تمام کام کے مختار کل تصور کئے جاؤ گے تاکہ تمہیں اپنی قابلیت اور اہلیت کے اظہار کا پورا پورا موقع مل سکے، اور اگر وہاں تمہیں حسب دلخواہ کامیابی ہوئی تو تم تین سال کے بعد اس بینک کے بھی شریک کار بنا دیئے جاؤ گے ——— "

ونود کا دماغ چکرانے لگا۔ وہ ڈائرکٹر کی باتیں سُنکر شادیٔ مرگ ہوا جا رہا تھا۔

"نوازش! ——— آپ نے مجھے اس چیز سے صبح ہی مطلع فرما دیا ہوتا تو کیوں میں اس ملامت کا شکار بنتا! میں نے یہ تجویز سہ پہر کو پرتھوی کے خط ملنے کے بعد مرتب کی تھی۔ آہ! اُس وقت تک میں باعزت اور باوقار تھا اور اب ——— ! ایک بے عزت! کمینہ!! چور!!!

"ونود! اب ضرورت اس کی مقتضی ہے کہ میں تم سے اپنے اس راز کا انکشاف کروں، جسے میں اپنے دل کی گہرائیوں میں اب تک پوشیدہ کئے ہوئے تھا ——— زمانہ گزرا، جبکہ میں بھی ایک دن اتفاقات کا شکار ہو کر تمہاری جگہ کھڑا تھا۔ مجھ میں اور تم میں بس اتنا فرق تھا کہ میرا لفافہ گوہر مراد سے بھرا ہوا تھا اور تمہارا خالی۔ اس کے بعد سے حالات نازک سے نازک تر صورت اختیار کرتے گئے اور اپنے جرم کی پاداش کی بھیانک تصویر میری نظروں کے سامنے منڈلانے لگی۔ مگر خوش بختی سے میں صاف بچ گیا اور ——— فرار ہو کر دُور .... بہت دُور .... قید و بند کی خطرناک بندشوں سے آزاد ہو کر اپنی زندگی کے ایام فرحت و شادمانی میں گزارنے لگا۔ اور چونکہ مجھ میں طبعاً روپوں کے صحیح مصرف کی عادت تھی، اس لئے میں نے جلد ہی اس رقم کا صحیح مصرف تلاش کر کے اپنے تئیں ارتقائی منازل تک پہنچانے کی سر توڑ کوشش شروع کر دی اور ایک قلیل عرصہ کے الٹ پھیر میں میں نے اُن روپوں کو دُگنا کر کے چرائی ہوئی رقم کی پائی پائی بلکہ بہت کچھ اُس سے زیادہ ادا کر دی ———

میرے بچے! دنیا میں ہزارہا متنفس اس قسم کی لغزشوں میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جن کا ظرف عالی ہوتا ہے وہ اس کی ادائیگی بھی مختلف عنوانات سے کر دیتے ہیں مگر ——— میرے نظریئے کے مطابق اس قسم کی ادائیگی سے زیادہ اہم یہ ہے کہ ہم اپنی لغزشوں کو زندگی کی کسی منزل پر بھی دل سے محو نہ کریں جس سے ہم میں یہ جذبہ ضرور بیدار رہیگا کہ ہم حاجتمندوں اور ضرورتمندوں کو کبھی فراموش و نظرانداز نہ کرسکیں گے۔ ہمارا ضمیر پکار پکار کر ہمیں ان کی دستگیری اور سرپرستی پر آمادہ و مجبور کرتا رہے گا ——— بالکل اسیطرح جیسے ہم اور تم ——— ان تمام باتوں کو محض اپنے تک رکھنا اور شیلا تک سے اس کا ذکر نہ کرنا ——— صرف اس لغزش کا احساس تمہارے لئے مشعلِ ہدایت ہوگا۔"

وِنُود کو تجربہ کار ڈائرکٹر کی باتوں سے بہت کچھ نصیحت ہوئی۔ اسے اپنی لغزشوں سے ایک سبق مِلا اَب اُسے گونہ ڈھارس ہوئی اور وہ بولا:۔

"تو کیا آپ نے میری خطا کو معاف کر دیا —— اور آپ اَب بھی مجھ پر شفقت فرمائیں گے؟ اور مس شیلا! آہ! آپ کی عنایتوں کا معاوضہ میں تمام عمر کی تگ و دو میں بھی نہیں ادا کر سکتا؟"

"میں سمجھتا تھا کہ جذبات سے مغلوب ہو کر تم ان الفاظ کا استعمال جائز سمجھو گے وِنُود! مگر چھوڑو ان فروعی باتوں کو'! اپنی بقا اور ناموری کے پیشِ نظر نہایت جانفشانی سے اپنے فرائض کی بجا آوری پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرو۔ اسی میں تعمیرِ حیات کا راز مضمر ہے' شیلا تمہاری ہے اور تم اُس کے —— میرے بچے! مجھے ابھی تھوڑی نصیحت اور کرنے دو! —— اِنسان بذاتِ خود ایک پاکیزہ ہستی ہے' اُسے بدنام اور خراب کرنے کی ذمہ داری اُس کے کردار پر عائد ہوتی ہے' یہاں اُسے اپنی عقلِ سلیم سے مدد لینی چاہیئے تاکہ بجائے خود موردِ الزام قرار پانے کے وہ اپنے عیوب دور کرنے کے وسائل پر غور و خوض کر سکے۔ اِس طرح وہ نہایت اعلیٰ صفات کا حامل ہو سکتا ہے اور یہ چیز ہمیں بآسانی دستیاب ہو سکتی ہے کیونکہ ایک فطری قوت ہماری پشت پناہ ہے اور ہم میں کارفرما بھی! جو ہمیں اچھی باتوں کے لئے راغب کرتی ہے مگر اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان عناصر پر اِس پاکیزہ قوت کو حادی ہونے دیں' جس سے تعمیرِ حیات ہے ——

اس لغزش میں زیادہ دیر تک اُلجھے رہنے کی ضرورت نہیں .... دوسری صبح تمہارے لئے نویدِ کامرانی لائیگی اور تم اپنی قابلیت کو پوری شدت سے عمل میں لانے کی سعی کر سکو گے؟" یہ کہتے ہوئے شانتا رام نے وِنُود کی نظروں سے نظریں ملائیں —— وِنُود کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلکر اُس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے —— شانتا رام نے اُس کی پشت پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا —— شفقت کا!!

ساقی

صحوی

تیرے صدقے میں ہے یہ رحمتِ عام اے ساقی
ہو حلال آج جو کل تک تھی حرام ای ساقی
لغزشِ پا سے تری حشر اُٹھا جاتا ہے
دیکھ! برہم نہ ہو عالم کا نظام ای ساقی
اپنی مخمور نگاہوں سے پلا دے مجھکو
تیری آنکھوں میں ہی جو ماہِ تمام ای ساقی
ایک ہی جرعہ میں، اللہ رے انداز کرم
بخشدی تونے دو عالم کی زمام اَی ساقی
تو وہ دولت ہے کہ آنکھوں میں جگہ دیں تجھکو
اہلِ دل جانتے ہیں تیرا مقام ای ساقی
دل تصدق نگہِ شوق تری فرشِ قدم
پھر اُسی طرز پہ ہو حشر خرام ای ساقی
بھول جاؤں تجھے اِک بار بھی کیا میری مجال!
جھولتا ہے ترا ہر سانس میں نام ای ساقی
ساری خوشیاں مرے قدموں میں سمٹ آئینگی
کاش! تو لے لے جو اِک بار سلام اَی ساقی
تیری ہستی کے تصدق تیری آنکھوں کے نثار
آج صحوی کو بھی ہے لغزشِ گام اَی ساقی

ادریس احمد خالد مینائی

خودی کا معلّمِ اعلیٰ

اقبالؔ

بادۂ عرفاں سے تھا لبریز تیرے دل کا جام
تیری آنکھیں دیکھتی تھیں زندگی کی صبح و شام
تجھ میں پائی میں نے رفعت گیری شاہینِ عرش
تھی تخیل پر تیرے ہستی کی ہر پستی حرام
تیرا وجدانِ خودی معراجِ عرفان و سُرور
تیرا وجدان عمل، ہستی کی تیغِ بے نیام
سینۂ مُسلم کو دے کر سوز و اندازِ خلیل
تو نے پھر ملّت کو بتلایا مجاہد کا مقام
عشق کی رفتار پر ہے عقل ششدر اب تلک
یہ کلیم رہ چلا تھا ساتھ تیرے چند گام
رہ تری راہِ وفا اور تیری منزل کوئے دوست
آہ اے مردِ جری تیرا سفر، تیرا مقام
تیرے ہر ہر شعر پر مُسلم کی نبضیں تیز تر
تیرے ہر پیغام پر دل کا مسافر تیز گام
تیرے نغموں سے فضائے ہند و فارس کیف بار
ہے لبِ فطرت پہ لرزاں آج تک تیرا کلام
کر رہا تھا شانۂ فطرت تیری مشاطگی
اُس نے بخشا تیری زلفِ فکر کو حسنِ دوام
اپنے ساقی شورِ مے لا، پر نگوں سر تھے کہ جب
محفلِ مشرق میں تو آیا لئے مینا و جام
تو نے یوں محسوس کی تھی نبضِ مستقبل کہ آج
وقت دیتا ہے تیرے الفاظ میں اپنا پیام
تو نے سوتوں کو کیا ہشیار، ہشیاروں کو مست
اور مستوں کو دیا سلمائے ہستی کا پیام

سلمائے ہستی کا پیام

میری چاہت ہے تو اندازِ جنوں پیدا کرو
چشمِ نم پیدا کرو سوزِ دروں پیدا کرو

ہے مرے جذباتِ مستی کو گدازِ دل کا پاس
چشمِ شوق و اشک ہائے لالہ گوں پیدا کرو

جان لو شیریں کو ہے فرہاد کے تیشے سے عشق
ہر گھڑی اِک جوئے خوں اِک بے ستوں پیدا کرو

جذب کر لو چشمِ دل میں میری یکتائی کا رنگ
سازِ جاں سے نغمہ ہائے ارغنوں پیدا کرو

یہ جو چاہو لیلئِ ہستی کرے ساقی گری
روح میں خم خانۂ سوز و جنوں پیدا کرو

ہے رموزِ زندگی کو شوقِ اظہار و نمود
تم نگاہ و فکر میں جذب و فسوں پیدا کرو

سینۂ گیتی میں شیطاں نے جو بھڑکائی ہے آگ
اِس میں ابراہیم کا سوز و سکوں پیدا کرو

ماہر القادری

ماہر القادری کے نو نشتر

یہ کیوں کہوں کہ لگی آگ آشیانے کو
کیا ہے برق نے روشن سیاہ خانے کو

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تری تصویر دکھادی

رہ گیا ہے آرزو کا اک لرزتا سا چراغ
جاتے جاتے آج اُس کو بھی بجھاتے جائیے

پھولوں کی ذرا روش تو دیکھو
کانٹوں سے نباہ کر رہا ہے

مانا مری نگاہ پہ ثابت ہے جرم دید
تیری نگاہ بھی تو شریک گناہ تھی

بہت سے دہر میں قاتل ادا ہیں
تمہیں سے کیوں زمانہ بدگماں ہے

آپ سن بھی لیں تو فرصت غور کرنے کی کہاں
عشق کا افسانہ تو مفہوم در مفہوم ہے

اب کہاں وہ کیف کی راتیں وہ دلچسپی کے دن
زندگی اک مستقل آزار ہے تیرے بغیر

گذر رہی ہے کچھ اس ڈھب سے زندگی ماہر
کہ جیسے میری ضرورت نہیں زمانے کو

ادیب مالیگانوی

فطرت عشق

یوں تو پہروں حسن کے پہلو نشیں رہتا ہوں میں
کون جانے کس لئے اندوہگیں رہتا ہوں میں

اب مری افتادگی بھی ہے بشان تمکنت
باریاب خلوت ناز آفریں رہتا ہوں میں

ڈھونڈھ سکتے ہیں، تو مجھ کو ڈھونڈھ لیں اہل نظر
میں نظر آتا کہیں ہوں، اور کہیں رہتا ہوں میں

جان و دل، اُن کی نگاہ مست سے سرشار ہیں
بے نیاز شغل جام و انگبیں رہتا ہوں میں

سامنے جب وہ نہیں ہوتے تو اُن کی یاد میں
دیکھتا ہر وقت، اک "خواب حسیں" رہتا ہوں میں

کھینچ لاتا ہے تصور اُن کو بزم شوق میں
یعنی کوسوں دور رہ کر بھی قریں رہتا ہوں میں

دل ہے اور اُن کی تمنا، عشق ہو اور اُن کا جام
فارغ اندیشۂ دنیا و دیں رہتا ہوں میں

چاندنی یوں تیز کر دیتی ہے دل کی آگ کو
صبح تک مصروف رشک و آتشیں رہتا ہوں میں

ہر تکلم آفت جاں، ہر تبسم برق ہوش
مختصر یہ ہے، کہ قابو میں نہیں رہتا ہوں میں

بدگمانی اور محبت میں ہے شاید ربط خاص
ورنہ اکثر شمع افروز یقیں رہتا ہوں میں

عشق کی فطرت بدل سکتا نہیں کوئی ادیب
محفل عشرت میں بھی اندوہگیں رہتا ہوں میں

تنقید و تبصرہ

مُردوں کی مسیحائی

از مولانا عبدالماجد دریا بادی، حجم، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ قیمت ۱۲/ روپے

پتہ۔ ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن۔

اِس کتاب کے متعلق مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ تحریر فرماتے ہیں:-

"مردوں کی مسیحائی" بظاہر ایک "کتاب" کا نام ہے لیکن میرے نزدیک "کتاب" نہیں، واقع میں یہ نام اُس "چشمۂ آب" کا ہے، جس سے زندگی پیدا ہوتی ہے، ہوئی بھی ہے اور آئندہ پیدا ہوتی رہے گی، اِس لئے کہ سینکڑوں سال سے متجاوز ہو کر ہزار سال سے زیادہ مدت تک ایشیا، افریقہ، اور یورپ کے بھی ایک حصہ کی مُردہ آبادیوں کو اُسی سے زندگی ملی ہے۔

کہ یہ سیدنا و مولنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے مختلف پہلوؤں کی ایک ایسی لطیف عکاسی ہے، جس پر مخدوم و محترم مولنا عبدالماجد دریا بادی کے سحر طراز قلم کے سوا کم از کم اُردو زبان میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے قادر ہو سکتا ہے انشا کا زور، بیان کی حلاوت، عبارت کی سلاست کے ساتھ ساتھ ہر موقع پر علم کی ذمہ داریوں کے صحیح احساس کو بیدار رکھتے ہوئے عشق کی وارفتگیوں کو بھی نباہتے ہوئے چلے جانا، یہ مولنا دریابادی کے ادب کی خصوصیت ہے جس کے ظہور کا بہترین موقعہ اِس کتاب کے "مقالات طیبہ" کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ فجزاہ اللہ عنا وعن امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزا

اُردو کا سب سے بڑا شاعر اور محسن

از قاضی عبدالصمد صارم سیوہاروی، حجم ۱۴۱ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ قیمت عہ۔ پتہ سید عبدالرزاق بک سیلر عابد روڈ حیدرآباد دکن

اِس کتاب میں جناب صارم نے شیخ غلام ہمدانی مصحفی متوفی ۱۲۴۰ھ کو اُردو زبان کا سب سے بڑا شاعر اور محسن قرار دیا ہے۔ صارم صاحب کی رائے میں اردو زبان کا دور اصلاح ۱۱۷۰ھ سے شروع ہو کر ۱۲۴۰ھ یعنی مظہر جانجاناں سے مصحفی تک ہے اور چونکہ مصحفی نے زبان و قواعد کی بہت زیادہ پابندی کی اور شاگردوں سے پابندی کرائی اس کے علاوہ مصحفی نے بہت سے اشعار بھی کہے (اگرچہ بقول صارم وہ زبان کی پابندیوں کی وجہ سے پھیکے ہیں) اِس لئے مصحفی سب سے بڑے شاعر اور محسن ہیں۔

صارم صاحب نے ایک بحث دلچسپ چھیڑی ہے اور اپنے دعوی کو بڑی محنت اور دقیق جستجو کے ذریعہ ثابت بھی کیا ہے، اِس لئے اُردو زبان کا گہرا مطالعہ کرنے والوں سے اِس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں، کتاب فاضل مصنف کے وسیع مطالعہ اور ذوق جستجو کا نتیجہ ہے، رہا اُن کی رائے سے اتفاق و اختلاف کا سوال تو یہ ایک الگ چیز ہے جس کے لئے طویل مضمون کی وسعت درکار ہے۔

جاپان کی صنعتی ترقی

از محمد ناصر علی صاحب ایم اے (عثمانیہ) لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ

حجم ۷۵ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ قیمت عہ۔ پتہ سید عبدالرزاق بک سیلر عابد روڈ حیدرآباد دکن۔ یہ جناب ناصر علی صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو مشہور علمی رسالہ سیاست میں شایع ہوتے رہے ہیں اِس کتاب کے متعلق مشہور ماہر معاشیات ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی رائے ہے کہ "اِس میں اس ایسا مواد یکجا کر دیا گیا ہے جو دوسری جگہ آسانی سے دستیاب نہیں ہو سکتا"

کتاب ہر صاحب نظر کے مطالعہ کی چیز ہے ہمیں دشمن سے بھی اچھی باتیں سیکھنا چاہئے اور یہی سب سے بڑا کام ہے جس کے ذریعہ دشمن کا کامیاب مقابلہ کیا جا سکتا ہے

معاشیات اور پاکستان

مصنفہ عبدالقدوس ہاشمی
۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۴۴ صفحات

مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی صاحب ہماری زبان کے مشہور مصنف اور شگفتہ نگار صاحب قلم ہونے کے ساتھ ساتھ علوم کے مشرقی و مغربی چشموں سے فیضیاب فاضل ہیں۔ اَب تک اِن کی متعدد کتابیں خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

اس کتاب میں جو اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے پاکستان کے تاریخی پس منظر کے ساتھ ساتھ اِس تجویز کے مالی و معاشی پہلو پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور سرکاری اِعداد و شمار کی روشنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ اگر پاکستان کی تجویز روبہ عمل آئی تو مالی و معاشی حیثیت سے نہ صرف کوئی رکاوٹ نہ ہوگی بلکہ اِن علاقوں کی مرفہ الحالی کا باعث بھی ہوگی۔ کتاب اِس خشک بحث کے باوجود دلچسپ بھی ہے اور سیر حاصل بھی۔ ایک ماہر معاشیات کی رائے میں یہ کتاب اِس موضوع پر آئندہ بڑی کتابوں کی تصنیف کا دروازہ کھولتی ہے، اور اِس قابل ہے کہ اِس تحریک کے موافق و مخالف دونوں پڑھیں، اور عام معلومات حاصل کرنے والے خاص طور پر مطالعہ فرمائیں۔

اپنے خواب

سید کاظم دہلوی کے دس مختصر طبع زاد افسانوں کا مجموعہ ۲۰×۳۰/۱۶
حجم ۲۰۴ صفحات مجلد قیمت عا

یہ افسانے دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی زبان صاف، بیان شستہ اور خیالات پاکیزہ ہیں سید کاظم دہلوی کے افسانوں میں کردار زندہ، شریف اور باحیا ہوتے ہیں، یہ خصوصیت ان افسانوں میں بھی موجود ہے۔ ادبی بے اعتدالیوں سے یہ افسانے پاک ہیں۔ مختصر افسانے جو ہماری زبان میں شائع ہوتے ہیں ان میں سے اکثر میں مقصد افسانہ مفقود ہوتا ہے پورے افسانہ کو پڑھنے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ حقیقۃً وہ کیا بات ہے جسے افسانہ نگار اس افسانہ کے ذریعہ واضح کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سید کاظم دہلوی کے افسانوں میں یہ عیب نہیں۔ واضح طور پر مقصد سامنے آجاتا ہے۔ اور معلوم ہو جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن کو زندگی کی کس حقیقت کو یاد دلانا مقصود ہے۔

راست گفتار

قیمت سالانہ (للعہ)

یہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو کئی سال سے محمد عبد اللہ منہاس صاحب کی ادارات میں اَمرتسر سے نکل رہا ہے۔

منہاس صاحب ہماری زبان کے مشاق اخبار نویس ہیں۔ ان کی ممتاز ادارات میں پرچہ کا اچھے مضامین سے مالا مال ہونا کوئی غیر متوقع بات نہیں ہمیں اُمید ہے کہ اس کا مستقبل ماضی سے زیادہ شاندار ہوگا۔

ستارے

سیدہ اَختر۔ ۲۰×۳۰/۱۶
حجم ۱۹۸ صفحات مجلد قیمت مرقوم نہیں غالباً دو روپیہ ہوگی۔

یہ کتاب اَٹھارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو سیدہ اختر کی کاوش قلم کے نتائج ہیں۔ زبان صاف ستھری ہے، انداز بیان میں خطیبانہ رنگ غالب ہے۔ اِن افسانوں کو دیکھ کر اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ سیدہ اختر نے کس قدر بے چین طبیعت پائی ہے، خود مصنفہ نے ابتدا میں "ارباب نظر سے" کے عنوان سے اپنا مقصد واضح کیا ہے، لکھتی ہیں کہ:—

"وائے بر آن افسانہ نگار کہ وقت کی آواز کو نہیں سنتے، سماج کی

ضرورتوں کا احساس نہیں کرتے اور
اُن کے دل و دماغ رات دن گناہ کی
راتیں، دس کنواریوں کی داستان
جیسے افسانے مرتب اور تصنیف کرنے
میں مصروف رہتے ہیں۔ حالانکہ ضرورت
ہے اس وقت آزادی، انقلاب، مزدور
سرمایہ داری کی محنت، بیوہ، سماج کی خرابیاں
غریب کی بھوک وغیرہ ضروری عنوانات
پر دلچسپ اور موثر افسانے لکھنے کی"
زیرِ نظر مجموعہ میں اُن ہی عنوانوں پر افسانے
ہیں، اور اچھے خاصے ہیں، سیدہ اختر اپنے مقصد
میں کامیاب ہیں، افسانے دلچسپ بھی ہیں اور
موثر بھی۔

تنگے

محمد امین شرقپوری کے مختصر افسانوں کا مجموعہ
ضخامت ۲۰۴ صفحات۔ مجلد قیمت عا
ناشر شمع بکڈپو دہلی۔

یہ افسانے دلچسپ اور طبعزاد ہیں، پلاٹ بھی
اچھے ہیں، زبان صاف ستھری، اور طرزِ بیان واضح ہے۔

زنجیریں

محمد امین شرقپوری کے مختصر افسانوں کا
دوسرا مجموعہ۔ قیمت عا

محمد امین شرقپوری صاحب کے افسانوں میں
پلاٹ کی سادگی حقیقت کا رنگ بھر دیتی ہے۔ افسانے
خاصے دلچسپ ہیں۔

نراس

جناب نور الحسن صاحب صدر مُدرس
مدرسہ فوقانیہ دار الشفاء سرکارِ عالی
کے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ مجلد قیمت ۔ عہ/ر
ناشر حیدرآباد بکڈپو۔

یہ افسانے دلچسپ بھی ہیں اور سبق آموز بھی،
البتہ زبان میں کہیں ایسی خامیاں موجود ہیں جو مطالعہ
میں بار معلوم ہوتی ہیں۔

اشک و تبسم

سیدہ اختر $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۴۶ صفحات مجلد
مع گردپوش۔ قیمت مرقوم نہیں غالباً
ایک روپیہ ہوگی۔

یہ سیدہ اختر کی ۳۴ عاری نظموں کا مجموعہ ہے، ہر
نظم کے آخر میں ایک رباعی دی گئی ہے جس میں اس نظم
کے مفہوم کو سمویا گیا ہے۔ ہم ان نظموں کو پڑھنے کے
بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ سیدہ اختر میں اچھی شاعرانہ
صلاحیتیں پائی جاتی ہیں، بہتر ہے اختر اپنے بیان کے
لئے نظم سقفی اختیار کریں کیونکہ نظم عاری اثر انداز نہیں
ہوتی، اور شاعر کے لئے اس سے زیادہ بُری کوئی
چیز نہیں کہ اتنے اچھے خیالات کو اتنے غیر موثر انداز
میں پیش کیا جائے۔

جناح بمقابلہ حملہ آور

(انگریزی) اصل نام
جناح فیسنزیں اسنس۔ مصنفہ ایک بیرسٹر۔
یہ انگریزی کتاب راسپرٹ میسرینے
بمبئی نے شائع کی ہے۔ کتاب حقیقۃً قائد اعظم محمد علی
جناح پر جو حملہ ہوا تھا اس کی اور مقدمہ کی رپورٹ
ہے۔ ابتدا میں جناح صاحب کی مختصر سوانح حیات
درج ہے۔ کتاب دلچسپ اور مستند ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی

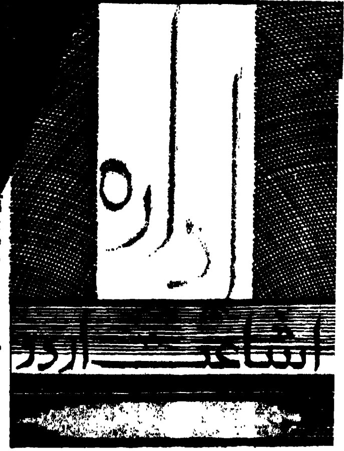
مصنفہ پروفیسر محمد سرور، سندھ
ساگر اکاڈیمی لاہور مجلد قیمت للعہ

یہ کتاب مشہور عالم اور معروف زعیم مولینا عبید اللہ سندھی
کے حالات اور حالات سے زیادہ ان کے خیالات اور افادات
کا مجموعہ ہے، پروفیسر سرور کو مولانا کے ساتھ ہندوستان
میں اور مکہ مکرمہ میں مدتوں تک رہنے کا موقع ملا ہے،
مولانا کی ترجمانی کا حق ان سے زیادہ اور کسے حاصل ہے؟
اندازِ تحریر شگفتہ، واضح اور پسندیدہ ہے، کتاب
تقریباً چار سو صفحات کی ضخامت رکھتی ہے۔

ہماری [illegible] مطبوعات

ادارہ اشاعت اردو

پیام ادب



ماهنامہ
پیام ادب

ناشر

ادارۂ اشاعت اردو

عابد روڈ حیدر آباد (دکن)

قیمت سالانہ
(ے) چھ روپیے کلدار

قیمت فی پرچہ
آٹھ آنے کلدار (۸/)

جولائی ۱۹۴۳ء
اگست ستمبر
جلد (۲)
نمبرات (۵-۶-۷)

رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۵۸

ادارۂ تحریر
سید عبدالوہاب
(چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری

چندہ سالانہ
(للعہ) کلدار

فی پرچہ
(۸/) کلدار

مندرجات

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مرزا ادیب

وہ دونوں

ہوٹل کے تمام چھوٹے بڑے ملازموں کے سامنے اپنے آپ کو اس قدر ذلیل ہوتے دیکھ کر دونوں کے دل جل کر کباب ہو گئے۔ اب تک نیازی کمبخت کی دلخراش آواز ان کے کانوں سے اس طرح ٹکرا رہی تھی جیسے پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑے کافی بلندی سے زمین پر گر رہے ہوں ویسے تو ایک آدھ چپقلش قریب قریب ہر روز ہو جاتی تھی لیکن ان چپقلش سے عام طور پر انہی کی شخصیت کو صدمہ پہنچتا تھا مگر یہ صدمہ برداشت کی حد سے باہر نہیں ہوتا تھا' وہ اپنی بیکسی و بیچارگی کا احساس کر کے' یا طویل مدت کی ملازمت کو پیش نظر رکھ کر خون کے گھونٹ پی کر ہوٹل کے ضدی پروپرائٹر کا یہ ظلم سہہ لیتے تھے لیکن اُس دن تو اس نے کمال کر دیا تھا' ہوٹل کے تمام ملازموں کے علاوہ' ان کے اپنے چند دوستوں کے علاوہ ہوٹل کے کئی مہمان بھی باہر کھڑے تھے ایسے موقع پر سخت گیر سے سخت انسان بھی دل کی بھڑاس نکالتے وقت صبر و ضبط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا' ذرا سی احتیاط کا خیال ضرور رکھتا ہے لیکن اس ظالم نے نہ آؤ دیکھا تھا نہ تاؤ' ان کی خودی کے رہے سہے جذبے کو بھی انتہائی سنگدلی کے ساتھ خاک میں ملا دیا تھا۔ اور یہ ذلت بہر صورت ان کے لیے ناقابل برداشت تھی —— اپنی ملازمت کی تیرہ سالہ زندگی میں' انہوں نے ایکدن بھی اپنے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی تھی۔ دیانتداری ان کی زندگی کا نصب العین تھا' اور فرض شناسی ان کا مطمح نظر تھا۔

انہوں نے آج تک کسی حالت میں بھی' اپنے نصب العین' اپنے مطمح نظر کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی تھی' اگر وہ چاہتے' اگر ان کے دل میں چور ہوتا تو اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانے ہی میں' جبکہ ان کے کاموں پر کڑی نگرانی کرنے والا ہوٹل میں کوئی شخص بھی موجود نہیں تھا۔ وہ ہوٹل کے کاروبار کو تباہ کر کے اپنی زندگی کو شاندار بنا سکتے تھے لیکن وہ ہمیشہ دیانت داری اور تندہی کے ساتھ ہوٹل کے کاروبار کو دیکھتے رہے' ہمیشہ ہوٹل کے فائدے کو اپنا فائدہ اور ہوٹل کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھتے رہے۔ اس فرض کے انجام دینے میں انہوں نے کئی تکلیفوں' دقتوں کا صبر و استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا —— مگر آج ان کی آنکھوں کے سامنے ان کے [illegible] ان کی تیرہ سالہ محنت پر پانی پھیر دیا تھا' اگر وہ انہیں کسی بے احتیاطی پر برا بھلا کہہ لیتا' یا تنہائی میں ہی سرزنش کر دیتا جب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ معاملہ اتنی اہمیت اختیار نہ کرتا مگر اس پاجی نے تو ان کے متعلق عام مجرموں کا فیصلہ کر دیا تھا۔ یعنی اب تک اتنے لمبے عرصے میں انہوں نے ارتکاب جرم کے سوا کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ اس سے زیادہ اور کیا توہین ہو سکتی تھی' اس سے بڑھ کر ذلیل کرنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا ان کے دل و دماغ میں اپنی توہین' اپنی ذلت کا [illegible] خیال غضب جاگزیں تھا اور جب [illegible]

ریشے ریشے میں ایک قسم کا تناؤ سا پیدا ہو گیا تھا جیسے کسی کو جلتے ہوئے کوئلوں پر رکھ دیا جائے۔

دونوں چپ چاپ دروازے سے ہٹ کر، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے۔ گویا دلدل سے گزر رہے ہیں، کمرے کے آخری کونے میں انگیٹھی کے قریب بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ شرمندگی، خجالت اور بے عزتی کے شدید احساس نے ان پر اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ ان کو دوسرے کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پہلے جب کبھی نیازی کے برا بھلا کہنے پر انھیں اپنی بے عزتی کا احساس ہوتا تھا تو وہ چند لمحے خاموش رہتے تھے، زبان سے ایک آدھ لفظ نکالنا بھی انھیں ناگوار گزرتا تھا یہاں تک کہ اس غم اور غصے کا احساس منتقمانہ کارروائیوں کی منزل سے گزر کر اپنی بیچارگی اور بے بسی یا جذباتی شدت کی دہلیز پر پہنچ کر دم توڑ دیتا تھا۔ اس وقت دل و دماغ کی تلخی دور کرنے کے لیے انھیں ہوٹل کے پروپرائٹر پر لعنت و ملامت بھیجنے کے سوا کچھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ اور کچھ دیر اس طرح باتیں کر کے دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد پھر اپنا حملہ شروع کر دیتے تھے۔ مگر ان کی حالت پہلی حالتوں سے قطعاً مختلف تھی۔ ہر گذرنے والا لمحہ ان میں بے عزتی کا ایک نیا احساس پیدا کر جاتا تھا، اور ہر آنے والا لمحہ اپنے ساتھ ایک نیا نشتر لے کر آتا تھا۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ریت کے بے شمار ذرات ان کی رگوں میں گھستے چلے جا رہے ہیں، ان کے دماغ پر ہتھوڑے کی پیہم ضربیں لگائی جا رہی ہیں۔ اور ان کی ہڈیوں کو انتہائی بے رحمی سے توڑا مروڑا جا رہا ہے اپنا جسم انھیں شکنجے میں جکڑا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے دھوبی پانی سے تر اور کپڑے کو پوری طاقت کے ساتھ مروڑتا چلا جاتا ہے۔ اب تک انھیں ہزاروں مرتبہ توڑا مروڑا گیا تھا۔ کئی مرتبہ سنگدلی اور بے رحمی کے ساتھ نچوڑنے کی کوشش کی گئی تھی مگر اب ان کو اس طرح دبایا جا رہا تھا۔ کہ ان کے جسم میں خون کے جتنے قطرے تھے جتنی ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ ریزہ ریزہ ہو کر باہر آئی جاتی تھیں اتنی توہین، اس قدر ذلت — انھیں اس کا بھی خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا! رشید کو رہ رہ کر اپنے مرحوم باپ پر

غصہ آ رہا تھا، ہوٹل کی ملازمت دلاتے وقت اس نے وفورِ مسرت سے جھوم جھوم کر کہا تھا۔ بیٹا ایسی اچھی نوکری تمھیں کہیں بھی نہیں مل سکتی۔ محنت کرو گے پھل پاؤ گے۔ شاہ صاحب نہایت شریف آدمی ہیں تمھیں ان کے رویے کے خلاف کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ مگر ابھی ملازمت کو چھ ماہ ہی گزرے ہوں گے کہ شکایت کے موقعے پیدا ہونے لگے۔ کبھی مقررہ مدت کے بعد ڈیوٹی لگائی جانے لگی اور کبھی باتوں ہی باتوں میں طعن و تشنیع کا ایک آدھ فقرہ کہا جانے لگا — باپ کی عزت کا معاملہ تھا وہ خاموش رہا، صبر و استقلال کے ساتھ سب کچھ کر کے اپنے منصبی فرائض ادا کرتا رہا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ ملازمت کی اس ملعون زنجیر کو پاش پاش کر کے کہیں بھاگ جائے۔ نیازی کے منہ پر کھری کھری سنا کر ہوٹل سے علیحدہ ہو جائے۔ کئی مرتبہ انتقام کی چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی لیکن وہ ہمیشہ دل ہی دل میں کڑھتا رہا، غم اور غصے کی آگ میں خود ہی جلتا رہا۔ اس چیز نے اس کی صحت پر سخت برا اثر ڈالا۔ تاہم وہ متوقع تھا کہ کسی نہ کسی دن نیازی کا یہ ناقابلِ برداشت رویہ بدل جائے گا۔ اُسے اپنے ظلم کا احساس ہو جائے گا۔ پر اس کی یہ توقع کبھی پوری نہ ہو سکی۔ ہر روز زہر آلود طعن و تشنیع سن سن کر، ہر روز اپنی توہین کے جملے برداشت کر کے وہ عصبی مریض بن گیا۔ وسیع خاندان کے پریشان کر دینے والے اخراجات نے اسے اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ وہ ہر روز اس نوکری پر لعنت بھیجنے، مصمم ارادہ کرنے کے باوجود ہوٹل سے چمٹا ہوا تھا۔ مگر آج اس کی دل کی آگ میں صبر و استقامت کا رہا سہا خرمن جل کر راکھ ہو گیا تھا! اس کے تمام حواس پر صرف ایک ہی خیال، ایک ہی ارادہ قابض تھا اور وہ تھا اپنی توہین کا جواب، ہوٹل سے ہمیشہ کے لیے علیحدگی — اور افضل اپنی بیوی کو کوس رہا تھا اگر وہ آرائش و زیبائش کی اتنی شائق نہ ہوتی، زیب و زینت کے لیے ہر روز نیا نیا مطالبہ نہ کرتی رہتی تو وہ مدت سے لعنت کے اس طوق کو گلے سے اتار چکا تھا۔ اس نے ہزاروں مرتبہ ارادہ کیا کہ ایکسویٹیس کی یہ ذلت آفریں ملازمت چھوڑ کر کوئی معمولی مگر

عزت والی ملازمت اختیار کرلے لیکن بدقسمتی سے اس کے بیوی کے ہر روز بڑھتے ہوئے مطالبات نے اس ارادے کو پورا نہ ہونے دیا۔ اور اب بھی وہ کئی دن سے اپنی سنہری بارڈر والی ساری کے لیے خاص قسم کے بلاوز کی فرمائش سے اسے پریشان کررہی تھی۔ ابھی چند روز ہوئے یہ ساری ساڑھے سینتالیس روپے میں خرید کردی تھی۔ بیوی کے یہ مطالبات اسے تنگ نہ کرتے رہتے تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی توہین نہ برداشت کرتا، استعفیٰ لکھ کر نیازی کے منہ پر دے مارتا اور ہوٹل سے نکل جاتا۔ کسی دفتر میں معمولی کلرک ہی ہوجاتا کم از کم وہاں یہ توہین تو نہ ہوتی، ہر روز کا یہ ظلم نہ سہنا پڑتا۔

غیر شعوری پر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ آنکھوں کے نیچے رخسار کی ابھری ہوئی ہڈی پر متوازی لکیریں خون کی تیز گردش سے نمایاں ہوگئیں۔ اس نے سوچ لیا کہ اب ایک لمحہ توقف کئے بغیر ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جائے گا — سنہری بارڈر والی ساری کو جلا کر راکھ کر دے گا تاکہ اس کی بیوی اس کے لیے خاص قسم کے بلاوز کی فرمائش سے پریشان نہ کرے۔ بلاوز کا خیال کرتے ہی اسے بیوی کے اور مطالبات یاد آگئے! اس کی کسی عزیز سہیلی کا بیاہ تھا، یہ ساری اس تقریب کے لئے منگوائی گئی تھی۔ اور ابھی سرخی، پوڈر، اور بے شمار چیزوں کا بوجھ اس کے دماغ کو دبائے جارہا تھا۔

"عزت کی روکھی سوکھی کھانا بے عزتی کے پلاؤ سے ہزار درجہ بہتر ہے"۔ نہ معلوم بچپن میں یہ الفاظ اس نے کس شخص کی زبان سے سنے تھے اور ان الفاظ کے اچانک یاد آجانے پر اسے ایک قسم کا سکون محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے دل و دماغ سے کوئی بھاری بوجھ اٹھ گیا اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے رومال نکالا اور پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے ساتھی کی طرف دیکھنے لگا اس کے ساتھی نے ایک لمبی آہ بھری، اور اپنی زبان سے پپڑی جمے ہونٹوں پر پان خوردہ سیاہی مائل لعاب کا لیپ کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں کسی گہرے زخم کی طرح سرخ تھیں، دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔

اور پھر نظریں دھوئیں کے اس بادل پر جم کر رہ گئیں جو انگیٹھی سے اٹھ کر، فضا میں پھیلتا ہوا سیاہ چھت کو اور سیاہ کررہا تھا۔

رشید نے دوسری بار آہ بھری اور اپنے ساتھی کی طرف مخاطب ہوکر تیزی کے ساتھ کہنے لگا۔ "افضل! اب تو انتہا ہوچکی ہے۔ میں ایک منٹ کے لیے بھی یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ غضب خدا کا یہ شخص ہمیں کتے سے بھی زیادہ ذلیل سمجھتا ہے انسان کو دنیا کی ہر چیز کے مقابلے میں اپنی عزت کو زیادہ عزیز سمجھنا چاہیے عزت ہے تو سب کچھ ورنہ کچھ بھی نہیں فاقے کروں گا پر ادھر آنے کا نام نہیں لوں گا۔ تم اپنی توہین برداشت کرسکتے ہو یہاں رہو میں تو جاتا ہوں"۔

افضل نے بوٹ کی نوک سے انگیٹھی کے باہر پڑے ہوئے کوئلے کو زور سے ٹھوکر لگائی اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "یہ خبیث پاجی آخر ہمیں سمجھتا ہی کیا ہے۔ یہاں نوکری نہ دیں گے تو کیا بھوکے مرجائیں گے۔ ہاں تم پہلے کیطرح نہ آجانا"۔

رشید تڑپ اٹھا" وہ تو — تم دوسروں کے حالات کا اندازہ نہیں لگا سکتے مگر اب فاقے کرکے مرجاؤں گا۔ گداگری کرکے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرلوں گا — اور نہیں تو خودکشی کرلوں گا"۔ افضل اپنے دوست کے جوش سے متاثر ہوا اس کے شانے تھپتھپانے لگا" میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ بات یہ ہے تم پورے خاندان کے کفیل ہو"۔

"خیر اب کوئی چیز بھی مجھے نہیں روک سکتی۔ بھاڑ میں جائے خاندان عزت تو ہے —"

"اور تو نے سنا نہیں" افضل نے اس کے الفاظ کاٹتے ہوئے کہنا شروع کیا "عزت کی روکھی سوکھی بے عزتی کے پلاؤ سے ہزار درجہ بہتر ہے"۔ یہ کہہ کر افضل استعفیٰ لکھنے لگا۔ اپنے دوست کو استعفیٰ لکھتے دیکھ کر رشید بھی جیب سے کاغذ نکال اس کی تہیں کھولنے لگا۔

دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے کھلا۔ ہاتھ میں پیچوان لئے ہوئے نیازی اندر آیا اور ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دونوں کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

کیا بات ہے میاں جی جو یوں کھڑے ہو" وہ کوٹ کی میلی چیکٹ سے ناک پونچھتے ہوئے بولا۔ اور پھر خود ہی ہنس پڑا۔" اچھا ــــ میاں جی! ــــ میاں جی آپ کسی جگہ نوکری کریں میں آپ جتنا پڑھا ہوتا تو ــــ"

" بکو نہیں پاجی، حرامخور" افضل نے غصے سے کڑاک کر کہا۔ نتھو نے بیچوان کے پیندے کو زور سے زمین پر مارا، دو تین لمحوں کے لیے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ہاتھ ہی سے جلتے ہوئے کوئلے چلم میں ڈالنے لگا۔ بیچوان ٹھیک ٹھاک کرنے کے بعد وہ اسے ان کے پاس لے گیا، اور کچھ کہے سنے بغیر باہر چلا گیا۔

نتھو ہوٹل میں آخری درجے کے ملازم تھا جس کا کام یہ تھا کہ ہوٹل کے مہمانوں کی خدمت کے علاوہ دونوں منیجروں کی خدمت بھی کرتا رہے۔ چند دن ہوئے افضل نے اسے بیماری کی حالت میں سڑک پر اینٹیں اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا اور اس پر رحم کھا کے یہاں لے آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دونوں کی خدمت بڑے شوق سے کرتا تھا۔

نتھو چند قدم ہی گیا ہوگا کہ افضل نے آواز دی، اور دونوں کاغذ اس کے ہاتھ میں دیکر بولا۔" شاہ کو دے دینا ــــ اور کہنا وہ چلے گئے ہیں۔

تو ــــ اچھا اچھا۔ نتھو کو اپنا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی لفظ نہیں ملتا تھا

دونوں کمرے سے نکل کر تیزی کے ساتھ ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترنے لگے۔

افضل گھر پہنچا تو معمول سے زیادہ کھویا کھویا تھا۔ بیوی خوب جانتی تھی کہ اس کا شوہر گھر میں آتے ہی ہوٹل کے مالک کو دو تین گالیاں دینے کے بعد اپنی بدنصیبی کا شکوہ شروع کر دیتا ہے مگر جب وہ بن سنور کر، اس کے قریب بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے تو وہ دن بھر کوفت کو بہت حد تک بھول جاتا ہے۔ آج بھی بیوی نے اسے دیکھا تو مسکرا کر سینٹ کی نئی شیشی نکال کر ریشمی رومال کو معطر کرنے لگی، اور پھر رومال کے سرے کو دائیں ہاتھ کی لانبی لانبی انگلیوں سے پکڑے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

پیارے ــــ ہائے آج بھی نہیں لائے نا بلاؤز ــــ میں جاؤں میرے اللہ ــــ" اور اس نے اس قسم کا منہ بنالیا جیسے ابھی زار و قطار رو پڑے گی۔

" تو مر جاؤ۔ مجھے نجات ملے" بیوی سہم گئی۔ پہلے تو کبھی اسکے شوہر نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے۔

" کیا ہوا پیارے"،

" تمھیں کیا، تم تو میری دشمن ہو، مجھے ذلیل کرنے میں تمھیں لطف ملتا ہے خدا کی قسم"

" آخر کچھ کہو بھی، میں تو پہلے ہی سمجھتی تھی آجکل جناب کا مزاج بگڑا جا رہا ہے"۔

" دشمن نہیں تو اور کون ہو۔ ایکبار نہیں ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ عزت کی روکھی سوکھی پلاؤ سے بہتر ہے مگر تمھیں تو چاہیے ساری، بلاوز، سرخی، پوڈر اور ــــ خدا جانے کیا کیا کچھ ــــ تیس روپے میں بھی گزر اوقات ہو سکتی ہے"۔

بیوی نسوے بہانے لگی، آگ لگے اس ساری کو میں کہیں بھی نہیں جاؤنگی۔ لوگ یہی کہیں گے نا کہ اتنے بڑے ہوٹل کے منیجر کی بیوی نے فقیرنی کا لباس پہنا ہے۔ آپ کی عزت خاک میں مل جائیگی

" ذرا سوچو تو جب لوگ میرے میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑے دیکھ کر باتیں کریں گے اس وقت کتنی توہین ہوگی جناب کی۔ میرا کیا ہے۔ مسئلہ تو آپ کی عزت کا ہے"۔

" کچھ بھی ہی ــــ میں ہوٹل کی نوکری چھوڑ آیا ہوں"۔

" ہائے اللہ۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ میں جانوں اسی رشید نے پٹی پڑھائی ہے آپ کو۔ خود گریبان میں ذرا منہ ڈال کر تو دیکھیے۔ پہلے نوکری چھوڑ گیا تھا، اور جب کہیں بھی نوکری نہ مل سکی تو پھر بھاگا ہوٹل کی طرف۔ اور کام بھی کیا کر سکتا ہے ــــ آپ کی اس نوکری سے ہماری سو عزت ہے۔ پر اب"

وہ زار و قطار رونے لگی۔ افضل کا دماغ چکرانے لگا ــــ بیوی کے معطر گیسو اس کے چہرے سے مس کر رہے تھے۔

دوسرے دن ہوٹل کے دروازے پر پہنچتے ہی اسے بیوی کے تمام الفاظ یاد آ گئے۔ دروازے پہ قدم رکھا تو ٹھٹک گیا اس کا

جی چاہا کہ واپس چلا جائے کہ یکایک نیازی پر نظر پڑ گئی۔

نیازی مسکرایا اور اس کو ساتھ افضل کو اپنی بیوی کی عقلمندی پر یقین آ گیا، رات بیوی نے پیشین گوئی کی تھی کہ نیازی دل کا بُرا نہیں ہے، اور اب ثابت ہو گیا تھا کہ وہ دل کا برا نہیں ہے! اپنے ساتھی کا خیال کیے بغیر وہ کام کرنے لگا۔

قریباً بارہ بجے رشید آیا۔ ابھی وہ یہی سوچ رہا تھا کہ رشید سے کیا کہے کہ ہوٹل کا ایک ملازم اسے پیچھے صحن میں لے گیا! شاہ صاحب یاد فرماتے ہیں، یکایک نیازی کی گرجتی ہوئی آواز گونجنے لگی۔

ہوٹل کے ملازم کام کاج چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگنے، مگر وہ ایک قدم بھی نہ اٹھا سکا۔ اپنے دوست کو اپنی آنکھوں کے سامنے ذلیل ہوتے دیکھنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ میرے دوست کو بے عزت کر کے نکالا جا رہا ہے تو پھر میرا یہاں رہنا سخت نامناسب بات ہوگی۔ دوستی کا تقاضا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ چلا جاؤں — بیچارہ میری طرح مجبور ہو کر آیا ہے — حساب کتاب لکھنے کے سوا کر بھی کیا سکتا ہے۔"

اس کا خون کھولنے لگا۔ مگر عین اسی لمحے اسے اپنے چہرے سے کوئی ملائم سطح چہرہ مس کرتی ہوئی محسوس ہوئی — رضیہ کا اداس چہرہ کون دیکھ سکے گا — وہ امیر باپ کی بیٹی ہے۔ ناز و نعم میں پرورش پائی ہے اس لئے اس کے اخراجات میں قطع و برید کرنا اس کے حق میں ظلم ہوگا — لوگ ہماری عزت کرتے ہیں اتنے شاندار ہوٹل کے منیجر کی بیوی —"۔ بیوی کی باتیں یکے بعد دیگرے اسے یاد آنے لگیں اور وہ اپنے دوست کو ٹالنے کے لیے نئے نئے بہانے سوچنے لگا۔ "کچھ دن کا یہاں رہ کر اپنی اور تمہاری توہین کا انتقام لوں گا — کچھ دیر یہاں رہوں۔ پھر چلا جاؤں گا — طرح طرح کی تجاویز اس کے دماغ میں گھومنے لگیں۔ اس انہماک میں اسے یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ رشید اس کے پاس آ پہنچا ہے ہنسی کے مارے اس کا بُرا حال تھا — اسے اپنے دوست پر رحم آ گیا۔ بیچارہ مایوسی کی شدت میں شاید پاگل ہو گیا ہے — چلو یہ بھی اچھا ہوا — اسے شرمندہ تو نہ ہونا پڑے گا۔

"چلو کمرے میں —" رشید نے اس کا بازو پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے کہا۔ افضل گھبرا گیا۔

"چلو بھی — یہاں ٹھیک نہیں۔"

افضل اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

"بڑا تماشا ہوا — تم نے دیکھا ہی نہیں —" ہنسی کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔

"آخر کچھ کہو بھی۔"

"— دیکھتے تو بڑا لطف آتا۔ ہوا یہ کہ اس کی ماں بیمار تھی کئی دن سے — آج دیر سے آیا تو نیازی گالیاں بکنے لگا —"

افضل حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔

بھئی شاباش ہے اس کی جرأت پر — ایک ایک گالی کا جواب دیا ذرا بھی لحاظ نہ کیا، بلکہ جواب دینے میں اس سے بڑھ کر ہی رہا۔ اتنا نڈر، بیباک — بدمعاش میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا ہے تو رزیل خاندان کا مگر —"

"کون بھئی — خدا جانے کیا کہہ رہے ہو"

اسی بدمعاش کی بات ہے۔ نتھو اور کون — ؟ بھئی خدا کی قسم مزا چکھا دیا اس نے نیازی دریازی کو"

"اور اب کہاں ہے؟" افضل نے اطمینان کا سانس لیکر کہا۔

"چلا گیا یہاں سے — اسی وقت چلا گیا تھا — شاہباز اس کی طرف بڑھا تو کہنے لگا خبردار آگے آئے تو ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔ — نیازی سر کے درد کے بہانے فوراً گھر چلا گیا —"

"نتھو بھی چلا گیا"

"ہاں کہا تو ہے چلا گیا — اس وسیع دنیا میں جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ سڑکوں پر نعشیں اٹھائے گا۔ پہلے کی طرح گھوڑوں کی نعل بندی کرے گا — سو کام کر سکتا ہے بدمعاش"۔ یہ کہتے ہوئے رشید نے جیب سے دو کاغذ نکالے اور انہیں پھاڑ کر ٹکڑوں کی نذر کر دیا۔ افضل مسکرا پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی چھاتی سے کوئی بوجھ اٹھ گیا۔

"— واقعی تھا تو رزیل مگر جرأت خوب کی — ہاں بھئی آج شام کو بلاوز خریدنے انارکلی جانا ہے۔ تنگ کر دیا ہے تمہاری بھابی نے —"

امید رضوی

"کل رات کو"

تھی مری مہمان اک جانِ حیا کل رات کو
غیرتِ جنت تھا میرا غم کدہ کل رات کو

لوٹتی تھیں ہر در و دیوار پر رنگینیاں
چھا گئی تھی رنگ و بو کی وہ گھٹا کل رات کو

کر رہا تھا بارشِ تنویر ابرِ ماہتاب
حسن افگن تھی ستاروں کی ضیا کل رات کو

ذرہ ذرہ تھا مرے ظلمت کدہ کا شمعِ طور
جگمگا اٹھا تھا ایوانِ وفا کل رات کو

آ گئے تھے ایک ہی مرکز پہ مرکز اور محیط
رک گئی تھی گردشِ ارض و سما کل رات کو

کامگارِ آرزو تھی کوششِ ناکامیاب
کامیابِ مدعا تھی ہر دعا کل رات کو

عشق کو تھا ناز اپنے طالعِ بیدار پر
حسن خود تھا ناز بردارِ وفا کل رات کو

قاتلِ صبر و سکوں اور رہزنِ تمکین و ہوش
سامنے تھی کوئی کافر ماجرا کل رات کو

عارضِ رنگیں پہ تھی معصومیت چھائی ہوئی
کھل رہا تھا اک گلِ رنگیں ادا کل رات کو

ایک ہی لے میں تھے ہم آہنگ دو روحوں کے ساز
چھڑ گیا تھا اس طرح سازِ وفا کل رات کو

سن رہا تھا حسنِ وادی میں اپنی ہی غزل
تھی کوئی آتش نفس گرمِ نوا کل رات کو

میرے ہونٹوں کے قریں تھا ساغرِ آبِ حیات
چھلکی پڑتی تھی شرابِ کیف زا کل رات کو

کانپتے ہونٹوں پہ وہ مبہم سا پیمانِ وفا
سُرمگیں نظروں میں تھا رنگِ قضا کل رات کو

ان کے لب پر تھا تبسم اور تبسم بے حجاب
مُسکرا اُٹھی تھی عالم کی فضا کل رات کو

ہر قدم لغزیدہ لغزیدہ نفس تیز تیز
یوں خراماں تھی کوئی محشر ادا کل رات کو

نیچی نظروں میں تھی رقصاں ایک موجِ انبساط
اُڑ رہا تھا غازۂ رنگِ حیا کل رات کو

دو دھڑکتے روح و دل تھے بے نیازِ آب و گِل
دور تھا دل سے خیالِ ماسوا کل رات کو

آ رہی تھیں سامنے کھوئی ہوئی سی منزلیں
مِل رہا تھا ظلمتوں میں راستا کل رات کو

موت تھی میری نظر میں اک کنیزِ کمتریں
زندگی ہی زندگی تھی رونما کل رات کو

ہیں دماغ و دل پہ باقی اس کے دھندلے نقوش
میں جہاں تھا شاد کامِ مُدعا کل رات کو

ماہر القادری

بکھرے ہوئے پھول

خدا کا انکار فکر و خیال کی سب سے بڑی غلطی اور خطرناک جہالت ہے۔

گلاب گلقند بن کر میٹھا ہو جاتا ہے مگر گلاب نہیں رہتا

پھانسی کے تختے اور پھولوں کی سیج میں صرف زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔

یورپ میں غیرت کے سوا ہر چیز مل سکتی ہے۔

تلوار سے سیب تراشا جا سکتا ہے مگر انگلیاں خون آلود ہو جائیں گی۔

انقلاب کا طوفان بادشاہ کے قصر اور فقیر کے جھونپڑے میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔

دل کی چوریاں اور نفس کی کمزوریاں بہت دنوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔

جس بچہ کو شعر اور نغمہ سے دلچسپی ہو، اس کے کردار پر گہری نظر رکھو۔

پردہ مرد اور عورت کے درمیان احتیاط کی دیوار ہے۔

جب تم پر جذبات کا غلبہ نہ ہو اس وقت سوچو کہ تمہیں کس عورت سے محبت ہے۔

اگر ہر شخص اپنے کو خوبصورت نہ سمجھتا تو ایک ایک دن میں لاکھوں آئینے توڑ دیئے جاتے۔

عقیدت اور پرستش میں بہت ہی نازک فرق ہے۔

آزادی کی بیل قربانی کے سہارے پروان چڑھتی ہے۔

سینما کے مناظر بہت دلچسپ ہوتے ہیں، کاش! لوگوں کو معلوم ہوتا کہ

آنکھوں کی راہ سے بھی قوت ضائع ہوتی ہے۔

آزاد کے آنسو غلام کی مسکراہٹ سے زیادہ شگفتہ اور جاندار ہوتے ہیں۔

شرافت اگر مول بکتی تو امیر سب سے زیادہ شریف ہوتے

آئینہ دیکھتے وقت ایک نگاہ دل کی طرف بھی ڈالنے کی کوشش کرو۔

انقلاب کا آفتاب خون اور آگ کے اُفق سے طلوع ہوتا ہے۔

بناوٹ اور ریاکاری کا ملمع بہت جلد اُتر جاتا ہے۔

مغرور اور متکبر کو ذلیل کرنا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔

بہت سی مسکراہٹیں آنسوؤں اور آہوں کی نقیب ہوتی ہیں۔

زہر سے انسان مر جاتا ہے اور گناہ انسانیت کو مار ڈالتا ہے۔

بہت سے پڑھے لکھے جاہل اور نادان ہوتے ہیں۔

کامیابی چاہتے ہو تو خطرات میں کودنے سے نہ گھبراؤ۔

آگ آج بھی گلزار بن سکتی ہے مگر جذب ابراہیمؑ کی ضرورت ہے۔

انگریز کے شیک ہینڈ (Shake hand) کے جھٹکوں سے دھوکا نہ کھاؤ۔

مصیبت کی طرح جوانی بھی اندھی اور بہری ہوتی ہے۔

دنیا کی کوئی بیش بہا چیز عورت کی عصمت کی قیمت نہیں ہو سکتی۔

دھوکا دینے سے دھوکا کھانا اچھا ہے۔

سانپ کا پھن منافق کی زبان سے کم آزار ہوتا ہے۔

جوانی کی بھول چوک سادہ اور بڑھاپے کی لغزش چالاک ہوتی ہے۔

جس نے عورت کو سمجھ لیا اُس نے کائنات کے سب سے بڑے راز کا پتہ لگا لیا۔

چیخنے چلانے اور افسوس کرنے سے ہوئی بات ان ہوئی نہیں ہو سکتی۔

چاندی کے ڈھیر اور سونے کی اینٹیں سکونِ قلب کی دشمن ہیں۔

غیرت کی رگ نازک ترین رگ ہے اسے بار بار نہ چھیڑو۔

پھول کی پتی کو چھو کر کانٹے کی نوک پر انگلی رکھو انتقام اور درگذر کا فرق معلوم ہو جائے گا۔

جو شخص پرائی عورت کو ہوسناک نگاہ سے دیکھ سکتا ہے وہ دوسرے کا مال بھی چرا سکتا ہے۔

مظلوم کے ماتھے کا پسینہ بغاوت کی آگ پر تیل چھڑکتا ہے۔

دولتمندوں کی سب سے بڑی کمزوری خوشامد ہے۔

ضمیر فروشی کے بعد جو عیش حاصل ہو اُس سے مر جانا اچھا ہے۔

دنیا نے ہوس اور محبت کو سدا ایک ہی سمجھا ہے۔

رحمت اُس پر جس نے سچائی کی خاطر دنیا میں سب سے پہلے اپنا خون بہایا۔

آزادی کا راستہ تلوار کی دھاروں اور سنگینوں کی نوکوں سے ہو کر گذرتا ہے۔

نبی دنیا سے سیکھنے کیلئے نہیں دنیا کو سکھانے کے لیے آتا ہے۔

دوسروں کو دکھانے کے لیے بناؤ سنگھار کرنے والی عورت تقدیسِ عصمت کو نیلام پر چڑھا چکی۔

جوانوں کا جذبہ اور بوڑھوں کا تجربہ قوموں کی تقدیر بدلتا ہے۔

جھوٹی شہرت کا ردِ عمل بڑا خوفناک ہوتا ہے۔

چلو گے تو ٹھوکر ضرور کھاؤ گے، پھول توڑنے والی انگلیاں کانٹوں کی خراش سے بچ نہیں سکتیں۔

ہوس اور لالچ کی پیاس مرتے دم تک نہیں بجھتی۔

جوانی قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے مگر بہت سے اس کی قدر نہیں کرتے۔

پتھروں کی چٹانوں سے پھوٹتے ہوئے چشموں کو دیکھ کر مجھے سنگدل انسان یاد آتے ہیں۔

کلب گھر قمار بازی اور بدکاری کے مہذب اڈے ہیں۔

بہت سے اُجلے چہرے سیاہ باطن ہوتے ہیں۔

خدا کے اقرار کا یہ مطلب ہے کہ دنیا کی ہر جبروتی قوت کے خلاف اعلانِ بغاوت کر دیا گیا۔

دولت کی آنکھ افلاس کی مسکراہٹ کو برداشت نہیں کر سکتی۔

ہوس کی بوندوں سے ہونٹ بھیگ سکتے ہیں مگر پیاس نہیں بجھ سکتی۔

ذرا سی غلطی تھوڑی سی بھول چوک اور معمولی لغزش بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی ہے۔

کفایت شعاری کی آخری حد بخل کا نقطہ آغاز ہے۔

بہت سے جھوٹ خوشنما اور بہت سے سچ ڈراونے ہوتے ہیں۔

دنیا کے بہت سے مہذب ڈاکو اور لٹیرے قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔

رشوت ستانی کا انسداد اس وقت تک ممکن نہیں جبتک افسروں کے بڑھے ہوئے اخراجات کم نہ کر دیے جائیں۔

سچائی کی شہادت زبان ہی سے نہیں اپنے کاموں سے دو۔

دنیا میں امن چاہتے ہو تو قرآنی حکومت کو پھیلا دو۔

کاہل اور بے عمل آدمی سے لوہے کے بے جان پرزے زیادہ کارآمد اور مفید ہیں۔

توحید کے بعد دوشیزگی سب سے زیادہ مقدس اور قابل احترام چیز ہے۔

مردِ مجاہد کے قدم کی ایک جنبش زاہد کے لاکھ سجدوں پر بھاری ہے

جوانی کے بعد جو حسن زائل ہو گیا وہ حسن نہیں تھا جذبات کے جھاگ تھے۔

عمل ارادے اور خیال کا برزخ ہے۔

جس طرح ستاروں سے چمک اور پھولوں سے مہک چھینی نہیں جا سکتی اسی طرح مردِ مومن کا ایمان کوئی نہیں چھین سکتا۔

شراب پینے والا اپنی عزتِ نفس اور عظمتِ خودی کا دشمن ہے۔

بہت سی بے ربط باتیں سچی اور بہت سی مربوط باتیں جھوٹی ہوتی ہیں۔
رکاوٹیں اور مشکلیں جذبۂ طلب کو اور تیز کرتی ہیں۔
خدا کی آواز سننا چاہتے ہو تو جھوٹی باتیں سننا چھوڑ دو۔
دنیا کے پیچھے دوڑنے والے پرچھائیوں کا تعاقب کرتے ہیں۔
غلامی ذلت اور تباہی کی آخری حد ہے۔
ناامیدیوں سے بچنا چاہتے ہو تو کسی سے توقع نہ رکھو۔
غرض کی دوستی پانی کے بلبلہ جیسی ہے کہ ذرا ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا۔
حق کی آزمائش زہر کے پیالے ہی میں نہیں قند و نبات کے شربت میں بھی ہوتی ہے۔
غیروں کی دعاؤں سے اپنوں کی گالیاں بہتر ہیں۔
خالی ہاتھ سے نیام بے شمشیر ہی غنیمت ہے۔

فلسفہ کی بھول بھلیوں میں فکر و خیال گم ہو جاتے ہیں۔
موت سے ڈرنے والے زندگی کی حقیقی لذتوں سے ناآشنا رہتے ہیں۔
میں خونخوار دشمنوں کے آتشباز طیاروں سے زیادہ مہربان دوستوں کی دیاسلائی سے ڈرتا ہوں۔
جب کوئی گالیوں پر اتر آئے تو سمجھ لو کہ اس نے ہار مان لی۔
وطن سے محبت کرو مگر اسے اپنا معبود نہ بناؤ۔
گناہوں کی سیاہی رات کے اندھیرے کی طرح پھیلتی ہے۔
عشرت ساحل موت ہے اور اضطراب دریا زندگی۔
حکومتیں سب سے زیادہ محکوموں کے اتحاد سے ڈرتی ہیں۔

خودی کی موت ہے بندوں کے سامنے جھکنا
ملیں جو قیصر و کسریٰ بھی تو سلام نہ کر

ہماری جدید مطبوعات

آثار اقبال	ے سکہ کلدار
فکر اقبال	للعہ ۱۲/ ،،
روح اقبال	صمہ ،،
فلسفۂ عجم	۱۲/ ،،
سرنوشت	سے ۱۲/ ،،
صید زبون	عا/ ،،
وسوسے	عا/ ،،
اسلامی تہذیب	۱۲/ ،،
اقبال کے خطوط جناح کے نام	عہ/ ،،
نفسیات زندگی	۶/ ،،
بچوں کی نفسیات	عہ ۱۲/ ،،
	عہ ۱۲/ ،،

دھوپ	ے سکہ کلدار
نگارشات محمد علی	۱۲/
جلوہ رنگین	ے ۱۲/ ،،
تعبیریں	ے ،،
نگینے	عا ۱۲/ ،،
اسرار	عا ۱۲/ ،،
ہچکیاں	عا ۱۲/ ،،
قصص و مسائل	سے ۱۲/ ،،
ذکر جمیل	عہ ۱۲/ ،،
سیزا	عہ ۱۲/ ،،
تنقیدی جائزے	عا ۱۲/ ،،
	سے ۱۲/ ،،

ظفر واسطی

ٹریجڈی

میں اپنی چار برس کی بچی کو گود میں اٹھائے ریلوے پلیٹ فارم پر اس تلاش میں پھر رہا تھا کہ کوئی ایسا کمرہ مل جائے جس میں میرا بھی سفر دلچسپی سے کٹ جائے اور بچی کا بھی۔

ایک چکر کاٹا، پھر دوسرا اور تھک کر ایک کمرے میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ دو مسافر نظر آئے جن میں ایک بلاشبہ "دلچسپ" تھا۔ میں اُن کے پیچھے چل پڑا۔ وہ جا کر ایک ایسے ڈیوڑھے درجے میں بیٹھ گئے جس میں مسافروں کی تعداد نسبتاً کچھ کم تھی۔ میں بھی اسی درجہ میں اُن کے بالکل برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ریل چلنے تک تو بچی مٹھائی کھاتی رہی جو میں نے اُسے لے دی تھی لیکن ریل کے چلتے ہی مچلنے لگی کہ امی کے پاس جاؤنگی۔ میں نے بہلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ رونے لگی جن دو مسافروں کو دیکھ کر میں اس درجہ میں بیٹھا تھا اُن میں سے ایک مسافر جو کم عمر تھا بچی کے رونے سے بہت زیادہ متاثر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے آہستہ سے کچھ کہا اور ساتھی میری طرف دیکھ دیکھ کر کئی دفعہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ شاید اُسے کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

دوسرا اسٹیشن آیا تو میں نے پھر بچی کے لیے دو چار چیزیں خرید دیں مگر وہ بدستور اپنی امی کے پاس جانے کی ضد کرتی رہی۔ بڑی عمر کا مسافر چھوٹی عمر کے مسافر کے ایما پر جرأت کر کے بولا "آپ اسے اس کی ماں کے پاس کیوں نہیں چھوڑ آتے کیا وہ اس گاڑی میں آپ کے ہمراہ سفر نہیں کر رہی ہیں؟"

میں نے آہ بھر کر کہا "اس کی ماں!" اور چلتی ہوئی ریل سے باہر غیر محدود فضا میں بے مقصد دیکھنے لگا۔

میرے کچھ نہ بتانے پر بھی وہ بہت کچھ سمجھ گئے۔ خاص طور پر کم عمر مسافر بہت زیرک تھا۔ اس نے اپنے ساتھی سے پھر کچھ کہا اور ساتھی جسے ایک مرتبہ بات کر کے کچھ حوصلہ ہو گیا تھا اُٹھ کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا "لائیے بچی کو ہمیں دیدیجئے ہم اسے چپ کرالیں گے۔"

پھر جوں جوں ریل منزلیں طے کرتی رہی مجھے اُن کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔ مثلاً کم عمر مسافر لاہور کے زنانہ ہائی اسکول میں سیکنڈ مسٹرس تھی اور اس کا ساتھی اس کا چچا تھا جس کے اپنے کوئی اولاد نہ تھی اور جس نے اُسے اُسکے ماں باپ سے لے کر پرورش کیا تھا۔ پھر بدقسمتی سے اُس کے ماں باپ بھی یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ پروین نے ابھی ایف اے کیا تھا کہ اس کی شادی کر دی گئی۔ میاں چند مہینے زندہ رہ کر اپنی ساس اور سسر کے پاس چلا گیا۔ شوہر کی بے وقت موت سے پروین کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی لیکن ایک امید نے اس تاریکی میں ایک چھوٹا سا چراغ روشن کیے رکھا۔ چند مہینوں کے بعد پروین کو خدا نے ایک بچی دی جس سے اُسکی

تیرہ و تار دنیا میں کچھ روشنی ہو گئی۔ وہ بچی بالکل میری نجمہ جیسی تھی۔ لیکن شومیٔ تقدیر کو کیا کیجئے۔ بچی بھی باپ کی طرح بے وفا ثابت ہوئی اور دو سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئی۔ بچی پیدا ہوتے ہی پروین کالج میں پھر سے داخل ہو گئی تھی۔ خیال تھا کہ خود اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر بچی کی پرورش کر سکے۔ لیکن بچی ہی نہ رہی۔ پھر بھی اس نے کالج نہ چھوڑا۔ بی۔ اے کر کے بی ٹی کیا اور اسکول میں استانی ہو گئی۔ اس کے چچا ایک اعلیٰ عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے اور اُس کے ساتھ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ اب پروین اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے لیے ملازمت نہ کرتی تھی بلکہ اس لیے کرتی تھی کہ ایک مشغلہ رہے اور اس مشغلہ میں زندگی گذرتی جائے۔

میں نے ابھی انہیں ایک بڑی پردرد داستان سنا ڈالی اور یہ داستان سن کر بڑے میاں اور پروین مجھ سے اور نجمہ سے اور زیادہ ہمدردی جتانے لگے۔

نجمہ اس دوران میں کبھی میرے پاس آتی کبھی پھر پروین کے پاس چلی جاتی۔ دو ایک دفعہ تو بڑے میاں کی معرفت ہم نے بچی کو ایک دوسرے سے لیا دیا پھر براہ راست لینے دینے لگے۔

جب ہمارے اسٹیشن سے پہلا اسٹیشن آ چکا تو میں ٹوائلٹ روم میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے چلا گیا وہاں سے نکلا تو بڑے میاں نے بہت بڑی تمہید کے بعد اپنی اور اپنی بھتیجی کی اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں نجمہ کو کچھ دنوں کے لیے اُن کے پاس چھوڑ دوں اور وہ یقین دلانے لگے کہ وہ اسے اپنی بیٹی جیسا سمجھیں گے اور ذرا دل میلا نہ ہونے دیں گے۔

پروین بولی اور آپ کو بھی اتنی بڑی ذمہ داریوں سے نجات مل جائے گی۔

میں نے آہستہ سے کہا "یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن میں تو اس کے بغیر ایک دن بھی نہیں کاٹ سکتا۔"

پروین میری طرف دیکھ کر چپ ہو گئی۔ گویا کہہ رہی تھی آپ بھی اگر کچھ ہرج نہ ہو تو کچھ دنوں کے لیے لاہور چلئے۔

میں نجمہ کو گود میں لیے اترا تو ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پروین تو میرے پلیٹ فارم پر اترنے کے بعد بھی نجمہ کو میری گود سے لے کر پیار کیا۔ نجمہ بھی رونے لگی کہ میں نہیں اترتی میں ان کے ساتھ جاؤں گی بشر یہیں کی۔ پروین نے اُسے اپنے سینے سے چمٹا کر زور سے بھینچا اور پھر ایک دفعہ اور اس کا منہ چوم لیا۔

سفر یقیناً دلچسپ کٹا تھا۔ میرا بھی اور نجمہ کا بھی۔ اور شاید پروین اور اسکے چچا کا بھی۔ لیکن دلچسپی کے ساتھ ہم نے ــــ کم از کم میں نے اور پروین نے غیر شعوری طور پر ایک روگ بھی خرید لیا تھا۔ اور یہ سب کچھ سفر کو دلچسپ بنانے کی کوشش میں ہوا تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ مرد ایک عورت سے مطمئن کیوں نہیں ہوتا۔ ہمیشہ دوسری عورتوں کو کیوں تاکتا رہتا ہے اور اس کوشش میں کیوں لگا رہتا ہے کہ اسے کسی اور عورت کی بھی محبت حاصل ہو جائے خواہ اس کی اپنی بیوی کیسی ہی حسین کیوں نہ ہو۔

اس کے بعد ہم میں مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی۔ اور اس خط و کتابت کے ذریعہ یہ روگ بڑھتا رہا۔ آخر پروین نے اپنے چچا کے نام سے وہ بات لکھ ہی دی جو اس خط و کتابت اور اس روگ کا لازمی نتیجہ ہونے والی تھی۔ اب میری آنکھیں کھلیں۔ اب میں سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ میں بغیر سوچے سمجھے اتنی دور تک بڑھتا چلا گیا تھا کہ اب واپسی ناممکن تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے ایک قدم آگے اٹھانا بھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ اب تک اس سارے معاملہ میں میں نے اپنی بیوی کو نظر انداز کر دیا تھا لیکن اس سے زیادہ اب اُسے نظر انداز نہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ بات میری سمجھ میں آج تک آئی کہ جو بیویاں حسین ہوتی ہیں انہی کے شوہر کیوں دوسری عورتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ انہی کے شوہر کیوں دوسری گاؤں کے ڈھونگ رچاتے ہیں۔

سوچ سوچ کر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ گول ہو جاؤ اور خط کا جواب ہی نہ دو۔ دو چار خط لکھ کر خود ہی خاموش ہو جائے گی

آٹھ دس دن انتظار کرکے اس نے دوسرا خط لکھا اور پھر اتنے ہی عرصہ کے بعد تیسرا لیکن میں نے دل پر بے انتہا جبر کیا اور جواب نہ دیا۔ پھر ایک روز جو میں صبح کو سوتا اٹھا تو گیا دیکھتا ہوں کہ پروین اور اس کے چچا دونوں دوسرے کمرے میں قلی سے اپنا سامان اتروا رہے تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی میں جھوٹ موٹ کا بیمار بن گیا۔ نوکر کو ایک دم کراہتے ہوئے آواز دی وہ بھاگا ہوا آیا تو میں نے اسے جلدی جلدی اسے کئی ہدایتیں کر ڈالیں۔ ابے دیکھ یہ پوچھیں تو بتانا کہ صاحب کو بیس بائیس دن سے بخار ہے۔ نوکر درمیان میں بولا" جو انھوں نے پنڈا دیکھ لیا۔ میں نے جل کر کہا" میں بتا تو رہا ہوں تو بیچ ہی میں ٹپک پڑا۔ تو تو کہنا کہ صاحب کو بیس بائیس دن سے بخار تھا بس کل اترا ہے۔ اور اگر گھر کے متعلق پوچھیں تو کچھ نہ بتانا۔ میرا یہ مطلب ہے کہ کہنا مجھے کچھ خبر نہیں۔

" صاب میں جھوٹ نہیں بولوں گا" اس نے اپنا منہ پھلا کر کہا

یہ کمبخت بچپن سے ہمارے یہاں رہتا ہے۔ بلکہ یہ کہوں کہ میرے بچپن کا ساتھی بھی ہے۔ اسکول سے آکر میں اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ بڑا وفادار نوکر ہے لیکن جب یہ کسی ایسے اہم موقع پر کوئی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے تو میرے جی میں آیا کرتا ہے کہ اس کا سر دیوار سے دے ماروں۔

" جھوٹ کا بچہ" میں نے چڑ کر کہا۔ اس میں جھوٹ کس بات کا ہے؟

" تو آپ کو اللہ نہ کرے بخار کہاں ہے"

" جا دفع ہو اور جو جی میں آئے کہنا" میں نے تنگ آکر کہا۔

معلوم یہ ہوا کہ پروین دہلی میں دسویں کا امتحان دینے والی لڑکیوں کا سائنس کا پریکٹیکل کا امتحان لینے آئی تھی۔ چچا یونہی تفریحاً چلے آئے تھے۔ نوکر نے گھر کے متعلق انہیں کچھ نہ بتایا اور لفظ بہ لفظ میری ہدایتوں پر عمل کیا۔ خدا جانے اس سے ملیں کیا سا گئی تھی ورنہ وہ تو پرلے درجے کا ضدی ہے۔

" پروین نے ایک روز فرصت پاکر پھر وہی ذکر چھیڑ دیا۔ میرا نوکر اور اس کے چچا بازار گئے ہوئے تھے۔ اس نے اعلیٰ تعلیم اس لیے تھوڑا ہی حاصل کی تھی کہ نامناسب شرم و حیا سے اپنی زبان بند رکھے یا دل کی بات لب تک نہ آنے دے۔

میں نے براہ راست اصل بات بتا دینے کی بجائے یہ مناسب سمجھا کہ یہ خود ہمارے گھر جا کر میری بیوی کو دیکھ لے۔ لہذا کہا کہ ہمارے یہاں سب لوگ بہت پرانی تہذیب کو پسند کرتے ہیں اور تم نئی تہذیب کی دلدادہ ہو معلوم نہیں کہ جس ماحول میں میرے ماں باپ بھائی بہن اور دوسرے رشتہ دار زندگی گذارتے ہیں تم اس ماحول میں زندگی بسر کر سکو گی یا نہیں اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہمارے یہاں جا کر کچھ دن رہو اور حالات کا مطالعہ کرو۔ اس کے بعد بھی اگر تمھاری رائے نہ بدلی تو شاید مجھے کوئی اعتراض نہ ہو۔

میری عادت ہے کہ میں کسی کام کا انجام پہلے سے نہیں سوچتا۔ جو تجویز ایک دم دماغ میں آئی اسکی معمولی سی اونچ نیچ سوچ کر اس پر عمل پیرا ہو جاتا ہوں۔ اس عادت کے سبب مجھے اکثر پچھتانا پڑتا ہے مگر یہ عادت نہیں چھوٹتی۔

پروین نے میری تجویز پر رضامندی کا اظہار کیا تو میں نے والدہ کو خط لکھ دیا کہ میرے دوست کی بہن جو لاہور کی رہنے والی ہیں کچھ دن ایک چھوٹے سے قصبہ میں گذارنا چاہتی ہیں۔ لہذا وہ فلاں دن آئیں گی۔ انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا۔

پروین نے چند ہی دن میں سب کا دل موہ لیا۔ والدہ اس پر فریفتہ ہو گئیں۔ ہمشیرہ اس پر جان چھڑکنے لگیں۔ والد صاحب نے خط لکھا تو جی کھول کر پروین کی تعریف کی۔ لیکن میں اس کے خط کا انتظار کر رہا تھا یا پھر بیوی کے خط کا لیکن تعجب ہے کہ دونوں میں سے کسی نے بھی مجھے خط نہ لکھا اور میں زیادہ سے زیادہ پریشانی میں مبتلا ہوتا رہا۔

پندرہ دن کے بعد پروین کا خط آیا اور وہ بھی لاہور سے بیوی نے پروین کے لاہور چلے جانے کے بعد بھی مجھے کوئی خط نہ لکھا پھر میرے تین چار خطوط پہنچنے پر لکھا بھی تو بہت مختصر۔ پروین کا

خط آیا تو پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی گو نوعیت بدل گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ میں نے آپ کے وطن میں بہت شاندار وقت گذارا۔ درحقیقت وہاں کی ہر ایک چیز سے مجھے ایک گونہ محبت ہو گئی ہے۔ خاص طور پر آپ کی خالہ زاد بہن پر تو میں جنون کی حد تک شیدا ہو گئی ہوں۔ انھوں نے میری ایسی خاطر و مدارات کی کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان پر بے حد رشک آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں تعلیم کے اعتبار سے ان سے کافی بلند ہوں مگر میری تعلیم ان کی دوسری خوبیوں کے مقابلہ میں کوئی چیز نہیں۔ آدم برسرِ مطلب مجھے آپ کے یہاں کی تہذیب، فضا، اور باتیں بہت ہی پسند آئیں اور ہر وہ چیز مجھے پسند ہے جو آپ سے متعلق ہے خواہ اس کا رشتہ کیسا ہی دور کا کیوں نہ ہو۔

تو میں وہاں دس دن رہ کر کہیں زیادہ شدت کے ساتھ اپنے چچا کی اس خواہش کا اظہار کرتی ہوں جس کی وجہ سے آپ نے مجھ سے اپنے یہاں کے حالات کا معائنہ کرنے کے لیے کہا تھا امید ہے کہ اب آپ چچا جان کو مایوس نہیں کریں گے۔

سخت حیرت ہوئی۔ میں نے پروین کو اس لیے گھر بھیجا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں سے میری بیوی کو دیکھ لے اور میری مجبوریاں سمجھ جائے لیکن یہ ایک نیا گل کھلا جس لڑکی کو اس نے میری "خالہ کی لڑکی" لکھا تھا وہی تو میری بیوی تھی لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پروین سے کیا یہ بات چھپائی گئی اور خط سے ظاہر تھا کہ ضرور چھپائی گئی لیکن پھر اس بات کے چھپانے کا مقصد بھی سمجھ میں نہ آتا تھا جبکہ چھپانے والوں کو اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا اگر فائدہ پہنچتا تھا تو مجھے۔ لیکن میں خود بھی یہ فائدہ حاصل کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

سوچتا رہا۔ پروین کے چچا کی خواہش کی بابت بیچ بیچ سوچتا رہا لیکن کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ خلافِ عادت کوئی تجویز ذہن میں نہ آئی ورنہ درحقیقت میں اس پر عمل پیرا ہو جاتا پھر یہ معاملہ بھی تو بہت اہم تھا۔ اور پھر اس کا اثر —— صرف میری ہی زندگی پر نہ پڑتا تھا۔ اس کی ساری ہلاکت آفرینی بیوی کی زندگی پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ اس سوچ بچار میں عید آگئی۔

گھر پہنچ کر بیوی سے معلوم ہوا کہ جب پروین نے سب کی تعریف پوچھی تو اس نے مذاق میں اپنے متعلق یہ کہہ دیا تھا کہ میں ان کی خالہ کی لڑکی ہوں۔ اور یہ بات چونکہ والدہ اور ہمشیرہ کے سامنے کہی گئی تھی اس لیے انھوں نے بھی اسے آخر دم تک نبھایا۔ بیوی نے اس رات پروین کے متعلق اور کچھ نہ بتایا۔ اگلے دن ہمشیرہ کہنے لگیں کہ بھائی جان پروین کو تار دے کر بلا لیجیے نا۔ عید یہاں کر جائیں گی وہاں اکیلی میں کیا خوش ہوں گی۔ میں نے کہا بھئی وہ ابھی تو رہ کر گئی ہیں اتنی جلدی کیا آئیں گی۔ اور بیوی بولی "آپ تار تو دے دیں واقعی اس بے چاری کی وہاں کیا عید ہوگی۔ بیوی کا یہ فقرہ مجھے کھٹکا۔ میں نے کہا اب تک تو ساری عیدیں اس نے وہیں کی ہیں۔" کہنے لگی "جب کی اور بات تھی" میں نے تعجباً پوچھا اور اب کیا ہو گیا؟ پھر والدہ بھی ان کی ہم زبان ہو گئیں۔ جیسا کہ ان تینوں نے آپس میں مشورہ کر رکھا تھا۔

پروین آئی تو سب کے لیے تحفے لائی "خالہ کی لڑکی" کے لیے بہت اچھی ساڑھی۔ نجمہ کے لیے ہیرے کے بندے اور بہن کیلئے سونے کے۔ والدہ کے لیے بہت عمدہ کپڑوں کا جوڑا والد صاحب کے لیے بھی کپڑے اور میرے لیے دستی گھڑی یہ سب چیزیں شاید اس نے جاتے ہی خرید کر رکھ لی تھیں ورنہ اتنی جلدی تو خریدی نہ جا سکتی تھیں۔ پھر کپڑے سینے سلانے کے لیے بھی دو چار دن چاہئیں۔ پھلوں اور میووں کے ٹوکرے ان کے علاوہ تھے۔

اب اسے پتہ لگ گیا کہ "خالہ کی لڑکی" میری بیوی ہے لیکن یہ پتہ لگنے کے بعد بھی اس نے اپنے رویہ سے کسی قسم کے رنج یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا بلکہ بیوی سے اور زیادہ محبت کا اظہار کرنے لگی یہاں تک کہ مجھے بیوی سے تنہائی میں بات کرنے کا بھی موقع نہ ملتا۔ ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتی۔

(۲)

(پروین کی زبانی)

جس روز مجھے بشیر کے یہاں سے رخصت ہونا تھا اس دن نزاکت اور بشیر سارا دن اوپر کی منزل میں بیٹھے رہے۔ صبح کو نزاکت میرے ساتھ چائے پی کر بشیر کے لیے چائے لے کر اوپر گئی تھی پھر واپس ہی نہ آئی۔ دوپہر کا کھانا بشیر نے وہیں منگا لیا اور پھر شام کی چائے بھی۔ مجھے گویا وہ بالکل بھول گئے تھے گو ہمشیرہ اور والدہ نے مجھے ایک لمحہ کو بھی اکیلا نہ چھوڑا اور بہت دلچسپ باتیں کرتی رہیں لیکن سچ پوچھئے تو مجھے نزاکت اور بشیر کے اس رویہ سے سخت روحانی تکلیف پہنچی۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں پہلی مرتبہ جاتے ہوئے نزاکت سے یہ کیوں کہہ گئی تھی کہ مجھے بشیر نے عید پر تار دلا دینا میں یہ عید آپ لوگوں کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ کچھ بھی ہو ان کے یہاں یہ میرا آخری دن تھا۔ اس کے بعد میں شاید کبھی ان کے یہاں نہ آتی۔ میں نے اپنے دل میں یہی فیصلہ کیا تھا۔ میں کسی صورت نزاکت کی زندگی برباد کرنا نہ چاہتی تھی اگر مجھے پہلے دن پتہ چل جاتا تو میں شاید بشیر سے اتنی محبت بھی نہ بڑھاتی۔ لیکن مجھے تو نجمہ سے محبت ہوئی تھی۔ نجمہ کیسی پیاری بچی ہے۔ میں اب بھی اس سے بے انتہا محبت کرتی ہوں۔ اگر یہ لوگ مجھے صرف نجمہ ہی کو دے دیں تو میں خوش ہو جاؤں گی لیکن یہ نجمہ کو ـــــ اپنے لخت جگر کو نہیں دے سکتے خیر نہ سہی۔ اگر میری قسمت میں کسی بچے کو اپنا بچہ کہنے کی خوشی نہیں ہے تو نہ سہی۔ نزاکت کیسی اچھی اور پیاری خصلت کی لڑکی ہے۔ میں اپنی خوشی کے لیے اس کی خوشی برباد نہیں کر سکتی اور مجھے کرنی بھی نہیں چاہیے۔ میں جب سارے واقعات پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی۔ نہ جانے کس غیبی طاقت کے زیر اثر شروع سے ہم نے ایک دوسرے کو غلط واقعات بتائے۔ میری عمر چونکہ کچھ زیادہ ہے اس لیے جو بھی ملتا یہی پوچھتا کہ اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ یہ کوئی نہ سوچتا کہ جس سے یہ سوال کیا گیا ہے اس کے دل پر اس سوال سے کیا کچھ بیت جائے گی اور کسی کو خبر بھی کیا تھی کہ میں جس سے شادی کرنا چاہتی تھی وہ ایک حادثہ کا شکار ہو کر مجھے دنیا سے ـــــ دنیا کی ہر ایک دلچسپی سے آزردہ کر گیا تھا۔ ان سب باتوں سے مجبور ہو کر میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب جو کوئی شادی کے متعلق پوچھے گا یہی جواب دوں گی کہ شادی کی تھی شوہر داغ مفارقت دے گیا وغیرہ ـــــ گو یہ سب کچھ کہتے ہوئے مجھے اپنے دل و دماغ پر آرے سے چلتے معلوم ہوتے لیکن یہ تکلیف اس اذیت سے بدرجہا کم تھی جو اصل بات بتانے پر لوگوں کے فقرے سن کر میری روح کو پہنچتی تھی۔ ادھر بشیر نے بھی نہ جانے کس بنا پر یہی درد داستان ہمیں سنائی۔ میں اس کی نیت کو تو الزام نہیں دے سکتی لیکن کوئی اور مقصد بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ خدا رکھے وہ تو بہت خوش قسمت انسان ہے۔ نزاکت جیسی بیوی، نجمہ جیسی لڑکی اور روپیہ پیسہ بھی۔ ان کے علاوہ انسان کو اور کیا چاہیے۔

میں بظاہر ہمشیرہ اور والدہ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہی تھی لیکن دل میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ نہیں آج ہی اتنی زیادہ باتیں کرنے کا خیال کیوں آیا۔ کیا نزاکت مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ بشیر میرا ہے تو بیوقوف ہے جو اسے اپنا بنانے کی کوشش کرتی ہے لیکن نزاکت ایسی کم ظرف نہیں ہو سکتی۔ پھر آخر یہ لوگ اوپر جا کر کیوں بیٹھ گئے کیا مجھ سے اتنا تنگ آ گئے ہیں کہ میری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتے لیکن میں تو آج شام کو جا رہی ہوں۔ کل تو میں یہاں نہ ہوں گی۔ نجمہ کبھی ہمارے پاس آ جاتی اور کبھی اوپر اپنے ماں باپ کے پاس چلی جاتی۔ وہ بھی کچھ بے چین سی تھی۔ شاید اس کی ننھی سی عقل میں یہ بات نہ آ رہی تھی کہ اس کے ماں باپ آج سب سے الگ بیٹھے کیا سرگوشیاں کر رہے ہیں۔

جس گاڑی سے مجھے جانا تھا وہ ساڑھے سات بجے چلتی تھی چھ بج گئے لیکن نزاکت نہ آئی۔ پھر ساڑھے چھ بج گئے۔ اور جب پونے سات بجے تو میں روہانسی ہو گئی آخر انہیں ساری عمر ایک

ساتھ رہنا ہے۔ اب اگر وہ گھنٹہ کے لیے یہاں آجائیں تو ان کا کیا بگڑ جائے گا۔ اگر ان دونوں کو مجھ سے اتنا ہی گریز کرنا تھا تو مجھے بلایا ہی کیوں تھا۔ بشیر کی تو ابھی دو دن کی چھٹی اور باقی ہے، وہ کل اور پرسوں بھی تو باتیں کر سکتا ہے آخر تنگ آکر میں نے بن کو بھیجا کہ جاکر ذرا اوپر کو نزاکت کو بلا لائے۔ مگر نزاکت نے یہ کہہ کر کہ میں ابھی آئی پھر کوئی خبر ہی نہ لی۔ سات بجے تو میں نے سوچا کہ وہ یہاں نہیں آئے تو نہ آئیں میں خود ہی اوپر جاکر دو منٹ میں رخصت کیوں نہ ہو آؤں۔

بشیر چارپائی پر لیٹا تھا اور نزاکت اس کے قریب کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر دونوں مسکرا پڑے لیکن ان کی مسکراہٹوں میں بھی مجھے رنج و تفکر اور شاید درماندگی کے آثار نظر آرہے تھے میں نے بشیر کی طرف دیکھا اُسے شاید مجھ میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی رہی۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ اُن آنکھوں میں عزم اور استقلال کی کیسی چمک تھی۔ پھر اس کے چہرے رنج و تفکر کے آثار بھی رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ شگفتگی نے لے لی۔

میں نے کہا "معاف کیجیے کہ میں آپ کی خلوت میں مخل ہوئی۔ لیکن گاڑی کا وقت ہو گیا ہے اور جانے سے پہلے آپ لوگوں سے ملنا بہت ضروری تھا"۔

"آپ اس گاڑی سے نہیں جا رہی ہیں" نزاکت نے مسکراتے ہوئے نہایت وثوق سے کہا۔

"کیا خوب! مجھے کل اسکول جانا ہے۔ پھر چچا جان بھی پریشان ہوں گے۔ میں اُن سے آج ہی تک کی اجازت لائی تھی"۔

"کل تار دیں گے بلکہ انہیں بھی بلا لیں گے" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس کی ضرورت بھی"۔ میں ابھی تک اُن سے ناراض تھی۔

"ضرورت ہے اور بہت زیادہ" وہ میری بات کا جواب دے کر بشیر سے مخاطب ہوئی "آپ یوسف کے یہاں جا رہے تھے تو ہو آئیے"۔

بشیر اٹھا چپل پہنے اور چپ چاپ نیچے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد نزاکت نے بہت مختصر الفاظ میں بتایا کہ سارا دن ان کے درمیان کیا موضوع زیر بحث رہا اور یہ کہ خود اس کی کیا رائے ہے۔ اس کی بات سنی تو میرے سارے بدن میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی میں اپنے دل میں کیا سوچ رہی تھی اور نزاکت کسی تجویز پر عمل کرنے کے متعلق غور کرتی رہی۔ اور نہ صرف غور کرتی رہی بلکہ بشیر کو ترغیب بھی دیتی رہی۔

"لیکن یہ بات قطعی ناممکن ہے کم سے کم میں اس کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں" میں نے برہم ہو کر کہا۔ اس کا مجھے اعتراف ہے کہ اس کی تجویز سن کر میرے دل میں خود بخود لڈو پھوٹنے لگے تھے۔

وہ مسکرائی اور نہایت دلکش آواز میں بولی "پاگل نہ بنو ـــــ جھوٹے خیالات کی دنیا میں گم رہنے سے کہیں بہتر ہے کہ ہم تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کر سکیں"۔

"کچھ بھی ہو نزاکت لیکن مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا" میں نے دو لمحوں میں سب کچھ سوچ لیا تھا۔

"لیکن اس کی وجہ بھی؟" اس نے دریافت کیا اور کرسی سے اٹھ کر چارپائی پر لیٹتے ہوئے۔

بولی "معاف کرنا میں بیٹھے بیٹھے بہت زیادہ تھک گئی ہوں ـــــ ہاں تو اس کی کچھ وجہ بھی بیان کر سکتی ہیں آپ؟"

"میں تمہاری خوشیوں کی قیمت دے کر اپنے لیے کوئی خوشی خریدنا نہیں چاہتی" میں نے اپنا فیصلہ کہہ سنایا۔

وہ چارپائی پر سیدھی لیٹی تھی۔ ایک دم اس نے میری طرف کی کروٹ کرلی اور بولی "میں مانتی ہوں یہ الفاظ بہت خوبصورت ہیں لیکن آپ حقیقت کی تلخی کو خوبصورت الفاظ کی شیرینی میں نہیں چھپا سکتیں اس کے ساتھ یہ بھی عرض کر دوں کہ مجھے آپ کے حسن نیت پر پورا پورا اعتماد ہے"۔

"حاشا و کلا اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا نزاکت کہ بشیر شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی خدا کے احسان سے زندہ ہے تو میں کبھی معاملات کو اس حد تک نہ پہنچنے دیتی"۔

میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ مجھے آپ کے حُسن نیت پر پورا پورا اعتماد ہے۔ اس کے علاوہ "جو ہوا سو ہوا" اب یہ بتائیے کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس کے بعد ہمیں کیا کرنا چاہیے"۔

میں لاہور چلی جاتی ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ پھر کبھی آپ کی دنیا میں قدم نہ رکھوں گی۔ کوئی اور بیوی ہوتی تو وہ اسے غنیمت سمجھتی بلکہ میرا شکریہ ادا کرتی لیکن وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گہری نظروں سے دو تین لمحے تک دیکھتی رہی، وہی اطمینان بخش تبسم اسکے چہرے پر کھیل رہا تھا پھر کہنے لگی۔ یہ غلط قدم ہوگا۔ میں جانتی ہوں کہ تم اور بشیر ایک دوسرے سے کتنی زیادہ محبت کرتے ہیں۔"

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ خود میں نے نزاکت کو اپنی محبت کی داستان سنائی تھی۔ کوئی ذرا سی بات بھی ایسی نہ تھی جو میں نے نہ بتائی ہو۔ اس وقت تو مجھے یہ ساری داستان سناتے ہوئے بہت لطف آیا تھا لیکن جب سے یہ معلوم ہوا کہ نزاکت بشیر کی بیوی ہے۔ مجھے یہ سب کر گزرنے پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں اکثر سوچتی کہ یہ سب کچھ سنتے ہوئے نزاکت کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ میں جانتی ہوں کہ نزاکت بشیر سے کیسی والہانہ اور بے انتہا محبت کرتی ہے لیکن شاباش ہے اس پر کہ اس نے ذرا بھی تو مجھے شبہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ یہ داستان سنتے ہوئے ہمدردی کے فقرے ایسے مناسب موقعوں پر بولتی رہی کہ میں اور زیادہ لطف لے لے کر سنانے لگی۔

گاڑی کا وقت تو نکل ہی گیا تھا۔ میں نے کہا چلئے نیچے چلتے ہیں۔ وہاں اماں وغیرہ انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں چاہتی تھی کہ اس بات کا فیصلہ کئے بغیر لاہور چلی جاؤں اور پھر ادھر کا رخ نہ کروں۔ کہنے لگی" اس بات کا فیصلہ کر کے چلیں گے۔ سارا دن بحث کر کے بشیر کو تو میں نے اسی بات پر راضی کرلیا ہے۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم سے بھی بحث کرنی پڑے گی۔"

میں کوئی بحث کرنے کے لیے تیار نہ تھی بلکہ میں نے اپنے دل میں ایک لائحہ عمل بھی مرتب کرلیا تھا کہ یہاں سے جا کر نہ کبھی بشیر کو خط لکھوں گی نہ ملنے آؤں گی۔ بلکہ اگر ممکن ہوا اچھا سے تار دلوا دوں گی کہ میں چل بسی تاکہ پھر کبھی بشیر کو میرا خیال نہ آئے۔ خواہ ایسا کرنے میں مجھے اپنے دل پر کتنا ہی جبر کرنا پڑے اور خواہ اس جبر کرنے میں مجھے اپنی جان ہی سے ہاتھ دھونے پڑیں۔

نزاکت نے جواب کا انتظار کر کے پھر کہا "بھئی خاموشی سے کام نہیں چلے گا۔ یا مجھے قائل کر دیجیے یا خود قائل ہو جائیے۔ میں آپ کے مقابلہ میں کچھ پڑھی لکھی بھی نہیں ہوں۔

میں نے کہا" نزاکت میں نہیں چاہتی ——— میں جھجکی لیکن پھر بولی" میں نہیں چاہتی نزاکت ———

کوشش کے باوجود میں فقرہ مکمل نہ کر سکی۔

نزاکت نے کہا" میں پہلے آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ حقائق سے فرار حقائق کی تلخی یا اہمیت کو کم نہیں کر دیتا۔ چلئے آپ اس کا کوئی اور علاج بتلائیے یعنی جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے، اسے کس طرح خوش انجام بنایا جائے۔ میں آپ کو دعوت دیتی ہوں دنیا کے کسی مذہب کسی معاشی سوسائٹی سے اس کا علاج ڈھونڈ لائیے۔ ایسا علاج جس سے کسی کی جان پر نہ بنے اور ہم تینوں خوش و خرم رہیں۔"

میں نزاکت کو بہت اچھی لڑکی سمجھتی تھی لیکن یہ بات کبھی میرے خیال میں بھی نہ آئی تھی کہ وہ اتنی ایثار پرست اور بلند طینت ہوگی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اس میں میرا ہی فائدہ تھا لیکن اس کی موجودگی میں میں اپنے مفاد کی پرواہ نہ کر سکی۔ میں نے دبی آواز میں کہا۔

"تم اپنی آستین میں سانپ پالنا چاہتی ہو۔"

"خدا نہ کرے میں کبھی بھی تمہیں سانپ سمجھوں۔ میں تمہیں خیر خواہ سمجھتی ہوں اور ہمیشہ سمجھتی رہوں گی۔ جس بات کے لیے میں آپ کو تیار کرنا چاہتی ہوں وہ کوئی ناقابل عمل بات نہیں۔ آپ پروا نہ کیجئے۔ میں اور آپ ہمیشہ اسی طرح ایک دوسری سے محبت کرتی رہیں گی۔

میں خاموش رہی جیسی خلوص اور محبت سے وہ دعوت دے رہی تھی اسے مدنظر رکھتے ہوئے مجھ سے ایک لفظ بھی نہ کہا جاسکا۔

میری خاموشی پر اس نے رقت بھری آواز میں کہا" دنیا والوں کی باتوں پر نہ جائیے جو دو شادیوں کے خلاف جائز ناجائز زہر اگلتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں کہ ان حالات میں اس سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں۔ آپ اور بشیر ایک دوسرے سے بے اندازہ محبت کرتے ہیں۔ آپ ایک بار کہہ چکی ہیں کہ اگر آپ کی شادی بشیر سے نہ ہوئی تو نصیب دشمناں آپ کچھ کھا کر سو رہیں گی۔ یہ درست ہے کہ یہ بات کہتے وقت آپ کو معلوم

نہیں تھا کہ آپ بشیر کی بیوی سے بات کر رہی ہیں لیکن اس سے اصل بات پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر نامناسب جذبات سے متاثر ہو کر یہ یا آپ کچھ کھانے کی بجائے ایسی تجویز پر کیوں نہ عمل کریں جس سے کسی کو کچھ کھانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ آخر کسی کام کی چیز کو صرف اس لیے چھوڑ دینا اُسے بُرا سمجھتی ہے۔ میرے نزدیک تو عقلمندی ہے نہیں۔"

نزاکت کی دلیلوں میں عاجز آگئی۔ اور وہ تھی بھی ہر اتنی پر۔ دنیا میں ہزاروں میں شاید ایک آدھ ہی عورت ایسی نکلے جو اتنی وسعتِ نظر اور بلند ہمتی سے حقائق کا مقابلہ کرے تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے ایک خوفناک ٹریجڈی کو انتہائی رنج و غم میں ختم ہونے سے بچا لیا۔

(اسماعیل احمد مینائی تسنیم)

غزل

بیکار سرِ بزم وہ ہمراز چھپے ہیں — دنیا میں کہیں عشق کے انداز چھپے ہیں
دیکھو تو وہ ظاہر ہیں بہ ہر غنچہ و ہر گل — سمجھو تو بہ ہر نغمہ و ہر ساز چھپے ہیں
اب بابِ قفس وا ہے تو پابندِ قفس ہے — آثارِ مقامِ خطِ پرواز چھپے ہیں
اک وہمِ سماعت ہے سکوتِ دلِ مایوس — ٹوٹے ہوئے اس تار میں سو ساز چھپے ہیں
نافہمیِ عالم کا عبث تجھ پہ ہے الزام — جو راز چھپائے گئے وہ راز چھپے ہیں
پھر سادگیِ حسن کا یہ لطف کہاں تھا — اچھا ہے کہ تجھ سے ترے انداز چھپے ہیں

تسنیم بہ ہر سازِ نفس ہوتا ہے محسوس
جیسے وہ پسِ پردۂ آواز چھپے ہیں

اشکِ ندامت

پنّا اپنی آنکھوں کو جوٹ مل کے بھینٹ چڑھا کر مل کے پھاٹک سے نکل آیا ـــــ یا دوسرے اندھوں کی طرح سڑک کے کنارے "آنکھیاں بڑی نعمت ہیں بابا" کی صدا لگانے کے لیے نکال دیا گیا۔ آنکھوں کے اجالے کے بدلے اُسے پنشن تو کیا سو دو سو روپیہ بھی نہ ملا ـــــ ملتا بھی کیوں؟ وہ مِل میں نوکری کرنے آیا ہی کیوں تھا؟ کوئی اسے بلانے تو گیا نہ تھا؟ اگر مِل کے مالک اس طرح معاوضہ دینے لگیں اور ہمدردی کرنے لگیں تو سال ہی بھر میں مشینیں نیلام ہوتے نظر آئیں۔ وہ ایک مزدور کا ساتھ اس وقت تک دیتے ہیں جب تک اس کے ہڈیوں میں گودا باقی رہتا ہے ـــــ اور خالی ہڈی کو تو کتا بھی سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ پنّا کے لیے اب صرف ایک ہی راستہ تھا۔ وہ چمپا اور چھگن کو لے کر سڑک کے کنارے کسی پیڑ کے نیچے جا بیٹھتا۔ وہ مِل سے دگنا کما سکتا تھا۔ اُس پر کوئی رحم کھاتا یا نہ کھاتا مگر چمپا تو نبری چیز تھی۔ اُسے دیکھ کر تو سخت سے سخت ہاتھ بھی جیب کی طرف بڑھ جاتا ـــــ لیکن پنّا مزدور تھا اُس نے آٹھ برس کی عمر سے خون پسینہ بہا کر کمایا تھا۔ وہ راستہ چلتوں کے آگے ہاتھ پھیلانا کیسے گوارا کر لیتا اور پھر چمپا اور چھگن کو ساتھ لیکر۔ ایسی زندگی سے وہ موت کو اچھا سمجھتا تھا۔ مگر بس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ کون تھا جو تین جانوں کا بوجھ اپنی گردن پر لیتا؟ پنّا کی غیرت یہ نہ دیکھ سکتی تھی کہ چمپا اُسے کما کر کھلائے۔ وہ خود سب کو کما کر کھلانا چاہتا تھا اپنا مردانہ وقار رکھنے کے لیے مگر اُس کے لیے صرف وہی راستہ تھا جس سے اسے نفرت تھی۔ دو مہینے تک وہ اپنے بے نور آنکھوں سے کوئی اور راستہ تلاش کرتا رہا۔ اُسے تو نہ ملا مگر ہاں چمپا نے ضرور ایک سہارا ڈھونڈ لیا۔ انجن شیڈ اس کے گھر کے قریب تھا۔ اگر وہ دن بھر میں کوئلوں کے دو ٹکڑے بھی بین لاتے تو ان کے لیے بہت تھا۔

پنّا یہ کب دیکھ سکتا تھا۔ وہ منع کرتا رہا مگر چمپا کو بھوک نے انجن شیڈ میں پہنچا ہی دیا۔ چمپا کے انجن شیڈ میں پہنچنے کے وہاں کے کالے کالے نیلے پیلے مہیب ماحول ایک چاندنی سی پھیل گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بھادوں کی کالی رات میں بادلوں کے اوٹ سے پورنماشی کا چاند نکل آیا۔ چمپا کا پہنچنا بیداری کا پیغام تھا۔ سوئی ہوئی امنگیں ہچکولے لینے لگیں۔ دبے ہوئے چنگاریاں سلگ اٹھیں۔ آنکھوں میں کام دیوتا ناچنے لگا اور منہ میں پانی بھر آیا۔ انجن شیڈ کا ہر قلی چمپا کے حسن کو روند ڈالنے کی فکر میں تھا۔ جب وہ اپنے پھٹے ہوئے نیلے لہنگے اور سُرخ چولی میں کوئلوں کے سیاہ انباروں کے اردگرد گھومتے پھرتی ہوتی تو نگاہیں اس پر اس طرح ٹوٹ پڑتیں گویا ان چیتھڑوں میں

ں چھپے ہوئے حسن کے ہر حصے کو دیکھ ہی لیں گے۔ چاروں طرف
ے آوازیں کسے جاتیں۔ فقرے چست کیے جاتے مگر چمپا جیسی تپّا
ورت پر اُن کا کیا اثر ہوتا۔ اُس کا اندھا پتا اب بھی چاند سے
یادہ حسین تھا۔ وہ اُن کالے کلوٹے قلیوں کو کیا پرواہ کرتی
— اُسے تو اپنے کام سے کام تھا۔ لیکن تمام انجن شیڈ
ں چمپا اگر کسی کی طرف تھوڑی بہت توجہ دیتی تھی تو وہ شیڈ
ا چوکیدار منہئی تھا۔ اور یہ بھی اس لیے تھا کہ کوئلے چننا تو م
نع تھا۔ اور چمپا کی زندگی کوئلوں کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے
ے۔ کوئلے چننے کے لیے منہئی کی خوشنودی ضروری تھی۔ لیکن
ہ منہئی کو کسطرح خوش کرتی — کیا وہ اس کی وہ خواہش
وری کر دیتی جس کا منہئی کے آنکھوں کی چمک اسپر اظہار کر چکی
ھی — ایسے خوشنودی سے وہ موت کو بہتر سمجھتی تھی۔
منہئی اپنے خواہش کو ٹھکراتے ہوئے کن انکھوں سے دیکھتا۔
دن بدن اس کی سختیاں بڑھنے لگیں۔
چمپا کو کوئلوں کے حٹوں کے پاس دیکھ کر منہئی مونچھوں کو
ل دیتے ہوئے چلا کر کہتا "تا ہے جائے گی کا۔ ہم تمکا کہئے دیت
ہوں۔ حرامجادے کو سجا کرائے دوں گا۔ چمپا اس ڈانٹ کا
مطلب خوب سمجھتی تھی وہ ایسی بن جاتی جیسے اُس نے کچھ سنا ہی نہیں
اور برابر کوئلے چنتے رہتے۔ منہئی اپنا ڈنڈا سنبھالتا ہوا تیزی سے
اس کی طرف آتا اور کہتا "کاہے ہمرے روٹی کے دشمن ہوئی ہے
اس روٹی کی کھاطر اپنے پردیس میں بال بچے چھوڑے پڑے ہیں
. . . . . بال بچوں کا لفظ زبان پر آتے ہی منہئی کو جانے
کیا یاد آجاتا۔ اسپر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ اس کے
آنکھوں میں کام دیوتا ناچنے لگتا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ
چمپا سے نجانے کیا کہہ دیتا . . . . . . کیوں نہ تھا۔ تیرہ روپیہ
کی کھاطر وہ اپنے سینے پر سِل رکھے اپنی مہریا سے دور پڑا ہوا تھا۔
آخر اس کے سینے میں دل تھا لوہے کا ٹکڑا نہ تھا۔ اس کے بھی
جذبات تھے۔ کون تھا جسے اُسکے جنسی ضروریات کی خبر تھی۔ تیرہ
روپیہ وہ پردیس میں اپنی ضروریات پورے نہ کر سکتا تھا۔ اُسے
مفت کے مال کی ضرورت تھی اور چمپا کو وہ چند کوئلے کے ٹکڑوں

میں خرید سکتا تھا۔ وہ اس کا ان داتا تھا اسی کے بل پر تین جانیں
پل رہی تھیں۔ کیا چمپا اُس کے لیے اتنا بھی نہ کر سکتے تھے۔ مگر چمپا
پتی ورتا عورت تھی۔ اسکی نظر خود بخود زمین پر گڑ جاتیں اور گردن
نیچے ڈھلک جاتی اور دل ہی دل میں وہ اُسے ہزاروں کوسنے
دیتے۔ ہفتوں یہ کش مکش جاری رہی۔ چمپا نیا راستہ ڈھونڈ
رہی تھی۔ وہ راستے کے تلاش میں پریشان تھی اور کسی سے کچھ
کہہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ ایک طرف اُسے روٹیوں سے محتاج ہو جانے
کا ڈر تھا۔ چھگن اور پتا کے بھوک کے تصور سے وہ کانپ اٹھتی۔
دوسرے طرف اس کی عزت اور ایمان تھا۔ کیا وہ پیٹ کی
خاطر اپنے پتا سے دغا کرتی . . . . . . وہ سوچتے رہی اور آخر
اُسے راستہ مل ہی گیا۔ اُسے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا۔ اُسے
اس بھیڑیوں کے دنیا میں رہنا آگیا۔ پہلے چمپا کے نزدیک غیر مرد
سے آنکھ ملا کر بات کرنا بھی پاپ تھا۔ مگر اب وہ ایسی ویسی
بے عزتی کو بے عزتی نہ سمجھتی تھی۔ کیا ہوا اگر جمعدار نے اس کا
ہاتھ پکڑ لیا۔ آخر اسی کی مہربانی سے تو وہ۔ اُس کا پتا اور
چھگن جی تھے۔ عزت حرمت سگریٹ کے راکھ ہیں کہ ہاتھ لگاتے
ہی جھڑ جائے۔ اب اس کے خیال میں بے حرمتی نام تھا جنسی اختلاط
کا اور جب تک اس قسم کا موقعہ نہ آئے اس کی عصمت بالکل
محفوظ تھی — اب وہ دن بھر جمعدار اور قلیوں کا دل بہلاتی
رہتی۔ کسی کو دیکھ کر ہنس دیتی۔ کسی سے دو چار باتیں کر لیتی اور
منہئی کے پاس تو وہ بیٹھی ہی رہتی تھی اُس سے تو پکا وعدہ
کر چکی تھی۔

کئی مہینے گذر گئے۔ چمپا روزانہ سوا روپیہ لیکر گھر میں گھستی۔
دن بھر وہ انجن شیڈ والوں کو دھوکے دیتی اور شام کو اپنی
حقیقی جنت میں پہنچ جاتی — اپنے پتا کے چرنوں میں —
اُسے ایسا محسوس ہوتا گویا پتا اپنی بے نور آنکھوں سے سب کچھ
دیکھ رہا ہے اور اسے شاباشی دے رہا ہے۔ پتا کی غیرت
رفتہ رفتہ کم ہو گئی۔ اب وہ چمپا کی کمائی کے خیال کو بھول گیا
اُسے چمپا پر اعتبار تھا اور وہ اپنے زندگی سے مطمئن تھا۔ اُسے
چمپا سے دونی محبت ہو گئی۔ اُس نے چمپا کی خدمتوں کا وہ صلہ

دیا جو اُسے نہ دینا چاہیے تھا۔

چمپا کے سر میں درد رہنے لگا۔ اُس کا جی متلاتا۔ چکر آتا اور حرارت ہو جاتی۔ مگر کوٹھے بینے وہ ضرور جاتی۔ اب بھی وہ جمعدار کے پاس بیٹھ کر اپنی ہنسی سے اُسے بہلاتی۔ اُس کے تقاضوں کو وہ جھوٹے وعدوں اور مذاق میں اڑا دیتی۔ جمعدار کو اپنے کامیابی کا یقین تھا اُسے کامیابی بہت قریب نظر آ رہی تھی۔ اتنی قریب کے ہر وقت وہ اُسی کے خواب دیکھتا رہتا تھا مگر رقابت اور دنیا چمپا کو اس طرح کھل کر کھیلنے کی اجازت کیسے دیدیتی۔ انجن شیڈ میں کانا پھوسی شروع ہوئی۔ محلے میں پیشگوئیاں ہونے لگیں اور پنا کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ گئی۔ افواہ پھیلتی رہی اور پنا سنتا رہا۔ پہلے تو اُسے یقین نہ آیا۔ جب کوئی محلے والا اُس سے آکر کہتا۔

"پنا تیری بیوی نے تو محلے کو بدنام کر رکھا ہے۔ رستہ چلتوں کے گلے پڑتی پھرتی ہے" پنا کا چہرہ سُرخ ہو جاتا اور وہ اپنے لاٹھی سنبھالتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا اور کہتا "میری بیوی پر الجام لگاتا ہے اگر پھر ایسی بات مُنہ سے نکالے تو سر پھوڑ دوں گا"۔

ہفتوں اس قسم کی باتیں ہوتی رہیں اور پنا سنتا رہا۔ نہ معلوم کیوں اُس نے چمپا سے نہ پوچھا۔ شاید اُسے یقین نہ تھا۔ مگر اُسکے تیور ضرور بدلنے لگے تھے۔ چمپا سب کچھ دیکھ اور سُن رہی تھی۔ وہ بڑے غور سے پنا کے بدلتے ہوئے تیور دیکھ رہی تھی۔ مگر اس بھی پنا کو نہ چھیڑا۔ نہ معلوم کیوں .... دو چار دفعہ جمعدار کے پاس آیا اور پنا کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ آخر ایک دن اس نے جمعدار کو گالیاں دیکر بھگا دیا اور چمپا پر بھی لکڑیوں کی بارش ہوئی۔

چمپا کا حُسن اب گہنا رہا تھا۔ اس کی تندرستی خراب ہو چکی تھی۔ ایک چھپکلی کی سی رنگت اور مٹکے جیسے پیٹ والی چڑیل کو دیکھ کر جمعدار منہ نہ پھیر لیتا تو اور کیا کرتا۔ اس کا انتقامی جذبہ قابو میں باہر ہو چکا تھا۔ اُسے چمپا کی شکل سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ اسے بہت دھوکے دے چکی تھی اب وہ اس کے فریب میں آنیوالا نہ تھا۔ اب بھی وہ انجن شیڈ جاتی۔ صبح سات آٹھ بجے کوئی رات کو آٹھ نو بجے لوٹتی مگر خالی ہاتھ۔ اس کے پیر سن بجر کے ہو جاتے۔ سر پھٹنے لگتا اور وہ چور کی طرح گھر میں ڈرتے ہوئے گھستی۔ اُسے پنا کے گالیوں اور لمبی لاٹھی سے بہت ڈر لگتا تھا۔ پنا کو اب چمپا سے کوئی ہمدردی نہ تھی اُسے روٹی زیادہ عزیز تھی۔ گھر میں گھستے ہی وہ چمپا سے پوچھتا۔ کیا لائی؟ ...... چمپا مجرم کی طرح خاموش کانپنے لگتی۔ پنا پھر پوچھتا۔ اور جواب نہ پاکر گالیاں سنانے لگتا۔ حرامجادی ...... بدمعاش! آدھی آدھی رات تک باہر رہتی ہے ...... آپ تو یاروں کے ساتھ مال اُڑاتی ہے اور میں بھوکا مرتا ہوں ...... اسے چمپا کی حالت پر رحم بھی نہ آتا۔ اُسے روٹی کی ضرورت تھی اور چمپا پر یہ فرض تھا کہ اسے تینوں وقت روٹی دے ...... ورنہ پھر وہ اس سے پوچھنے لگتا "بتا یہ پیٹ کس کا ہے" چمپا سب کچھ سن سکتی تھی مگر یہ الزام اسے سنکھیا سے زیادہ کڑوا معلوم ہوتا تھا وہ اس سوال سے کانپ اٹھتی اور تڑپ کر کہتی "شرم نہیں آتی پوچھنے ...... تمھیں نہیں معلوم کس کا ہے؟"

پنا اپنی لاٹھی سنبھالتے ہوئے کہتا "بڑے شرمدار! مجھے سب معلوم ہے۔ میں خوب جانتا ہوں۔ ان طعنوں سے چمپا کے تن بدن میں آگ لگ جاتی اور وہ چوٹ کھائے ہوئے ناگن کی طرح تڑپ جاتی "کیا معلوم ہے تمھیں؟ ...... میرے اوپر الجام نہ لگاؤ ...... میری ہائے نہ لو ...... بھگوان سے ڈرو۔

پنا جواب میں گردن لٹکا کر کہتا "میں تیرے اوپر الجام لگاتا ہوں ...... اور یہ جو دنیا کہہ رہی ہے سو جھوٹ ہے" چمپا بلبلا کر کہتی ...... جب خود گھر کا آدمی کہے گا تو دنیا کیوں نہ اڑائے گی"۔

اس کے جواب میں چمپا پر دس پانچ لکڑیاں اور سو پچاس گالیوں کی بوچھار ہوتی۔ وہ بلبلا اٹھتی۔ چھگن بھی ماں کو روتے دیکھ کر بلکنے لگتا اور وہ اُسے کلیجے سے لگا کر کونے میں پڑ رہتی اور پنا چمپا اور جمعدار کو گالیاں دیتا رہتا۔

چھپا کی حالت اور بگڑ گئی اب اس سے چلا پھرا بھی نہ جاتا تھا اول تو وہ شیڈ جاتی ہی نہ تھی اور اگر جاتی بھی تو اسے پوچھتا کون تھا؟ پنا کو بھوک نے پاگل بنا دیا تھا۔ وہ اس کی محبت اور خدمت کو بالکل بھول گیا۔

اب وہ اس وقت لڑتا رہتا۔ اس کے طعنوں نے چھپا کا کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ بار بار وہ اس سے پوچھتا۔ "بتا یہ پیٹ کس کا ہے"۔ چھپا کے چہرے کی پیلاہٹ چند لمحوں کے لیے سرخی میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں اور وہ بے بس یہ کہہ کر چپ ہو جاتی "دیکھو میری ہائے نہ لو" یہ سب چھپن کا کام نہیں ...... پنا بات کاٹ کر کہتا۔ بڑے سر پھیر ...... تو تو سیتا ہی سیتا۔ جب ہی تو اس جمعدار کا......

چھپا دیوانہ وار چلا اٹھتی۔ وہ اس سے زیادہ سننا نہ چاہتی تھی۔ اس کا جی اپنا یا پنا کا گلا گھونٹنے کو چاہتا۔ مگر چھگن اس کے راستے میں حائل تھا۔

وہ قسمیں کھا کر اور کوس پیٹ کر اپنے دل کا بخار نکالتی۔ پیٹتی جاتی اور کوستی رہتی۔ پنا اسے بڑی بے دردی سے مارتا۔ اس کی حالت کا خیال بھی نہ کرتا۔ آخر اسے پنا سے نفرت ہو گئی وہ اس کی شکل سے بیزار تھی۔ اب وہ صرف چھگن کی خاطر یہ تکلیفیں جھیل رہی تھی۔ مگر روز روز کی ہائے ہائے کل کل اور مار پیٹ نے اسے زندگی سے بھی بیزار کر دیا۔ اب اسے موت اچھی معلوم ہوتی تھی۔ پر سکون اور پر امن۔

آخر ایک بار اس نے موت سے دو چار ہونے کی ٹھان ہی لی۔ چھگن اس کی چھاتی سے لگا سو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے علیحدہ کیا اور چپ چاپ گھر سے نکل گئی۔ رات کی بھیانک خاموشی میں پاس ہی بھنگیوں کے کنویں سے ایک دھماکا اٹھا اور چند منٹ بعد فضا میں تحلیل ہو گیا۔

دن بھر محلے اور انجن شیڈ میں چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ ہر زبان پر یہی الفاظ تھے "چھپا بھاگ گئی" مگر اب بھی کسی زبان سے یہ فقرہ نکل جاتا تھا "ایسی تو نہ تھی وہ"

دوسرے دن بڑھا مستری انجن شیڈ پر دوڑا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ہمارے کنویں میں ایک لاش پڑی ہے۔ لاش نکالی انجن شیڈ کے قلی اور محلے والے چھپا کی لاش کے اردگرد کھڑے تھے پنا بھی سر جھکائے اس کی لاش سے لگا بیٹھا تھا لیکن اس کی آنکھیں برساتی ندی کی طرح خشک بالکل تھیں۔ جمعدار پنا کو دیکھتا رہا اور چلتے ہوئے بولا۔ کیا سوچ رہا ہے پنا۔ چھپا تھی سرم دار اور سر پھیر ...... تجھ ذلیل پیٹ کے کتے نے اسے مار ڈالا ...... جان پہ کھیل گئی ...... پر نہ دی۔

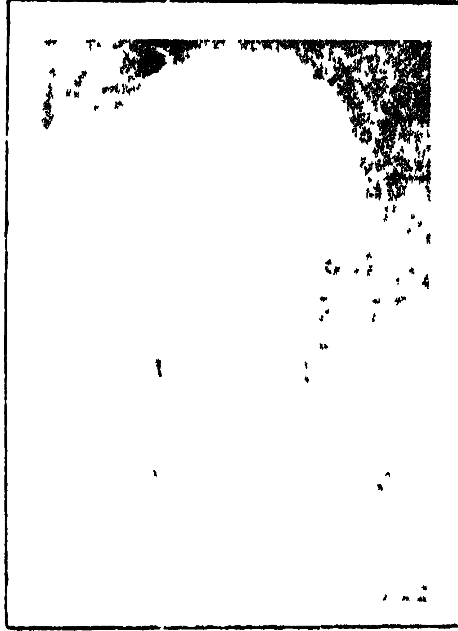
جمعدار کی آواز کے ساتھ مجمع میں سے بھی یہی صدا اٹھی۔ آج دنیا پر چھپا کی حقیقت کھل گئی۔ پنا کو ایسا معلوم ہوا گویا سر بھی ٹوٹ پڑی ہو۔ مجمع کی صدا اس کے کانوں میں گونج رہی تھی اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔

رباعی

برسات گئی تو فصل سرما آئی
بادامن ترنسیم دریا آئی
اللہ ری سرد مہری وادی نجدا
پردے میں چھپ کے لیلی آئی

رباعی

دل سرد ہے جا بادۂ عنابی لا
سوئے لیلیٰ حسین مہتابی لا
دس بجنے کو آئے نیند کا نام نہیں
اے اول شب لباس شب خوابی لا



علی محمد

مقالات

Khaleel

ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن

علی
محمد
مقالات



ادارۂ
اشاعت اُردو
حیدرآباد (دکن)

ماہنامہ
پیام ادب

ادارۂ تحریر

سید عبدالوہاب

(چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری

ادارۂ اشاعت اردو
عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

قاید ملّت علیہ الرّحمتہ

پیام ادب کا یہ شمارہ تیار ہو چکا تھا اور صرف اشاعت کی دیر تھی کہ فضا قاید ملّت نواب بہادر یار جنگ کی وفات کی خبر سے گونج اُٹھی۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے دل کے آبلے پھوٹ کر نہ بہہ رہے ہوں۔ کوئی دل ایسا نہ تھا۔ جس میں اس خبر سے آگ سی لگ نہ گئی ہو۔

اتنا مایوس کن اور کتنا حسرت ناک ہوتا ہے وہ منظر جب کہ انسانی عزائم کی سر بفلک عمارت فضاء ربانی کے ادنیٰ اشارہ سے ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے اور کتنا دردناک ہوتا ہے وہ سماں جب تمناؤں کا پورا سیلاب خالق کائنات کی مشیّت کے مقابلہ میں سراب بن جاتا ہے۔ یہ دل کے بہلانے کی باتیں ہیں۔ کہ چارہ سازی اور علاج معالجہ کچھ کام دے سکتا تھا۔ جہاں چارہ سازیوں کے مواقع ملے۔ وہاں انسانوں کے بنائے کیا بن سکا اور یہاں تو ملّت اسلامیہ کا محبوب قاید صرف دو منٹ میں عالم امکان سے عالم بقا میں جاگزیں ہو گیا۔

ایک مخلص دوست کے ہاں دعوت تھی۔ دستر خوان ابھی چنا نہ گیا تھا۔ کہ حقہ کی دو کش لیتے ہوئے قاید ملّت کو ٹھسکا لگا سانس رکی اور رضوان نے آواز دی کہ جنّت کے بھولے ہوئے مسافر اپنے گھر آجاؤ۔ ڈاکٹر دوڑے چارہ گری اور چارہ سازی کی فکر کی گئی۔ لیکن جس کے لئے فکر کی گئی تھی وہ اس فکر سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

تا مژہ برہم زنیم از ماہ و پروین در گذشت

قاید ملّت اُمت اسلامیہ کے مخلص خادم خدا تجھے اپنی رحمت میں جگہ دے۔ ہم سب کی طرف سے جزاءِ خیر عطا فرمائے۔ جا آرام کر وہاں جہاں کوئی دکھ نہیں۔ چین سے رہ اُس جگہ جہاں چین و سکون تیرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم تیری یاد میں مدتوں روتے رہیں گے۔ اور تجھے کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ دکن

میں نہیں سارے ہندوستان کی زمین کو تیری شعلہ نوائیوں نے سالہا سال تک پرشور رکھا۔ ہم نے اپنے برف جیسے سینوں میں تیرے سینہ کی حرارت سے حرارت لی۔ ہم اِس حرارت کو جان سے زیادہ عزیز رکھیں گے پرجوش خطیب تیری آواز فضا میں گونجتی رہیگی۔ آسمان و زمین کا چکر اُسے مٹا نہیں سکتا۔ ادب کی محفل میں، سیاست کے میدان اور انسانی ہمدردی کے ہر موقع پر تیری سیرت و کردار ہمارے لیئے ہمیشہ نمونہ رہے گا۔ تو نے پچاسوں ادبی ادارے پیدا کئے اور سینکڑوں کو علم و ادب کا ذوق دلایا۔ تیری زندگی کا ہر لمحہ تیری دولت کا ہر پیسہ خادمان علم و ادب اور خدمت گزاران ملت کے لئے وقف تھا۔ آج ہم تیری قبر پر عقیدت کے دو آنسوؤں کے سوا کیا پیش کر سکتے ہیں اور تو اُس سے بھی بے نیاز ہے۔ تو خدا کا ہوگیا اور خدا تیرا ہو جائے۔ ہم قیامت کے میدان میں تیرے خلوص تیرے ایثار تیرے جذبۂ ہمدردی اور غربا پروری کی شہادت دینگے اور خدا خود شاہد ہے۔

ادارہ

بہادر یار جنگ نمبر

قائد ملت ——— بہادر یار جنگ کی ذات نہ صرف میدان سیاست میں عدیم المثال تھی بلکہ وہ سب سے اچھا مقرر بھی تھا اور ناقد و ادیب بھی۔ پیام ادب کا جولائی و اگست نمبر اس بطل عظیم کی یادگار میں شایع ہوگا اور بہادر یار جنگ نمبر کے نام موسوم ہوگا۔ ہندوستان کے تمام مشاہیر کو ادارہ کی طرف سے دعوت نامے بھیجے گئے ہیں کہ وہ قائد ملت علیہ الرحمتہ سے اپنی کسی ملاقات کا واقعہ بیان کریں اور اپنے تاثرات قلمبند فرماویں ——— یہ تمام پیامات اِس نمبر میں شایع کئے جائیں گے۔ اِس کی ترتیب مولوی سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی فرمائیں گے۔

ادارہ

جون سنہ ۱۹۴۴ء | رجسٹرڈ آصفیہ نمبر ۱۹۸ | جلد (۲۱) نمبر (۴)

مندرجات

چندہ سالانہ چھ روپے کلدار | فی پرچہ آٹھ آنہ کلدار

نظرات

محمد اقبال سلیم گاہندری

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے ۔۔ شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

سرزمین دکن کو بقول بعض اُردو کے ابتدائی گہوارہ ہونے کا جہاں فخر حاصل ہے وہاں اُسے یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اُردو زبان کی پہلی جامعہ یہیں قایم ہوئی، اور اُردو میں اعلیٰ تعلیم کا کامیاب تجربہ یہیں ہوا، اِس طرح اُردو زبان کو دنیا کی دیگر علمی زبانوں کے ہمپایہ بنانیکا کام انجام پایا ہے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی مسیحائی نے اُردو کو جو بے یار و مددگار ہوکر مُردہ ہو رہی تھی نہ صرف زندہ کر دیا بلکہ وہ توانائی بخشی کہ یہ زبان اَب رہتی دنیا تک ہر تھپیڑے کا مقابلہ کر سکتی ہے، ہر صاحب دِل اور صاحب نظر کی زبان سے بے ساختہ یہ دعا نکلتی ہے کہ

چون مسیحا زندہ کردی علم و فن را در دکن
زندہ باد اے حضرت عثمان علی خاں زندہ باد

انجمن ترقی اُردو جسے علی گڑھ کی علمی تحریکوں نے وجود بخشا تھا دکن ہی میں پلی اور پل کر جوان ہوئی اب جبکہ جزیرہ نمائے ہند کے مرکز دہلی میں منتقل ہو کر انجمن اپنا کام انجام دے رہی ہے۔ ضرورت تھی کہ دکن میں اُس کی جانشینی کے لئے کوئی منظم اور کارکرد ادارہ وجود میں آئے یہ احساس جامعہ عثمانیہ کے فرزندوں میں پیدا ہوا، اور شدت سے پیدا ہوا، اور ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زورؔ اور اُن کے ساتھیوں کی محنت، خلوص اور جذبۂ خدمت نے ادارۂ ادبیات اُردو کی بنیاد رکھی اس ادارہ نے اِس کمی کو پوری طرح پورا کر دیا جو انجمن ترقی اُردو کے دکن سے دہلی منتقل ہو جانے سے پیدا ہو گئی تھی۔

اِدارۂ اَدبیات اُردو جوان ہمیشہ تیز گام ہوتا ہے، یہ ادارہ بڑی تیزی سے ترقی کر رہا ہے اُس نے اُردو اِمتحانات کا سلسلہ شروع کیا، اور اَب یہ سلسلہ ممالک محروسہ کے علاوہ جزیرۂ نمائے ہند کے دوسرے علاقوں میں مقبول ہو رہا ہے، یہ معلوم کر کے ناظرین پیام اَدب کو یقیناً مسرت ہوگی اُردو عالم اور اُردو فاضل وغیرہ اِمتحانات اب صوبہ جات سی، پی و بمبئی میں رائج ہو رہے ہیں۔

اُردو کانگریس ماہ جولائی میں اِدارۂ اَدبیات اُردو کی دعوت پر ایک اُردو کانگریس حیدرآباد میں منعقد ہو رہی ہے اَب تک کارکنان اُردو کا کوئی اِتنا بڑا اجتماع نہیں ہوا ہے۔ ضرورت تھی کہ تمام کارکنان اُردو اور مصنفین و مدیرین کسی ایک جگہ پر جمع ہو کر اُردو زبان کی آئندہ ترقی کے لئے لائحہ عمل تجویز کریں۔

اِدارۂ اَدبیات اُردو نے اِس سلسلہ میں جو ابتدائی گشتی مراسلہ جاری کیا ہے اس میں لکھا ہے:

"ضرورت ہے کہ ہماری زبان اور اَدب کے استحکام اور اس پر سنجیدہ نقاط نظر سے غور کرنے کے لئے ایک ایسی کل ہند کانگریس کی داغ بیل ڈالی جائے جو خاص قواعد و ضوابط کے تحت ہر دو سال میں ایک بار کسی نہ کسی مقام پر منعقد ہوتی رہے، چنانچہ مختلف اَرباب اُردو کے مشورہ اور کافی غور و خوص کے بعد اِدارۂ اَدبیات اُردو کی مجلس اِنتظامی نے اِس کل ہند تنظیم کے لئے قواعد و ضوابط بھی مرتب کئے ہیں۔ جو اس کانگریس میں باضابطہ طور پر منظور کئے جائیں گے۔ کانگریس کی اس پہلی میقات حیدرآباد میں اُردو کے مشہور اَدیب، نقاد، اور پروفیسر اُردو زبان اور اَدب سے متعلق مفید اور اعلیٰ مقالے پڑھنے کے علاوہ بعض ضروری مسائل پر تبادلۂ خیال کریں گے۔ نیز کئی جلدوں میں ایک مبسوط تاریخ اَدب اُردو مرتب کرنیکا تصفیہ اور اُس کے مختلف ادوار کے کام کی تقسیم بھی اس کانگریس میں کیا جائیگا"۔

ہماری رائے میں اِس کانگریس کا اِنعقاد اور ایک ایسے کل ہند اِدارے کی تنظیم زبان کے لئے فال نیک ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اِس طرح زبان کی ٹھوس خدمت ہو سکے گی۔

ادارہ

نقد و نظر

زنداں

مصنف یوسف ظفر، ناشر اردو بک اسٹال لاہور، حجم ۱۴۴ صفحات مجلد قیمت عہ

اِس کتاب کو ہم نے دیکھا اور بار بار دیکھا، پڑھا اور تین مرتبہ پڑھا، لیکن ہر مرتبہ ہماری حیرت اور استعجاب بڑھتے رہے، ناشر کی خوش مذاقی اور حوصلہ مندی پر اور مُصنف کی بد مذاقی اور تنگ خیالی پر۔ جنگ کا یہ ہولناک زمانہ کاغذ نایاب، سامان طباعت کمیاب، کسی کتاب کا اچھے ناک نقشہ سے دُرست اور نوک پلک سے آراستہ کر کے شایع کرنا جوئے شیر کے برابر ہے اور جناب ظہیرالدین صاحب کا کمال دیکھئے کہ $\frac{20 \times 26}{16}$ کی ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب عمدہ ہی نہیں بلکہ نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین کتابت و طباعت نفیس مکمل پارچہ کی جلد، ڈائی، اور رنگین گرد پوش سے آراستہ کر کے شایع کر دیتے ہیں۔ خوش مذاقی اور حوصلہ مندی کی بہترین مثال ہے۔

آب ذرا مصنف کی بدمذاقی اور تنگ خیالی ملاحظہ فرمایئے، آپ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ نے اپنا یہ دیوان شایع کر کے ہم سب تشنگان بادۂ ادب کو بے دام خرید لیا۔ حالانکہ اُردو و ادب پر اُن کا احسان ہوتا اگر آپ اپنا کلام شایع نہ فرماتے، اور اس قدر نفیس کاغذ اور ایسی اچھی جلد کسی معقول و مفید کتاب کے لئے رہ جاتی۔

زنداں جناب یوسف ظفر صاحب کی ۵۳ مختصر نظموں کا مجموعہ ہے۔ ابتدا میں اپنے محرکات شاعری پر یوسف صاحب نے آٹھ صفحات میں بحث کی ہے، اور اپنی زندگی کے بعض واقعات کو اچھے پیرایۂ میں بیان کیا ہے ظفر صاحب نثر بُری نہیں لکھتے، یہ مقدمہ اچھا خاصا ہے اور اِن نظموں کے ساتھ اس کا جوڑ کچھ بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے۔

اِس پورے دیوان میں کوئی نظم نہیں جس میں سے تاویل و تفسیر کے ذریعہ بھی کوئی معنی اور کوئی شعریت پیدا کی جا سکے۔ جہاں یہ نظمیں "بلینک ورس" ہیں وہاں "بلینک ورڈس" بھی ہیں، یا شاید جناب ظفر نے ارادۃً صنعت اہمال میں شاعری کی ہے۔ بعض بعض مصرعے اور کہیں کہیں کوئی بند معنی دار ہو گیا ہے جس کی تلافی دوسرے بند میں کر دی گئی ہے اور نہایت کامیابی کے ساتھ کی گئی ہے۔

ہندوستان ہمارا

مصنفہ سری رام شرما ایم۔ اے حجم $\frac{20 \times 30}{16}$ ۲۶ صفحات قیمت ۴ر ہندوستانی پبلیشرز دہلی۔

یہ چھوٹا سا رسالہ سری رام شرما صاحب نے ہندوستان کی مدح میں لکھا ہے۔ نثر میں مدحیہ مضمون ہے اور اچھا خاصا مضمون ہے، مضمون کا مقصد انگریزی حکومت سے نفرت اور مادر وطن کی پرستش کا ذوق پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے۔

۱۰۔ ۱۹۴۳ء کی معیاری غزلیں اور نظمیں

۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۰۰ ۱صفحات قیمت ایک روپیہ۔ ہندوستانی پبلشرز دھلی۔

علم و ادب کی اور شاخوں میں اُردو کو اور جتنا بھی تہی مایہ کہا جائے لیکن ماشاء اللہ شعر و شاعری میں اُردو کا مقابلہ دنیا کی کوئی اور زبان شاید نہ کر سکے گی، ہمارے ہاں شاعر برساتی کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، اور اتنے پیدا ہوتے ہیں کہ محکمۂ مردم شماری بھی اُن کے اعداد پیش کرنے سے قاصر ہے، شہر تو شہر ہے کوئی قصبہ بلکہ کوئی گاؤں نہیں جہاں نصف درجن شاعر نہ موجود ہوں رسالوں اور اخبارات میں آئے دن طرح طرح کی جدید و قدیم رنگ میں ڈوبی ہوئی نظمیں اور غزلیں دکھائی دیتی ہیں۔ کارکنان ادارۂ ہندوستانی پبلشرز دھلی نے ۱۹۴۳ء کی اچھی غزلوں اور نظموں کا انتخاب کرکے یہ مجموعہ شایع کیا ہے۔ اس سے پہلے ۱۹۴۲ء میں بھی اس ادارہ نے ایک ایسا ہی مجموعہ پیش کیا تھا لیکن اس میں صرف غزلوں کا انتخاب تھا، اس سال نظموں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ انتخاب اچھا ہے۔

سماج کے ستون

مترجمہ قیسی رام پوری۔ کتابستان بمبئی حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۸۰ صفحات۔ قیمت ۱۲؍

یہ چار ایکٹ کا مختصر دلچسپ ڈرامہ ہنرک ابسن کے ڈرامہ پلر آف سوسائٹی کا ترجمہ ہے۔ جناب قیسی رامپوری نے بڑے کامیاب انداز میں اس ڈرامہ کو ہندوستانی بنایا ہے۔ اب یہ ڈرامہ بالکل طبعزاد بن گیا ہے اور اگر علمی دیانتداری سے قیسی صاحب یہ نہ لکھ دیتے کہ یہ ترجمہ ہے تو حضرت نیاز فتحپوری کی طرح ناواقفوں کو آسانی سے یقین دلایا جا سکتا تھا کہ یہ ڈرامہ آن کا طبعزاد ہے۔ قیسی صاحب ایک پختہ لکھنے والے ہیں اور یہ پختگی اس ترجمہ میں بھی ظاہر ہے۔

زرینہ

مترجمہ عبدالعزیز سُورتی حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۴۸۱ صفحات۔ قیمت ۱۲؍ کتابستان بمبئی۔

یہ مشہور انگریزی ناول کا ترجمہ ہے، مولوی عبدالعزیز سورتی نے اسے ترجمہ کرنے میں اُردو زبان کی دلربا نزاکتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ کہیں پر زبان معیار سے نہیں گرتی اور ترجمہ کی یہی کامیابی ہے۔ ناول کا پلاٹ نہایت دلچسپ اور بڑا سبق آموز ہے، اس میں رنگ و نسل کی پرستش کرنے والے عیسائی مبلغین کی ذہنی کیفیت کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔

سہارا

مصنفہ شفیق بانو صاحبہ شفیق مدیرہ خاتون مشرق دھلی حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۴۴ صفحات قیمت ایکروپیہ۔ ناشر دفتر رسالہ خاتون مشرق اُردو بازار جامع مسجد دہلی

یہ چھوٹی سی کتاب جناب شفیق صاحبہ کے اکیس مختصر رومانی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانوں کے پلاٹ دلچسپ اور زبان نہایت صاف و سلیس ہے، ہر سطر سے لکھنے والی کی پختگی ظاہر ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات جو ان افسانوں کو دلچسپ اور گوارا بناتی ہے وہ ان کے پلاٹ کا ممکن اور فطری ہونا ہے، کہیں آسمان کے تارے توڑ لانا اور زمین کی گہرائیوں سے جواہر پارے نکالنے کی دور از ذہن و دماغ کوشش نہیں کی گئی ہے۔

گناہ کا خوف

مولفہ محمد علی ردولوی، حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۴۹ صفحات قیمت۔ ۴؍

یہ تیرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افسانوں کا پلاٹ روزمرہ کے واقعات سے لیا گیا ہے اور دلچسپ ہے۔ آخر کے افسانوں میں جہاں "اما من ہنری کے فلسفیانہ خیالات" بیان کئے گئے ہیں خاصی دلچسپی اور افادیت پیدا ہو گئی ہے، زبان نہایت اچھی اور محاورات صحیح استعمال ہوئے ہیں۔

اُجرتی محنت اور مزدور

مترجمہ عابد علی خاں بی۔ اے
حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۴۰ صفحات

ناشر اشاعت گھر حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲ ار

کارل مارکس نے اپنے معاشی نظریہ کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بہت سے مضامین لکھے تھے، ان مضامین میں سے اُجرت اور مزدور سے متعلق مضامین کو اس کے پیرؤں نے کتابی شکل میں کردیا ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب ان مضامین کا ترجمہ ہے جو اشاعت گھر سے اِشتراکی پروپیگنڈے کے سلسلہ میں شایع کیا گیا ہے۔ آخر میں انگریزی اُردو اِصطلاحات کی فہرست بھی چار صفحوں میں دی گئی ہے۔ کارل مارکس کی تحریر نہایت گنجلک اور حد درجہ متضاد بیانی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مترجم مبارکباد کے قابل ہیں کہ اُنھوں نے اس کا بڑی حد تک صاف ترجمہ کیا ہے۔ کتاب کا مضمون معلومات آفریں ہے۔

شرارے

مصنفہ خورشید احمد جامی حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۱۰۰ صفحات ناشر خود مصنف

قیمت کہیں مرقوم نہیں

یہ نوجوان شاعر جامی کی ان نظموں کا مجموعہ ہے جو اُنھوں نے فسطائیت کے خلاف اور موجودہ جنگ میں تعاون کرنے کی ترغیب کے طور پر لکھی ہیں۔ جامی صاحب میں شاعری کا مادہ پایا جاتا ہے، کسی قدر محنت و مطالعہ کی ضرورت ہے اشعار میں عروض اور زبان کے بعض سخت عیوب باقی رہ گئے ہیں۔ اگر توجہ کے ساتھ نظرِ ثانی کرلی جاتی تو یہ مجموعہ بڑا خوشگوار مجموعہ ہوجاتا ہے۔

حسرت مُوہانی

مصنفہ عبد الشکور ایم۔ اے علیگ۔ پرنسپل حلیم کالج کانپور،
حجم ۲۰×۳۰/۱۶ ۲۰۰ صفحات مجلد قیمت ۔ عا۔
ناشر شاہ اینڈ کمپنی۔ حکیم وصی روڈ آگرہ۔

مولانا حسرت مُوہانی ہماری قوم کے وہ بزرگ ہیں جن پر سیاست و ادب دونوں کو ناز ہے۔ اگر بارگاہ سیاست میں حق گوئی اور صداقت شعاری کو بار مل سکتی ہے تو حسرت کا کوئی جواب نہیں جو کہا اس میں حق گوئی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور جو کہا اس میں صداقت شعاری کا دامن نہ چھوٹا۔ اَدب میں نظم و نثر دونوں میدان حسرت کے ہاتھ میں ہیں خصوصاً غزل گوئی میں تو اپنی آپ نظیر ہیں اَب تک حسرت کی شاعری اور اُن کے سوانح پر چھوٹی بڑی کئی کتابیں تالیف کی جاچکی ہیں، زیر نظر کتاب ان میں کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔ جناب عبد الشکور صاحب ایم، اِے نے جو اس کے علاوہ اور کئی مفید و گران قدر کتابوں کے مصنف ہیں اس کتاب کو بڑی محنت کے ساتھ اور نہایت سُلجھے ہوئے ذوق کے ماتحت تالیف کیا ہے انداز بیان دلکش ہے۔ اور تنقید و تبصرہ نہایت مفید انداز میں کیا گیا ہے۔ حسرت کے مضامین سخن، جذبات واردات جوش اور اُن کی جدت و رفعت تخیل پر معلومات افزا روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم ہر صاحب ذوق سے اِس کتاب کے مطالعہ کی سفارش کرتے ہیں۔

رسالہ آوازِ نسواں

مدیرہ صدیقہ بیگم صاحبہ سیوہاروی
قیمت سالانہ چار روپیہ۔

دفتر آوازِ نسواں لال کنواں دہلی۔

یہ رسالہ غالباً ۱۵ سال سے ماہوار نکل رہا ہے۔ اس وقت جلد ۱۵ کا نمبر ۴ بابتہ ماہ مئی ۱۹۴۲ء ہمارے سامنے ہے۔ ملک میں زنانہ رسائل بہت تھوڑے ہیں یہ رسالہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ جناب صدیقہ بیگم صاحبہ اچھا اَدبی و علمی ذوق رکھتی ہیں۔ رسالہ غور و توجہ کے ساتھ مرتب کیا جاتا ہے۔ مضامین کا معیار بھی خاصا بلند ہے ہمیں اُمید ہے ہماری بہنیں اِس رسالہ کی اشاعت کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرکے اسے مفید تر بننے کا موقع دیں گی۔

سالنامہ نیرنگِ خیال ۱۹۴۴ء اُردو زبان کے مشہور رسالہ نیرنگ خیال نے حسبِ معمول اِسال بھی اپنا سالنامہ بڑے آن بان اور بڑے طمطراق سے نکالا ہے۔ سائز کی اُجنبیت سے جو غالباً کاغذ کی کمیابی کا نتیجہ ہے۔ نظر انداز کر لی جائے یہ سالنامہ ظاہری و معنوی خوبیوں کے اعتبار اپنی دیرینہ روایات اور شان و شکوہ کا مالک ہے۔ جن حضرات کے مضامین سالنامہ کی زینت ہیں اُن میں مولانا عبد الماجد دریا بادی، جناب عبد المجید صاحب سالک، سلطان حید رجوش اور حامد اللہ اُفسر جیسے کہنہ مشق اربابِ قلم بھی ہیں۔

غزل

حسرت موہانی

(۱) عارفانہ

ہر دِل میں ہے خواہش تری ہر سر میں ہے سودا ترا
معذور ہے تابِ نظر، مجبور ہیں اہلِ بصر
ہر ہر اشارت نازنیں، ہر ہر کنایت دِلنشیں
تیری جفا بھی ہے وفا، منظورِ اربابِ صفا
محبوبِ ہر قلب و جگر، مطلوبِ ہر جن و بشر
جو حسن دیکھا بے اماں، اس کو بھی ہم سمجھے کہ ہاں
گمنتی رہی تری خودی، اے خاکسارِ عاشقی
رہتا ہی ڈر ہر دم یہی، یہ گریۂ بیچارگی

آئینہ دارِ عشق ہی خود حسن بے ہمتا ترا
مستورِ حق ہے سر بسر اے نورِ جاں جلوا ترا
اے حسنِ یارِ مہ جبیں، ہر نقش ہے زیبا ترا
یعنی بفتوائے رضا جائز نہیں شکوا ترا
ہی نور بخش ہر نظر اِک جلوۂ یکتا ترا
اے دلربائے دِلبراں اِک نقش ہے گویا ترا
یہ بات بھی اچھی رہی، بڑھتا رہا درجا ترا
کر دے نہ رازِ عاشقی، اے دل کہیں افشا ترا

ہر لحظہ تیری آرزو ہر دم ہی تیری جستجو
حسرت بھی ہی اے ماہرو مدت سے دیوانا ترا

(۲) عاشقانہ

ابتک ہی یاد اے تند خو مقتل میں وہ آنا ترا
دِل عاشقوں کے لے لئے پہلے تو کس کس ناز سے
وہ سر جھکا دینا میرا وہ حکم فرمانا ترا
اب اے پری کیا قہر ہے صورت دِکھلانا ترا
اس شوخ کا شکوا کیا حسرت یہ تو نے کیا کیا
اِس سے تو اے مردِ خدا، بہتر تھا مرجانا ترا

بلند پایہ علمی ادبی کتابوں کا مرکز عظیم

حیدر آباد کے مشہور ناشرین و مصنفین کی کتابیں نیز ہر وہ کتاب جو آپ کو مجبوب ہو واجبی نرخوں پر ہم سے طلب فرمائیں۔
چند مشہور قابل مطالعہ کتابوں کے نام ملاحظہ ہوں :۔

جنگ زدہ ممالک	عا۸ر	سویٹ روس	سے
جنگ اور روپیہ	۱۲ر	دین و دانش	صہ
جنگ اور اغذیہ	۱۵ر	دین و آئیں	صہ
جنگ اور مالیہ	۱۲ر	دیو داس	عا۳ر
جنگ اور راتب بندی	عہ	پنڈت جی	عا۸ر
اشتراکی روس	۶ر	بڑی ویدی	عا۳ر
تنظیم مابعد جنگ	۶ر	شیخ جی	عا۳ر
مشاہیر کے روماں	عا۸ر	قدرت کے کھیل	عہ۱۲ر

خوش انجام ۱۰ر

انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدر آباد (دکن)

ہماری تازہ ترین مطبوعات

۱۔ **ہمارے ہندستانی مسلمان**۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر آئی سی۔ ایس، ایل ایل ڈی کی مشہور و نایاب کتاب **Our Indian Musalmans** کا اردو ترجمہ "ہمارے ہندستانی مسلمان" کے نام سے شایع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ہنٹر نے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک وہ پہلو نمایاں کیا ہے جسے منظرِ عام پر لانے کی جراءت فی زمانہ کوئی مسلمان نہ کر سکتا تھا۔ اس کتاب میں آپ دیکھیں گے کہ سید احمد شہید نے کس طرح مسلمانوں کو مخالف قوتوں کے خلاف منظم کیا اور "مجاہدینِ سرحد" کی جماعت نے کس طرح مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ مسلمان ملازمین اپنے غیر مسلم آقاؤں سے یہ کہتے سُنے گئے کہ "صاحب! ہمیں اپنے مذہبی فریضہ جہاد کی ادائیگی کے لئے ایک ماہ کی رخصت دیجئے" "زندہ رہے تو حاضر ہو جائیں گے ورنہ خیر"۔ بہرحال کتاب نہایت دلچسپ اور جراءت آموز ہے۔

پہلا اڈیشن ختم ہونے والا ہے ——— **قیمت**:۔ دو روپیے بارہ آنے

۲۔ **شرح اسرارِ خودی**۔ علامہ اقبال کے فلسفہ "خودی" کی بنیادی کتاب مثنوی اسرارِ خودی کی یہ آسان ترین اور دلچسپ شرح پروفیسر محمد یوسف خاں سلیم چشتی نے لکھی ہے۔ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اب دوسرا اڈیشن بہت سے اضافہ اور ترمیم کے ساتھ نہایت آب و تاب سے شایع ہوا ہے **قیمت**۔ ایک روپیہ آٹھ آنے

۳۔ **اقبال کا تصورِ زمان و مکان**۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی نے یہ کتاب لکھ کر ایک بڑے علمی نکتہ کو حل کر دیا ہے۔ ——— **قیمت**:۔ دس آنے

۴۔ **اقبال کے چند جواہر ریزے**۔ علامہ اقبال کی صحبت میں رہ کر پروفیسر خواجہ عبد الحمید صاحب ایم۔ اے نے جو ملفوظات قلمبند کئے تھے یہ کتاب اُن کا مجموعہ ہے اور پڑھنے کے لائق ہے۔ ——— **قیمت**:۔ دس آنے

۵۔ **موت و حیات اقبال کے کلام میں**۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کا یہ روح پرور اور حیات آفریں مقالہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔
قیمت:۔ چار آنے

نوٹ:۔ دیگر کتابوں کی فہرست طلب فرمائیے۔ نہایت مفید علمی ادبی سیاسی اور اصلاحی کتابیں ہمارے ہاں سے طبع ہو رہی ہیں۔

مینجر اقبال اکیڈیمی۔ ظفر منزل تاج پورہ لاہور

اویس احمد ادیب
ایم اے

جدید اُردو صحافت

یوں تو ہر زمانے کی آئینی جمہوریت میں صحافت کو ممتاز درجہ دیا گیا ہے مگر موجودہ جنگ کی وجہ سے اخبار نویسی کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ صحافت دراصل اطلاعاتِ عامہ کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ جمہور کو اپنی سوسائٹی کے نہ صرف اہم اور ضروری واقعات اخبارات اور رسائل کے ذریعہ سے معلوم ہوتے رہتے ہیں بلکہ گورنمنٹ کے طرزِ حکومت کا صحیح اندازہ بھی رہنے کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ عوام اگر اپنی روزانہ زندگی کے کسی اہم پہلو پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو علمبردارانِ صحافت اُن کی صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔ اُن کی اضطرابی کیفیت کی صحیح حالت حکومت کے روبرو پیش کرنا اُن کا اخلاقی فرض ہوتا ہے عوام کو حکومت کی طرف سے جو تکلیف پہنچتی ہے اُس کو دُور کرنا اُن کی زندگی کا مقصد اصلی ہوتا ہے سماج اور سوسائٹی کی اصلاح کرنا اُن کے فرائض میں داخل ہوتا ہے وہ اپنے سماج کی اصلاح کرتے ہیں۔ اس کی کمزوریوں کو اُجاگر کر کے اُن پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر کسی ملک یا قوم کے اخبارات و رسائل اُن فرائض کی تکمیل میں کوتاہی کرتے ہیں تو اُن کی وقعت کاغذی چیتھڑوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایسے صحافتی "پیٹ کے کتے" کہے جا سکتے ہیں کیونکہ نہ تو حکومت ہی اُن کو عزت کی نظروں سے دیکھتی ہے اور نہ عوام ہی ان کو قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔

مگر کسی ملک کی دنیائے صحافت پر کوئی نادر شاہی فیصلہ کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم اِس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اس ملک کی حکومت نے وہاں کی "دُنیائے صحافت" کو آئینِ حکومت پر نکتہ چینی کرنے اور رائے دینے کے کتنے اختیارات دیئے ہیں یا قانون کی آہنی اور مضبوط زنجیروں سے اُن کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ منہ میں زبان رکھتے ہوئے گونگے بن جائیں اُن کی کسی طرح حق تلفی کی جائے مگر وہ اپنی زبان کو حرکت نہیں دے سکتے۔ اُن کو خواہ کتنا ہی زدوکوب کیا جائے مگر آہ وزاری کی اجازت نہیں ہوتی۔ میرا مقصد آزادیٔ خیال اور آزادیٔ اظہارِ خیال سے ہے۔ اگر یہ دونوں طرح کی آزادیاں کسی ملک یا قوم کی صحافت کو نصیب ہیں تو اُن کے مذکورہ بالا مقاصد کی تکمیل انتہائی آسانی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ اس آزادی کا صحیح استعمال کس حد تک کرتے ہیں۔ "آزادی" انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے مگر جب اُس کو یہ حق مل جاتا ہے تو وہ ایسی ایسی بدعنوانیاں کرتا ہے جو حکومت پر یہ واضح کر دیتی ہیں کہ وہ اُس کا اہل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت بھی اس سے یہ حق چھین لیتی ہے۔ یہ حرکتیں ہمیشہ شعوری طور پر نہیں ہوتیں بلکہ یہ اُس سے غیر شعوری طور پر سرزد ہو جاتی ہیں پھر بھی اکثر مواقع ایسے آتے ہیں کہ وہ دیدہ و دانستہ کسی مسئلہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بھی اُس پر زبردست نکتہ چینیاں کرتا ہے اور اپنی آزادی سے بیجا فائدہ اُٹھا کر طرح طرح کے روڑے اٹکاتا ہے۔ دُنیائے صحافت کے ہر فرد کے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی مسئلہ کی طرف صحیح تنقیدی

قدم اُٹھانے کے لئے اُسے معلوم کرنے، پڑھنے، سوچنے، غور کرنے اور اُس کے متعلق بولنے کی آزادی نصیب ہو۔ اگر یہ آزادی اُسے نصیب ہے تو یہ انتہائی بلند پایہ ہوگی کیونکہ زبان بندی کے بعد کوئی خیال اور کوئی صحیح سے صحیح تنقید بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔

اِس آزادی کو اگر کسی شخصی حکومت یا ڈکٹیٹری طرزِ حکومت میں تلاش کیا جائے تو مایوسی کا منھ دیکھنا پڑیگا وہاں کی دُنیائے صحافت کو آزادی خیال اور آزادیٔ تحریر سے بالکل محروم کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہہ لیجئے کہ اُن کا یہ فطری حق اُن سے چھین لیا جاتا ہے۔ اُنھیں اِتنا بھی حق نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے ملک کے کسی اہم مسئلہ کے متعلق اپنی رائے پیش کر سکیں جمہور کو بھی تنقید کرنے کی اِجازت نہیں دی جاتی بعض بعض ممالک میں تو اِس قدر پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں کہ عوام کسی ملکی اور قومی معاملہ میں اپنی رائے بھی نہیں دے سکتے۔ وہ دراصل ان قیدیوں کے مانند اپنی زندگی بسر کرتے ہیں جو جیل کی چہار دیواری کے اندر اپنے احکام کی مرضی کے مطابق چلتے پھرتے اور کام کاج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ وہ کہنے کو تو آزاد ضرور ہیں مگر اُن کی آزادی غلاموں کی آزادی سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ غلام اپنے آقا کے تشدد کے خلاف کسی حد تک صدائے اِحتجاج بلند کر سکتا ہے مگر ایک شخصی حکومت کا آزاد فرد حکومت کے خلاف اپنے ہونٹ بھی نہیں ہلا سکتا۔ اِن واقعات کی موجودگی میں بھی ڈکٹیٹری حکومتوں کا یہ اِعلان ہے کہ ہم آئینی جمہوری نظام رکھنے والے ممالک سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے میں اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہوں مگر اتنا ضرور کہونگا کہ اگر دوسروں کی آزادی سلب کرنے کا نام ترقی ہے تو وہ یقیناً ترقی یافتہ ہیں۔

شخصی حکومتوں میں سب سے بڑا گناہ عوام کو کسی ملکی معاملہ سے مطلع کرنا ہے۔ یہ ہر حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ امن و امان کے زمانے میں وہ اپنی رعایا کو سب سے زیادہ باخبر رکھے مگر مطلق العنان حکمران اپنے ملک کے باشندوں کو سب سے پہلے بے خبر بناتے ہیں تاکہ وہاں کی رعایا اُن کی چیرہ دستیوں کو صبر اور شکر کے ساتھ برداشت کرتی رہے۔ اخبارات اور رسائل کا منہ بھی قانونی طور پر بند کر دیا جاتا ہے آئینی جمہوری حکومتیں صحافت کے معاملہ میں آن خود مختارانہ حکومتوں سے بہت زیادہ آزاد ہوتی ہیں۔ اُن کے یہاں تہذیب اور شائستگی صحافت کے دو لازمی جزو ہوتے ہیں یہ خوبیاں ہم کو جمہوریت Repubbe میں نہیں ملتیں۔ بالڈون Baldwin نے کچھ عرصہ ہوا اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ آئینی جمہوریت، خود مختارانہ حکومت سے دو سال پیچھے رہتی ہے۔ جہاں تک میں اس کا مقصد سمجھ سکا ہوں یہی ہے کہ آئینی جمہوری حکومتوں میں اس وقت تک بام ترقی کی طرف قدم نہیں بڑھایا جا سکتا جب تک کے قوانین قبل از وقت آئندہ نتائج کے محافظ نہ بنجائیں کر اس کے ساتھ ساتھ آئینی جمہوری سلطنتوں میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اول مہذب اور شائستہ شہری اور دوم ان میں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت ——— اور یہ دونوں دنیائے صحافت کی آزادی اور اس کے علمبرداروں کے صحیح اقدام عمل سے پیدا ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں سررشتہ کی حکومت Bureaueroey ہے جو ایک افسر اعلیٰ کے ذریعہ سے کی جاتی ہے مگر اس کے نظام کا بیشتر حصہ وہی ہے جو آئینی جمہوری حکومتوں کا ہوتا ہے۔ یہاں کی صحافت عہد جدید کی پیداوار ہے۔ ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے عہد حکومت میں خبر رسانی کے زبردست ذرائع موجود تھے

اکثر مواقع پر حکام کی بھیجی ہوئی خبریں عوام کے روبرو پڑھی جاتی تھیں مگر عہد حاضر کی صحافت یہاں مفقود تھی۔ خبر رساں ذرایع کے وجود میں آتے ہی اُس کی حفاظت کے لئے سررشتہ کی حکومت نے قانون وضع کر دیئے۔ پہلا قانون لارڈ ولزلی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اُس کی رو سے حکومت کی منظوری کے بغیر کوئی اخبار شایع نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ سختی محض اس لئے برتی گئی تھی کہ ہندوستان اس وقت طوائف الملوکی کے دَور سے گزر رہا تھا اگر اس دور کے ختم ہوتے ہی لارڈ ولیم بنٹنگ کے زمانے میں ہندوستان کی اخباری دُنیا پر سے بہت کچھ پابندیاں ہٹالی گئیں۔ پابندیوں کے ہٹا لینے کے معنی بیجا آزادی کے نہیں تھے ضرورت اور وقت کی مجبوریوں نے حکومت کو پریس ایکٹ پاس کرنے پر مجبور رکھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ ہندوستانیوں میں ابھی "صحافتی شعور" پیدا نہیں ہوا۔ چنانچہ یہ شعور پیدا کرنے کی طرح طرح سے کوششیں کی گئیں۔ مگر آج بھی ہم کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کی صحافت کے علمبردار غیر شعوری طور پر اپنے اخبارات اور رسائل چلا رہے ہیں۔ زمانے کے انقلابات کے باوجود بھی اُردو کے اخبار نویسوں میں یہ احساس پیدا نہیں ہوا کہ اُن کے اخباروں اور رسالوں کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟ وہ نہیں جانتے کہ ان کی تحریروں سے کس طرح قوم بن اور بگڑ سکتی ہے؟ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کس طرح ہندوستانیوں میں ایک اچھے شہری بننے کی صلاحیت پیدا کر سکتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں جو کسی نظام کے تحت کام کرتا ہو اور جو اخبار نویسوں کو اصول صحافت بتائے عملی تعلیم صحافت کے لئے ہم کو ممالک غیر کا مرہون منت ہونا پڑتا ہے۔ وہاں صحافت کی صحیح عملی تعلیم کے لئے باقاعدہ ادارے قائم ہیں۔ اُن میں مدت معینہ تک باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ امتحانات ہوتے ہیں اور سندیں عطا کی جاتی ہیں۔ اُردو دُنیا کے تمامتر اخبار نویس خود ساختہ ہیں۔ اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جن کو یہ بھی خبر نہیں کہ جرنلزم کے اصول کیا ہیں اور جرنلزم کسے کہتے ہیں۔ یہ ان پڑھ مدیر اور ایڈیٹر اپنی قابلیت کے مطابق اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ اُن کی رائیں اور اُن کی تنقیدیں کتنی وقیع ہو سکتی ہیں؟ ایسے اخبار نویس اس آزادی کو جو آئینی حکومتوں یا جمہوری سلطنتوں میں دی جاتی ہے یہ لوگ کس حد تک صحیح طور پر استعمال کر سکیں گے؟

" جدید اُردو صحافت " آج جس دور سے گزر رہی ہے وہ یقیناً قابل افسوس ہے۔ اخبارات اور رسائل میں آزادی اور مکمل آزادی کے نغمے گائے جاتے ہیں۔ کبھی سوراج طلب کیا جاتا ہے اور کبھی وزارتی حکومتیں قائم کرنے کی صلاح دی جاتی ہے مگر اُن کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ وہ اس ملکی آزادی کے اہل نہیں ہوئے' ملکی آزادی تو پھر بھی بڑی چیز ہے وہ " صحافتی آزادی " کے بھی قابل نہیں ہوئے اُنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ اخباروں اور رسالوں کی زندگی کا مقصد اصلی کیا ہے؟ وہ یہ نہیں جانتے کہ وہ کس عہد سے گزر رہے ہیں اور اس کا تقاضہ کیا ہے؟ آزادی دراصل اُس کو دی جاتی ہے جو اس کا اہل ہوتا ہے مگر ہندوستان کی آئینی حکومت نے جو آزادی اخبارات کو عطا کی ہے اسکا بھی وقتاً فوقتاً بیجا استعمال کیا گیا ہے۔ اُردو کے اخبارات میں " زمیندار " کی ایک ایسی مثال موجود ہے جس نے اپنی زندگی کے اکثر و بیشتر حصہ میں نہ زور بیاں کیں اور اکثر مالی نقصان اُٹھایا۔ اس وقت مجھے پریزیڈنٹ میزریارک President Masaryak کا قول یاد آرہا ہے اُنھوں نے کہا تھا۔

" سوراج اپنے اُوپر قابو حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے' ہاتھوں میں صرف

عنانِ حکومت آجانے کو سوراج نہیں کہہ سکتے۔"

فاضل صدر کے نزدیک عنانِ حکومت حاصل کرلینا بڑی بات نہیں۔ ہمارے سامنے بھی کانگریس منسٹری اور اس کے عہد کی کارگزاریاں موجود ہیں جن کو دیکھکر یہ رائے صحیح اور واجبی طور پر قائم کی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی ابھی تک "آزادی" کا صحیح مفہوم نہیں سمجھے۔ اُن میں یہ لاشعوری کیفیت اس وقت تک رہے گی جب تک کہ ملک کے اخبارات اور رسائل میں یہ شعور پیدا نہ ہوجائے۔ اور اپنے جرائد کے ذریعہ سے عوام میں آزادیِ خیال اور آزادیِ تحریر کا صحیح مفہوم پیدا نہ کردیں۔ اُن کا مقصد یہ ہونا چاہیئے تھا کہ وہ ہندوستانیوں میں ایسی تمدنی بیداری پیدا کریں کہ ہندوستان کی کثیر آبادی اپنے شہری حقوق کو پہچاننے لگے اور پھر اُن کا مطالبہ کرے اور اُن کا صحیح استعمال کرے۔ اگر حکومت کوئی ملکی معاملہ اُن سے صیغۂ راز میں رکھتی تو مطالبہ کیا جاتا اور اُن کو بتایا جاتا کہ مطالبہ کرنے کا یہ انداز ہوتا ہے اور اس سے یہ فائدہ حکومت کے پیشِ نظر ہے اُنھیں یہ کھایا جاتا کہ وہ حکومت کی مدد کس وقت اور کن صورتوں میں کرسکتے ہیں۔ غرض اُن میں سیاسی نکات کے سمجھنے کی اہلیت پیدا کی جاتی اور تب حکومت سے آزادی کا مطالبہ کیا جاتا۔ اس نقطۂ نظر سے اُردو صحافت کا پورا عملہ ناکارہ ثابت ہوا ہے۔ اُردو کے اخبار نویس، اُردو دان طبقہ میں صحافتی شعور تک پیدا نہ کرسکے۔ ایسی حالت میں اگر آزادی اور صحافتی آزادی دے دی جائے تو وہ ہندوستانیوں کے لئے قطعی نفع بخش نہ ہوگی۔ مختلف قوانین کی موجودگی کے باوجود بھی اردو صحافت کو جس قدر آزادی نصیب ہے وہ مدیر اور ایڈیٹر اپنی شکم پری کے لئے استعمال کررہے ہیں۔ جدید اُردو صحافت فن کی حیثیت سے رائج نہیں ہے اس کی حیثیت تجارتی ہے۔ اگر ایک تعلیم یافتہ انسان کوئی تجارت کرنا چاہتا ہے۔ تو وہ مست قلندر جیسا پرچہ نکالکر ادنیٰ درجہ کے مضامین شایع کرنا شروع کردیتا ہے . . . . . اس کا نام ہے تجارت صحافت اس کو نہیں کہتے۔ ان کا مقصد قومی وقار کو بلند کرنے کے بجائے جائز اور ناجائز طریقہ سے روپیہ حاصل کرنا اور کبھی کبھی چندہ کا طلب کرنا رہ گیا ہے۔ اُسی کے ساتھ شخصی تعریفیں شایع کرنا اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا، دوسروں کو گالیاں دینا اور خود گالیاں سُننا یا گندہ ذہنی کو پیشہ بنا لینا، جھوٹ بولنا، ایک دوسرے پر نکتہ چینی کرنا اُن کا اصلی مقصد ہے۔ اگر معیار بہت بلند ہوا تو اُنھوں نے چُن چُن کر سنسنی خیز خبریں شایع کردیں، حیاسوز واقعات کو جلی حروف میں پیش کردیا۔ فرضی خطوط شایع کرنا، عاشقانہ داستانوں کو قارئین کی دلچسپی کے لئے دہرانا، بیہودہ اور گندہ انداز میں جھوٹی دوائیوں کے اشتہار شایع کرنا اُن کے ذیلی مقاصد میں داخل ہوگیا ہے جہاں تک ہندوستان کی سیاست کا تعلق ہے۔ وہ گاندھی، جناح اور مالوی کی سیاست کے اکھاڑے ہیں۔ جہاں حق کو باطل بھی پچھاڑ دیتا ہے اُن کے نزدیک مولانا محمد علی جوہر کا وائسرائے ہند کے ساتھ چائے کی ایک پیالی پی لینا وہ گناہ ہے جو رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا ؎

چاء کی ایک پیالی پہ وہ ہم کو بیچیں
یہ بھی اِک فضل ہے اسلام ترے افسانوں میں

اِس طرح جدید اُردو صحافت، شہریت کے پاکیزہ جذبات پیدا کرنے کے بجائے کینہ، بغض و حسد، رعونت و تکبر مکر و فریب، جھوٹ و دغا بازی، فریب دہی اور عریانی کے بیج بو رہی ہے۔ البتہ کچھ رسائل ایسے ضرور ہیں جو علمی اور ادبی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ ان میں اُردو، سائنس، ہندوستانی، معارف، ہمایوں، ساقی، نگار، ادبی دُنیا وغیرہ قابلِ قدر ہیں مگر اُن کی سرگرمیاں بہت کچھ سستے اور کم مایہ رسالوں نے کم کردی ہیں چین دنیا.

نرالی دُنیا اور اسپلوح کے دوسرے رسائل بہت کچھ تباہ کن اُثرات ملک کے طول وعرض میں پھیلا رہے ہیں۔ اخبارات میں اِنقلاب، مدینہ اور النجم قابل قدر تھے؛ ان میں النجم" مدح صحابہ اور تحریک تبرا کی نذر ہوگیا؛ مولوی، دہلی اور الفرقان۔ بریلی وغیرہ مذہبی شعور پیدا کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہیں۔ ہاں فلمی رسالوں کی بہتات ہے اور اُن سے جو اثرات مرتب ہو رہے ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔ ہفتہ وار اخبارات کسی حد تک قابل قدر ہیں ان میں کچھ مفید معلومات اور مفید مضامین ہوتے ہیں۔ بچوں کے لئے اخبارات مفقود ہیں، رسالوں میں صرف پھول، نونہال، رتن، پیام تعلیم اور، ترقی ہی کو کافی سمجھا گیا ہے۔

خواتین پر قوم کی آئندہ ترقی کا انحصار ہوتا ہے کیونکہ ملک کے مایہ ناز فرزند اُنھیں کی گودوں میں پرورش پاتے ہیں دُنیائے اُردو صحافت میں معدودے چند رسائل عورتوں کے لئے ہیں جن میں اُن کو گھریلو زندگی بسر کرنے کے اطوار اور کام کاج کی باتیں بتائی جاتی ہیں ملکی، قومی اور سیاسی معاملات سے ان کو نابلد رکھنا ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سیاست یا ملکی حالت کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا دوسرے الفاظ میں اس کو یوں کہہ لیجئے کہ مرد یہ سمجھتے ہیں کہ عورت کی زندگی کا مقصد، کھاؤ، پیو اور خوش رہو، کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ غرض جدید اُردو صحافت کے اس جائزہ سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ وہاں تعمیری کام کے بجائے تخریبی کام زیادہ ہو رہا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ عوام کی ذہنیت اور علمیت پر کسی قسم کی پابندی سیکڑوں خرابیاں پیدا کر دیتی ہے اُردو صحافت کی یہ پستی کسی حد تک پابندیوں کی بدولت ضرور ہے مگر پابندی کے یہ معنی نہیں کہ اخبارات و رسائل کا معیار بلند کرنے کے بجائے پست اور پست تر بنایا جائے۔ ہم کو چاہیئے کہ ہم اپنا معیار زندگی بلند کریں۔ پاکیزہ اور بلند جذبات کے حامل ہوں۔ ہمارے خیالات نہایت صاف اور ستھرے ہوں جب ہم اس معیار پر پہنچ جائیں گے تو ہمیں آزادئ خیال اور آزادی تحریر دونوں کے حاصل کرنے میں دقت نہ ہوگی۔ اس پستی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان دنوں اخبار نویسوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ ریڈیو سٹ رکھنے والے حضرات کو اخبارات کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ علمی، ادبی، تاریخی اور سماجی مضامین کے علاوہ خبریں بھی اُن کو اپنے سٹ پر سنائی دیتی ہیں مگر میرا خیال ہے کہ ایسے افراد کا ذہنی ارتقا کا سلسلہ بہت دیر پا ہو جاتا ہے ریڈیو کا تعلق صرف قوت سامعہ سے ہے۔ انسان خبریں سن کر بھول جاتا ہے کبھی کبھی مکدر فضا کی وجہ سے پوری خبریں بھی سنائی نہیں دیتیں۔ ریڈیو سٹ پر سنی ہوئی خبروں پر اگر سامع تنقید کرنا چاہے تو وہ بالکل معذور رہتا ہے چھپی ہوئی خبروں کو متعدد بار پڑھا جا سکتا ہے۔ اور اُن پر پورے طور سے غور کر کے نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

خبریں اخبارات کا اصل جزو ہیں۔ اُن کا یہ خاص کام ہوتا ہے کہ وہ خبروں کو معتبر اور جنرل ایجنسیوں سے حاصل کریں اور انھیں مفید کارآمد بنا کر پیش کریں تاکہ وہ عوام کی صحیح رہبری کریں مگر جدید اخبار نویسی میں اس پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے خبریں ضرور ہوتی ہیں جن میں تین چوتھائی غلط اور بے بنیاد سماج کے نقطہ نظر سے ہر اخبار نویس کا مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے مگر یہ اسی وقت جبکہ وہ اپنے فرائض دیانت داری کے ساتھ انجام دیتا ہے

علی اختر

عورت

مطربِ فطرت نے جب چھیڑا سرورِ کائنات
ذرّہ ذرّہ اپنی قسمت کا خزانہ پا گیا
قدسیوں نے بھی نہ جن رازوں کا پایا تھا سراغ
خاک کی دھندلی جبیں سے پھوٹ کر بہنے لگے
آب و گل میں کروٹیں لینے لگی موجِ حیات
نعمتوں کا ابر اٹھا اور فضا پر چھا گیا
اُن سے روشن کی گئی آدم کی قندیلِ دماغ
غیرتِ صد کوثر و تسنیم، چشمے نور کے

اپنے خال و خد کی رعنائی پہ اِترانے لگی
کائنات اقصائے مہر و مہ کو شرمانے لگی

لیکن اَب بھی گرچہ دُنیا تھی شبستانِ جمال
چھا رہا تھا قصرِ بیداری پہ ہلکا سا دُھواں
چُبھ رہا تھا روح میں سوزِ صبا کا پیچ و تاب
عرصۂ پندار میں عرفانِ بیداری نہ تھا
عشق کی نرم آنچ کے طالب تھے اجزائے شہود
منزلِ ہستی کی اِن خاموشیوں کو دیکھ کر
زندگی تھی عہدِ وحشت کا پریشاں سا خیال
دھیمے دھیمے نور میں تھا خواب کا سا اِک سماں
ساز کے تاروں میں تھا نغموں کا طوفاں محوِ خواب
چونکتے ہیں جس سے دل وہ کیف ابھی طاری نہ تھا
برف کے سینے کی خنکی، قلبِ آہن کا جمود
مسکرائی خود بخود صنّاعِ فطرت کی نظر

اور اِک پیکر بنایا دل پذیر و دل نواز
سینۂ گیتی میں جس نے بھر دیا سوز و گداز

پھول کی نرمی عطا کی اُس کو غنچوں کی ہنسی
پھول سی آنکھیں اور اِن آنکھوں میں عصمت کی ضیا
پنکھڑی سے لب، لبوں میں اُس تبسم کی جھلک
لحن میں نغموں کی شیرینی، نگاہیں دل نواز
چاندنی کی سی لطافت، صبح کی سی تازگی
مسکراتی لوحِ پیشانی، دلِ درد آشنا
نغمہ بن جاتی ہو جس سے نبضِ طوفاں کی دھمک
بات میں نورس شگوفوں کی لچک، دل میں گداز

سر پہ ہی پھولوں کا تاج اِک فرق پر رکھا گیا
اور اِسے دنیا میں "عورت" کا لقب بخشا گیا

اِنتصار نبوتنوی

ناسُور

لکھتے لکھتے اُس کا سر درد کرنے لگا۔ صبح سے لکھتے لکھتے شام کے چھ بج چکے تھے۔ اور وہ اپنی دفتر کی میز پر بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر کے لئے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سامنے مال روڈ پر اب ہمیشہ کی طرح کافی بھیڑ بھاڑ ہو چکی تھی۔ لوگ بن سنور کر عمدہ عمدہ پوشاکیں پہنے سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ اینگلو انڈین لڑکیاں۔ ہندوستانی عورتیں۔ امریکن سولجر۔ بوڑھے بچے جوان۔ اس وقت سب مال روڈ سے گزر رہے تھے۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامے ہوئے میز پر اپنی کہنیاں ٹیکے کچھ سوچ رہا تھا۔ باوجود سر کے درد کی شدت کے وہ سوچنے پر مجبور تھا۔ اگر نہ سوچے تو دنیا میں زندہ کیونکر رہے۔ اپنے بچوں کا پیٹ کیسے پالے۔ اپنی شخصیت کو کس طرح برقرار رکھے۔ غرض دن کے ان بارہ گھنٹوں میں سوچنا۔ اور سوچ کے لکھنا۔ اور لکھکر دوسروں کے سامنے پیش کر دینا۔ اس کی زندگی کا اہم ترین مشغلہ تھا جس اخبار کا یہ ایڈیٹر تھا اس کے مالک نے اس سے کچھ اس قسم کا معاہدہ کیا تھا کہ دن بھر سوچو۔ سوچ سمجھ کر لکھو اپنے لکھے ہوئے پر دنیا کو سوچنے اور سمجھنے کا موقع دو۔ پھر جب اخبار بکے تو اپنی مقررہ اُجرت نکال کر باقی پیسے میرے حوالے کر دو۔ اور اس وقت وہ سب کچھ ہی سوچ رہا تھا۔ اخباری مواد کے علاوہ اُسے بہت کچھ اور سوچنا پڑتا تھا۔ اس کے مشین نما دماغ میں سوچنے سمجھنے کی قوت بہ نسبت دوسروں کے زیادہ سُرعت سے کام کرتی تھی۔ مگر آج صبح سے شام تک سوچتے سوچتے اس کے دماغ میں درد پیدا ہو گیا تھا۔ اور اب وہ اپنا سر پکڑے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ اس میں درد کیوں پیدا ہوا۔ درد اور اس کا سر دو متضاد چیزیں تھیں۔ ایک اخبار کے ایڈیٹر کا سر اور درد۔؟ مگر درد نے کچھ اور سوچنے سمجھنے کا موقع نہ دیا۔

اُس نے ذرا یوں ہی سر کو جنبش دیکر اُوپر اُٹھایا اور سامنے مال روڈ کی طرف دیکھنے لگا۔ فن زیبائش کے جاں فزا نظاروں اور ہلکی پھلکی خوش رنگ پوشاکوں سے کچھ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی۔ گوری چٹی لڑکیوں کا ایک غول سولجروں کے ساتھ قہقہے لگاتا۔ ناچ گھر کے اندر چلا گیا۔ ایک ماہ جبیں تنہا اپنی نگاہوں کو نیچا کئے ہوئے سامنے سے گزر گئی۔ کچھ ہندوستانی عورتیں ہلکی ہلکی گلابی ساڑیوں میں ملبوس اپنے بچوں کی انگلیاں پکڑے چلی گئیں اتنے میں ایک لنگڑا فقیر اپنی سوجی ہوئی ٹانگ پر ایک چکنا چپڑا ناسور لے کر سامنے آگیا۔ ایک عجیب انداز سے وہ اپنی سوجی ہوئی ٹانگ کو ایک ڈنڈے پر رکھکر اچھالتا ہوا اچل رہا تھا۔ جیسے مال روڈ پر اس ناسور کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ اور کہہ رہا ہو کہ دیکھو یہ بھی ایک فن زیبائش ہے۔ مگر تمہاری نظروں میں اتنی وسعت کہاں کہ تم اسکی قدر کر سکو۔ میں گھنٹوں کی ریاضت کے بعد اپنے اس ناسور کو سنوار کر اس مال روڈ پر لایا ہوں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے اس کے سنوارنے میں تمہارے

گیسوؤں اور رخساروں سے زیادہ وقت لیا ہے۔ یہ ناسور ہے۔ حسن ظاہر نہیں۔ تمہارے چہروں سے زیادہ یہ ناسور حسین ہے۔ ایک حسن ظاہر۔ اور ایک حسن باطن۔ رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے:

اس نے اب اپنے سر پر سے ہاتھوں کو اٹھایا حسن کا بازار اور سوجی ہوئی ٹانگ کا یہ ناسور۔ دو متضاد چیزیں جیسے اس کا اپنا شین نما دماغ اور درد —— اس کے دماغ میں ایک عجیب سی کلبلاہٹ نے درد کی جگہ لے لی۔ اور لکھنے کی وہ قوت جو مسلسل محنت کے بعد زائل ہو چکی تھی پھر سے عود کر آئی۔

آخ تھو۔ ایک نوجوان نے لنگڑے فقیر سے بال بال بچتے ہوئے کہا۔ کم بخت نہ موقع دیکھے نہ محل اَبے بھیک منہ سے مانگتا ہے کہ ٹانگ سے؟ لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ۔

نوجوان نے جلدی سے ایک اِکنی لنگڑے کے ہاتھ پر رکھدی۔ پھر بولا۔ اب دفع ہو جاؤ۔ دور سڑک کے اس کنارے پر جا کر مانگو کھاؤ۔ اور پھر وہ لکڑی پر رکھی ہوئی اپنی ٹانگ کو اچھالتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔

اب اُس نے پھر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ لکھنے سے پہلے ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں کے ساتھ کھیلی تھی۔ جیسے اُسے کوئی اہم اور سنجیدہ موضوع لکھنے کے لئے مل گیا ہو۔ اُس کی نگاہیں اب سڑک پر سے ہٹ گئیں۔ اور قلم نے حرکت شروع کر دی۔ دماغ چلنے لگا۔ خیالات کی سوکھی لکڑیاں جس قدر سرعت سے جلتی تھیں نوک قلم سے اتنے ہی زیادہ انگارے سفید کاغذ پر پیدا ہو رہے تھے۔ اس نے خود ان انگاروں کی حدت کو محسوس کیا۔ اپنے بیان میں گرمی پائی۔ الفاظ کے دہن سے گرم گرم خون ابلتا ہوا دیکھا۔ اور خوش ہونے لگا اُس نے سوچا کہ میرے اخبار کا یہ بہتا ہوا ناسور کل مال روڈ پر لوگوں کو چاٹنا پڑیگا۔ آخ تھو —— اس کی ظاہر گندگی پر لوگ تھوکینگے۔ اور پھر جلدی سے ہاکر کے ہاتھ پر اکنی رکھکر کہیں گے بس اب دفع ہو جاؤ ایسے اخبار کو بیچتے وقت موقع اور محل کا بھی خیال رکھا کرو۔ یہ گھومنے کا وقت ہے نہ کہ اخبار بیچنے کا؟

بنگال کی بھوک اور ہماری قوت اِشتہا؟

تازہ "قومی محاذ" قیمت ایک آنہ۔

پھر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں کے ساتھ کھیلی اور وہ لکھنے میں پہلے سے بھی زیادہ اِنہماک کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ لنگڑا فقیر اب سڑک پار کر گیا تھا۔ اور اَب وہ فٹ پاتھ پر ایک پانی کے نل کے پاس جا کر رُک گیا۔ یہاں پہنچکر اُس نے اپنے ناسور کو غور سے جھک کر دیکھا۔ اتنا فاصلہ کچھ عجلت اور بے ترتیبی کے ساتھ طے کرتے ہی زخم کے اندر سے تازہ خون بلا سبب چھلک آیا تھا۔ اور پیلے تیل کے ساتھ چل چل کر پیر کی انگلیوں تک بہہ آیا تھا۔ اس نئی چیز نے گو سوجی ہوئی ٹانگ کی زیبائش کو بڑھا دیا تھا اور اس پر ایک قدرتی نکھار پیدا ہو گیا تھا مگر زخم پر زور پڑنے سے ایک قسم کے کرب و بےچینی کا انداز بھی لنگڑے کے چہرے پر موجود تھا۔ اور اُس کے ماتھے پر پسینہ کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں۔ اُس نے اب اپنی ٹنگی ہوئی سوجی ٹانگ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ درد شاید لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ حالانکہ درد اور ناسور دو بالکل متضاد چیزیں تھیں لنگڑے کے سارے حوصلے اسیطرح پست ہوئے جا رہے تھے۔ جیسے کسی کو جوانی میں موت آ رہی ہو۔ اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنے شباب میں اُبھرے ہوئے ناسور کو دیکھا اور ایک آہ کے ساتھ وہیں پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

شام ہو چکی تھی مگر اسے ابھی بہت کچھ لکھنا تھا۔ بجلی کے قمقمے اوپر کے مکانوں میں روشن ہو گئے تھے۔ وہ اپنی جگہ پر سے اٹھا۔ اٹھتے ہی سارے جسم کا منجمد خون حرکت میں آ گیا۔ کئی گھنٹوں کے بعد اُس کا

اس طرح اُٹھ بیٹھنا صحت بخش تھا۔ وہ اپنے کمرے سے باہر صحن میں نکل گیا۔ نیچے مال روڈ کی بھی سڑک اب پہلے سے کم روشن تھی اب اس کے حسن میں وہ جادو بہت نہ تھی۔ جیسے کسی دولہن کو عروسی جوڑوں سے ہلکے پھلکے ریشمی جوڑے میں بدل دیا گیا ہو۔ اُس نے صحن کی دیوار میں لگے ہوئے بجلی کے سوئچ کو کھٹ سے کر دیا۔ اور اس کے کمرہ کا ۲۵ کنڈل پاور کا بلب روشن ہوگیا۔ اب وہ پھر اپنی ٹوٹی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ اور کام کرنے لگا۔

اتنی دیر میں خیالات کے بہت سے سلسلے دماغ سے نکل کر منہدم ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنی پوری شدت کے ساتھ اُنھیں پھر جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی تصور کی دنیا میں بہت سے افسردہ اور مُردہ ڈھانچے میز کے اِدھر اُدھر آکر کھڑے ہوگئے۔ ایک ڈھانچے نے اپنی انگلیوں کی کھپانچوں کو میز پر کھٹ کھٹایا۔ اس نے لکھنا چھوڑ کر گردن اُوپر اُٹھائی اُس کا خالہ زاد بھائی جمشید اُس کے پاس کھڑا کہہ رہا تھا۔

بھائی جان۔ اِن خیالی گورکھ دھندوں میں کیوں پھنسے ہو۔ تمہاری کوئی تحریر مجھے دوبارہ جنم نہ دے گی۔ اِس دنیا میں بھوک کا اِحساس الفاظ سے نہیں ہوسکتا۔ تم اِن لفظوں میں جس قدر گرمی محسوس کرتے ہو۔ اتنے ہی یہ ٹھنڈے ہیں۔ یہ تجربہ مجھے مرنے کے بعد ہوا۔ زندگی میں تمہاری قوت بازو پر مجھے بھی ناز تھا۔ اور میں سمجھتا تھا کہ تمہاری تحریروں میں ایک زبردست اِنقلاب پنہاں ہے مگر وہ سب میری زندگی کا گذشتہ دھوکا اور تمہاری زندگی کا موجودہ فریب ہے۔

مگر جمشید۔ اس کی آواز کانپنے لگی۔ تم یہ نہیں سمجھتے کہ میں اتنی روزی کما رہا ہوں۔ اگر ایسا نہ کروں تو تمہاری بھابی کو کہاں سے کھلاؤں۔ تمہارے بھتیجوں کا پیٹ کہاں سے پالوں۔ خود اپنی شخصیت کو کس طرح برقرار رکھوں یہ موضوع بڑا تلخ ہے۔ اِتنا تلخ کہ آج تم بھوک سے مر جاتے بعد بھی اس کا کوئی صحیح حل اپنے پاس نہیں رکھتے ہو۔ خیر۔ چھوڑو اِن باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ اِتنے بہت سے ڈھانچے تمہارے ساتھ کیوں ہیں؟

جی۔ بھائی جان۔ جمشید ہنسنے لگا۔ یہ سب آپ کی بے جان کہانیوں کے زندہ کردار ہیں۔ آپ خود بے جان ہیں مگر آپ نے زندہ چیزوں کو تخلیق کیا۔ آیئے میں اِس وقت صرف ایک ڈھانچے سے آپ کا تعارف کراؤں۔ اِس بوڑھے خرانٹ کا حال کہتے ہوئے میرا دل سُلگتا ہے! اور میرا خیال ہے دُنیا کے تمام مصائب اس پر ختم ہوگئے۔

وہ جمشید کی اِن باتوں کو سُن کر ذرا سا مُسکرایا کہنے لگا۔ موت مل جانے کے بعد بھی تم لوگ مصائب کی یاد کرتے ہو۔ حالانکہ موت اور مصائب دو متضاد چیزیں ہیں۔

جی ہاں جمشید تو چپ رہا مگر وہ بوڑھا ہنسکر بولا۔ تو پھر آپ کے نزدیک زندگی اور مصائب ایک چیز کا نام ہوگا۔ مگر میں موت اور مصائب کو ایک سمجھتا ہوں۔ یہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ اُس نے اپنے کمرہ کے ۲۵ کنڈل پاور بلب کی طرف دیکھکر کہا۔ مجھے اپنے اخبار کے لئے ایک دلچسپ موضوع ہاتھ لگا تھا۔ مگر تم لوگوں نے سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

اور ہمارے بھی بہت سے کھیل بگڑ گئے کاش کہ آپ کسی ایک بگڑے ہوئے کھیل کا حال میری زبان سے سن لیتے تو میرے دل کو سکون ہو جاتا۔ کیا ہم اپنا بیان پریس میں نہیں دے سکتے۔ اور کیا ہمارے بیان پر دنیا والے کسی دلچسپی کا اِظہار نہیں کرسکتے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کی کسی تازہ کہانی سے میرا بیان زیادہ دلچسپ ہوگا۔ میں نے اپنے خاکی جسم کو ابھی ابھی چھوڑا ہے۔ وہ دیکھئے سامنے فٹ پاتھ پر پانی کے نل کے قریب میرا مُردہ جسم پڑا ہے۔ زندگی میں میری دائیں ٹانگ پر ایک تین انگل گہرا ناسور تھا اس ناسور سے مجھے اتنا ہی اُنس تھا۔ جیسا آپ کو اپنے

اس اجاڑ سے ہوگا۔ میری زندگی کا واحد سہارا میرا یہ ناسور مجھے بہت عزیز تھا۔

مگر میں نے تو تمہیں ابھی ابھی اس مال روڈ پر بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ اس نے دلچسپی سے اس ڈھانچے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جی ہاں ابھی ابھی بھیک مانگ رہا تھا۔ اور ایک نوجوان نے مجھے ایک اکنی دیکر حقارت سے کہا تھا کہ میرے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ میں سڑک پار کرنے لگا۔ بیچ سڑک پر ایک گھوڑے کی ٹاپ میرے زخم پر لگ گئی۔ ۲۲ برس کا پرانا ناسور اس چوٹ کو نہ برداشت کر سکا۔ یہ پان پھول کی طرح رہنے والا بچہ گھوڑے کی ٹاپ کے نیچے آکر بے جان ہوگیا۔ میری موت یا اس ناسور کی موت جسے میں نے ۲۲ برس تک اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھا۔ ایک ہی چیز ہے۔ میرے سات بچے اور ایک بیوی ہے۔ سب سے بڑا لڑکا کچھ ہی روز میں بالکل میرے نقش قدم پر چلتا ـــــ اس کی بھی دائیں ٹانگ پر میں نے ایک ناسور بنایا ہے۔ وہ ابھی اچھی طرح پھلنے پھولنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے موت نے آکر دبوچا۔ آپ زندگی کو مصائب سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ موت انسان کی سب سے بڑی مصیبت ہے۔ اس نوجوان کی دی ہوئی وہ اکنی میری تہمد کے پلو میں اب تک بندھی ہے۔ آج میری بیوی بچوں کو تیسرا فاقہ ہے۔ آج کئی دن سے اس ناسور نے کوئی اعجاز نہیں دکھایا تھا۔ مگر آج میں نے اس کے زخم کو ایک فولادی چاقو کے پھل سے اور زیادہ گہرا کر لیا تھا۔ خون جگر سے لکھا ہوا یہ نامہ آج ان پر ضرور اثر کرتا اگر مجھے موت آگئی۔ آج میری بیوی نے چلتے وقت کسی نیک شگون کے خیال سے تیل اور مستی کی فرمائش بھی کی تھی ممکن ہے آپنے میرے جذبات کی روشنی میں اس وقت میرے بچوں کو بھی دیکھ لیا ہو۔ بہر حال یہ میری زندگی اور موت کے درمیان کا ایک ہلکا سا خاکہ ہے جسے میں نے مختصراً بیان کیا۔ اتنا کہکر وہ ڈھانچا ہنسنے لگا۔ اور آپ یہ آخر کیا لکھے جا رہے ہیں۔ اس نے ذرا جھک کر کاغذ کی طرف دیکھا

"بنگال کی بھوک اور ہماری قوت اشتہا" ایک زوردار قہقہہ اس کے منہ سے نکل فضا میں گونج گیا۔

تو کیا تم کچھ پڑھ بھی لیتے تھے۔ اسے اب ڈھانچے کی اس حرکت پر بڑا تعجب ہوا۔

جی ہاں۔ میں بھی کبھی آپ کی طرح ایک اڈیٹر تھا اسی زمانہ میں میں نے چودہ برس کی جیل کاٹی۔ وہاں سے نکل کر پھر میں نے اڈیٹری نہیں کی اپنے اس ناسور کو پالا۔ ٹھہریئے آپ کے چہرہ کا رنگ متغیر کیوں ہو رہا ہے؟ میں تو صرف ناسور کا ذکر کر رہا ہوں۔ اگر آپ کو اس کے ذکر ہی سے تکلیف ہوتی ہے تو جانے دیجئے۔ ورنہ زندگی میں تو میں نے بڑے بڑے مہاپرشوں کو یہ زخم دکھا کر ان کے منہ پھیرے۔ زندگی کے ۲۲ برسوں تک میں نے اپنے اس مشن کی تبلیغ کی ہے۔ اور اس میں کامیاب رہا ہوں۔ اور اب مرنے کے بعد یہ اطمینان ہے کہ میرا یہ مشن میرے لڑکے سے زندہ رہیگا۔ اگر آپ مجھے خود غرض نہ کہیں تو ایک بات اور عرض کر دوں۔ مجھے یہ کاروبار دنیا میں سب سے زیادہ پھلا پھولا۔

غالباً میرا بڑا لڑکا اپنے ناسور سے یہی مطلب اخذ کریگا۔ اور یقیناً اپنے بعد یا اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو یہ عطیہ دیتا جائیگا ـــــ اور کیوں صاحب یہ بنگال کی بھوک پر جو کچھ آپ لکھتے جا رہے ہیں کیا یہ کوئی نئی چیز ہے یہ کہیئے کہ آپکے سوئے ہوئے احساس نے اب کام کیا ہے اگر آپ غور سے دیکھیں تو اس بھوک اور میرے ناسور کی حدیں بہت قریب قریب ہیں۔ منظر عام پر دونوں کی ایک ہی قیمت ہے۔ یہ ایک انسان کی دائیں ٹانگ ہے اور وہ ایک ملک کی دائیں ٹانگ۔ اور دونوں کی ٹانگوں میں ناسور۔ اب سوال یہ ہے کہ میری طرح ہندوستان نے اپنی ٹانگ بیکار کیوں کی۔ اس کا جواب میں کیوں دوں؟ جس فولادی پھل سے یہ ناسور بنایا گیا ہے اس سے پوچھئے مگر آپ تو اڈیٹر ہیں آپ کے لئے صرف اتنا ہی اشارہ

کافی ہے کہ یہ روزگار بڑا سود مند ہے۔

بڑے جہاں دیدہ بزرگ ہو۔ آؤ آج ادارت کی کرسی پر تم بیٹھکر میرے اخبار کو مرتب کرو۔ یہ اخبار آج سے تمہارے ناسور کا ضامن ہوتا ہے۔ اور صرف تمہا تمہارے مشن کی تبلیغ کریگا۔ اِتنا کہکر وہ اپنی کرسی سے اُٹھکر ڈھانچے کی طرف بڑھا۔ اور پاس ہی ایک دیوار کے کھمبے سے جا کر لپٹ گیا۔ اس خواب وخیال کی دنیا میں اس نے جو کچھ کھو کر پایا اس کو ذہن میں محفوظ کرنے کے لئے وہ پھر اپنے صحن میں آکر ٹہلنے لگا۔ مال روڈ کی سڑک پر اَب ایکا دکا آدمی نظر آرہا ہے۔ فٹ پاتھ پر پانی کے نل کے قریب ایک مُردہ جسم پڑا تھا۔ اور لاش کے پاس ہی ایک میلی سی گٹھڑی اور لوٹا رکھا تھا۔

صحن میں بلاارادہ ٹہلتے ہوئے اُسے اِکدم جمشید کا خیال آگیا۔ اپنے محسن خالہ زاد بھائی کا۔ اور اس خیال کے آتے ہی جمشید کا مجسمہ پھر نگاہوں کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا ایک لمبا انسانی ڈھانچہ جس کے دو لمبے لمبے سوکھے ہاتھ گھٹنوں سے نیچے لٹک رہے تھے۔

بھائی جان۔ جمشید نے اُسے پھر آواز دی۔ آپ میری صحبت سے گھبرا تو نہیں گئے؟ ہماری آپ کی ظاہری صورتوں میں بڑا فرق ہے۔ مگر اَب تو بنگال کی بہت زیادہ آبادی اِنھیں ڈھانچوں پر مشتمل ہے۔ اگر بنگال میں رہنا ہے تو ہماری صحبتوں کے عادی بنئے۔ یہ ہمارا ملک ہے اور ہماری موت نے ہمیں اَب دوسری زندگی میں بدل دیا ہے۔ ہم آپ کے سرخ سفید رنگ کو دیکھکر ذاتی طور پر مرعوب تو ہوتے ہیں۔ مگر پھر یہ بھی سوچتے ہیں کہ اس رنگ و روپ میں ہمارا بھی حصہ تھا۔ اور یہ تنہا آپ ہی کو کیوں ملا۔ ہمیں آپ اپنے ساتھ مرنے کی دعوت تو دیتے ہیں۔ مگر زندگی میں اپنے دوش بدوش رکھنا نہیں چاہتے۔ بھلا یہ کونسا انصاف ہے۔ آپنے بے شمار کہانیاں لکھیں۔ بے اِنتہا مقالے لکھے۔ مگر کوئی صحیح اِحساس آپکے دل میں پیدا نہ ہو سکا۔ آپ کی کہانیوں کے ہزاروں ننگے بھوکے کردار اِدھر اُدھر سر پٹکتے پھرتے ہیں۔ اور مجھ سے آکر فریاد کرتے ہیں۔ صفحات کے اُوپر کسی کو ننگا بھوکا بناکر کھڑا کر دینا اور پھر اُنھیں الفاظ میں مقید کر دینا آپ کا کوئی کمال نہیں ہے۔ اگر ہو سکے تو اُنھیں پہننے کے لئے کپڑے اور کھانے کے لئے غلہ دیجئے۔ مگر عمل اور تخیل دو متضاد چیزوں کو آپ ایک ہی سمجھتے ہیں۔ آپ جو کچھ سمجھتے ہیں وہی دنیا سمجھتی ہے۔ مگر دنیا کتنا غلط سوچتی اور سمجھتی ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں ایک بات کہوں۔ آپ کچھ خاک سوچتے سمجھتے نہیں۔ آپ دنیا میں زندہ رہتے ہیں اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو برقرار رکھتے ہیں ورنہ سوچنا سمجھنا اور زندہ رہنا دو متضاد چیزیں ہیں۔ اور یہ کبھی آپس میں مل نہیں سکتیں۔

جمشید میرا بھائی۔ وہ بے اختیاری طور پر چلّا پڑا۔ آواز صحن اور کمرہ میں گونج کر پھر واپس آگئی۔ اور اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ پھر اپنی میز کے قریب آیا بکھرے ہوئے کاغذوں پر ایک نظر دوڑائی اور کرسی پر بیٹھکر کام کرنے لگا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اور اَب مال روڈ کی سڑک پہلے سے زیادہ ویران نظر آنے لگی تھی۔

اس نے جلدی جلدی اخبار کے مضامین مرتب کئے اور مسودوں کا ایک بڑا سا بنڈل بغل میں دباکر چلنے لگا۔ کمرہ کو مقفل کرتے وقت اس نے اِتنی دیر کی تمام روداد کا جائزہ لیا۔ پھر سوچنے لگا یہ سب خواب پریشان تھے۔ دنیا میں یہی ہوتا ہے اور ہوتا رہیگا۔

اپنے کمرہ سے جس وقت وہ نیچے اُتر کر مال روڈ پر آیا تو اُسے اپنے اِردگِرد کچھ سائے حرکت کرتے ہوئے نظر پڑے کچھ سائے آپس میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے کچھ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے ہوں "کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اور وہ اپنے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا پریس کی طرف بھاگ رہا تھا۔ پھر جب وہ فٹ پاتھ پر پانی کے نل کے قریب پہونچا تو اُس نے دیکھا کہ لنگڑے کی مُردہ لاش اسی طرح پڑی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک جوان آدمی اپنی دائیں ٹانگ میں ایک کم سن ناسور لیئے کھڑا ہے۔ اور زبانِ حال سے کہہ رہا ہے۔ میں اسی زہریلے ناسور کی اولاد ہوں جسے آج اَبدی نیند آگئی۔ میں اسی زہریلے ناگ کا بچہ ہوں اور زندگی بھر بل کھودتا رہونگا۔

سینما اور ناچ گھر کا ہنگامہ "بزم نشاط" سے فارغ ہو کر پھر مال روڈ پر منتشر ہوگیا۔ وہی چہل پہل وہی رونق جو چند گھنٹے پیشتر تھی۔ پھر نظر آنے لگی۔ گوری چٹی لڑکیاں امریکن سولجر۔ ہندوستانی عورتیں۔ بوڑھے مرد بچے قہقہے ہنگامے۔ ناچ کود۔ زندگی۔ ان سب کا اجتماع پھر مال روڈ پر نظر آنے لگا۔ مجمع کی آمد پر وہ کم سن لنگڑا فقیر اپنی دائیں ٹانگ کو ڈنڈے پر ٹانگ کر آگے بڑھا۔

لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ۔

مگر کسی نے کچھ پرواہ نہیں کی۔ وہ برابر صدا لگاتا رہا۔ بابوجی لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ۔ گوری چٹی لڑکیاں۔ سولجر ہندوستانی عورتیں۔ قہقہے۔ ہنگامے۔ زندگانیاں۔ سب اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئیں مگر اُسے کوئی پیسہ نہیں ملا۔ آخرکار مال روڈ کی بے حرکت اور جامد زمین نے کہا۔ دیکھا تو نے یہ سارے قہقہے اور زندگانیاں مجھ سے زیادہ بے جان ہیں۔ تو مجھ سے پیسہ کیوں نہیں مانگتا۔ بنگال کی زمین سونا اگلتی ہے۔ یہ سب موت کے رنگین سائے ہیں۔ اُن کے پاس بجز ابدی نیند کے اور کچھ نہیں۔ یہ تجھے موت کی نیند دے سکتے ہیں۔ یہ تیرا باپ ہی اس نیند کے جھونکے کے لئے سویا ہے۔ تیرا دل چاہے تو تو بھی سو جا۔

اور وہ اپنی بغل میں مسودوں کا بنڈل دبائے تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ "لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ" یہ آواز اس کے کانوں میں اب بھی آرہی تھی۔ ایک بے جان اور بے اثر آواز کی طرح۔ جیسے دنیا میں آج تک اس کے معنی و مطلب پر غور نہیں کیا گیا ہے۔ لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ۔ لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ۔ اس کھوئی ہوئی مسلسل صدا کو نہ سننے کے لئے اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔ جب دنیا میں ان صداؤں کا کوئی وجود نہیں تو وہ اپنی سماعت کو کیوں خرچ کرے۔

آخ تھو۔ اُوپر کے مکان سے کسی نے گردن نکال کر تھوکا۔ یہ لے اکنی۔ اور دفع ہوجا۔ خبردار اب جو تیرے منھ سے آواز نکلی۔

لنگڑا اکنی مٹھی میں دبا کر خاموش ہوگیا۔ لائین کے قریب آکر اس نے ایک مرتبہ پھر بوڑھے لنگڑے فقیر کو غور سے دیکھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے جسم کو ٹٹولا۔ ہاتھ سرعت کے ساتھ سارے جسم میں گھوم پھر کر تہمد میں گھسی ہوئی اکنی پر رک گئے۔ اس نے پہلے وہ اکنی نکالی اور پھر لاش سے تہمد گھسیٹ کر چھین اور چلتا بنا۔

دوسرے دن شام کو مال روڈ پر پھر ہنگامہ۔ خوشیاں اور زندگانیاں اچھل کود رہی تھیں۔ وہ کم سن لنگڑا فقیر بھی اپنے اڈے پر آکر صدا لگا رہا تھا۔ "لنگڑے مجبور کو ایک پیسہ۔" پاس ہی سے ایک ہاکر نے چلا کر کہا۔ بنگال کی بھوک۔ قومی محاذ۔ تازہ پرچہ قیمت ایک آنہ۔ یہ بہتا ہوا ناسور اس وقت مال روڈ پر ہر شخص کے ہاتھ میں تھا اور سب اُسے چاٹ رہے تھے۔

اے ابر بہار آ

اندرجیت شرما

دنیا سے مٹاتا ہوا سب گرد و غبار آ   گلشن میں دکھاتا ہوا پھر نقش و نگار آ
لاتا ہوا اک شان سے بوٹوں پہ نکھار آ   ہوتا ہوا ہر برگ پہ ہر گل پہ نثار آ
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

تپتے ہوئے صحرا میں وہ اڑتے ہیں شرارے   غاروں میں درندے ہیں نہاں خوف کے مارے
انسان پسینوں میں شرابور ہیں سارے   دل بیٹھ گیا دھر کا اب کون ابھارے
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

چلتی ہیں شرر بار بلا خیز ہوائیں   طوفان لئے آتی ہیں خونریز ہوائیں
دلسوز جگر سوز ہیں کیا تیز ہوائیں   محشر سے بھی بڑھ کے ہیں غم انگیز ہوائیں
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

تہ خانوں میں راحت ہے نہ گھر میں کہیں آرام   تیر آتے ہیں اُڑ اُڑ کے شعاعوں کے لب بام
ہے صبح کہیں چین نہ تسکین سرِ شام   بیتاب ہیں شبنم کے لباسوں میں بھی گلفام
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

جو گھاس بھی میدان میں مرجھائی ہوئی ہے   کرنوں کی ہے روندی ہوئی ٹھکرائی ہوئی ہے
ہر دل کی کلی خوف سے کملائی ہوئی ہے   اس دھوپ میں ہر پھول کی موت آئی ہوئی ہے
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

وہ رنگ چمن دیدۂ حیراں کو دکھا دے   جو شانِ گلستاں کی بیاباں میں بنا دے
اک نہر محبت کی ہر اک سمت بہا دے   افسردگیٔ قلب میں جو آگ لگا دے
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

کیفیتِ سوزِ دل مضطر کو بدل دے   دوزخ کا نمونہ ہے یہ اس گھر کو بدل دے
جھلسے ہوئے بازار کے منظر کو بدل دے   جلتے ہوئے ہر بام کو ہر در کو بدل دے
اے ابر بہار ابر بہار ابر بہار آ
اے ابر بہار آ

محمد امین شرقپوری

رہرسل

اور تڑاق سے کوئی چیز اس کی گُدی پر پڑی۔
وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بات ہی گھبراہٹ کی تھی راہ چلتے اگر آپ کو ایسا ہی حادثہ پیش آجائے تو شاید آپ بھی یہی کرتے، قریب میں کوئی پیڑ بھی نہ تھا، عمارتیں بھی دُور کھڑی ہنس رہی تھیں، پھر یہ گولہ آسمان سے گرا یا کوئی چیل انڈا چھوڑ گئی، چوڑی سڑک بھی خاموش تھی، میرا مطلب ہے یوں تڑاق سے گرنے والی چیز کا کہیں سڑک پر دُور تک پتہ نہ تھا، شائد وہ گردن ہی میں گھس گئی ہو، دُکھتی ہوئی گردن کو سہل رہا تھا، کتابیں بغل سے نکل کر سڑک پر ہوا دے رہی تھیں، اور نہ اُس کا دماغ اپنے محور سے ہٹ گیا تھا۔ یہ معاملہ محوری طاقتوں کا نہ تھا اور نہ اتحادی ہی بر سرِ پیکار تھے۔

پھر...... پھر...... وہ کالج کی اسٹیج پر عنقریب کھیلے جانے والے ڈرامہ کا پارٹ یاد کرتا ہوا آ رہا تھا جس میں اُسے ہیرو بننا تھا، یوں تو ہیرو کا جنون گلی کے ٹکڑ پر بیٹھنے والے دیپو چمار سے لے کر کچہری روڈ پر بنگلے میں رہنے والے بابو رنگ بہاری وکیل اور نہ جانے کن کن پر مسلط ہو چکا تھا، مگر وہ تو سچ مچ بنگال ریلیف کے لئے ڈرامہ کھیل رہا تھا جس کی آمدنی کی ایک ایک پائی فاقہ کشانِ بنگال کو بھیجے جانے کی تجویز تھی۔

وہ دیپو کی پھڑکتی ہوئی رگ دبا کر بولا "دیپو جوتے پالش کرتے ہوئے یہ کیا گنگنایا کرتے ہو تم؟"

"کچھ نہیں بابوجی" وہ کسی قدر جھینپ کر بولا۔
"نہیں کچھ تو ہے"
"اجی یوں ہی آج کل ذرا بائیسکوپ دیکھتا ہوں، ایک دو گانے پسند آگئے ہیں"
"گانے پسند آگئے ہیں یا گانے والی"
دیپو دانت پھاڑ کر بولا "اجی رام رام. غریب میں اِتنی طاقت کہاں"
"تو پھر کیا بات ہے"
وہ برش والا ہاتھ تیزی سے چلاتے ہوئے بولا "تم جانو بابوجی دل کس کے نہیں ہوتا"
"آخر اگلوا لیا نا ہم نے" مسکراتے ہوئے جوتا پہن کر بولا۔

دیپو نے جیسے کوئی اَن ہونی بات کہہ دی تھی بابوجی کا مُنہ تک رہا تھا، اور وہ سوچتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ اسے پیٹ کی فکر ہوئی چاہیے اپنے اور گھر والوں کے پیٹ کی، کم بخت دن بھر میں مشکل سے دھیلی بارہ آنے کماتا ہوگا اور وہ سینما کی نذر ——!

بہاری لال کی کوٹھی آگئی، کالج سے آتے جاتے اُنہیں ٹہلتے ہوئے دیکھتا تھا، ٹہلتے اور گنگناتے ہاتھ پنٹ کی جیبوں میں ڈالے، کوئی کام دھندہ نہیں، انھیں کیا، ممکن ہے وکالت ٹھنڈی پڑ گئی ہو لے دے کر کام تھا تو گنگنانا، کم از کم وہ تو یہی دیکھتا تھا کبھی زیرِ لب اور کبھی کھلی آوازیں، کوٹھی کا طواف

کرتے ہوئے مُسکرا مسکرا کر! یہ جنسی بھوک کی وبا کے اثرات ہیں یا اخلاقی فقدان، بہرحال بیماری پھیل ضرور گئی ہے جھونپڑی سے لے کر محل تک غرض ہر جگہ اس کے مریض پائے جاتے ہیں، اور وہ پھر کے بقول "تم جانو بابوجی دل کس کے نہیں ہوتا، ہر جوان دل جنس لطیف کے تعاون اور عدم تعاون سے بُری طرح پریشان ہے، یہ تو جوان دلوں کی باتیں ہیں، بچے بھی لہک لہک گلیوں میں گاتے پھرتے ہیں۔ عرف عام میں بیداری عام ہے، سیاسی نہ سہی، جنسی ہی سہی، سوچتے ہوئے اس کا دماغ سینما کے پردوں پر رُک گیا! اظہار محبت کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے، گاگا کر ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش، محبت نہ ہوئی ناگ ہوا جس کے لئے بین بجانے کی ضرورت ہے، عجیب لغویت ہے، لغویت سے بھی ایک قدم آگے۔

اسے دوست کا قصہ یاد آگیا کہ کس طرح اُن کے پڑوسی کا بچہ ماں کا ہاتھ پکڑ کر جھوم جھوم کر گا رہا تھا، "تو ہے لیجاؤں جمنا پار"

ماں بچے کی معصومیت پر مُسکرا دی، باپ ڈانٹ کر بولا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے"

بچہ سہم کر بولا "کھیل میں ایسا ہی تو ہوا تھا ابّا!"

باپ دانت پیس رہا تھا کہ بچے کا کیا قصور ہے وہ خود ہی تو لے کر گئے تھے کھیل دکھانے۔

خود اُس کے ساتھ اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ پیش آیا تھا، ایک دفعہ ہال میں بیٹھے بیٹھے ایک لڑکی نے اچانک اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں، وہ گھبرا کر چونک پڑا، لڑکی جھینپ گئی، داہنے ہاتھ کی سیٹ پر اس کا شوہر بھی تھا، وہ شائد مغالطہ میں —— خیریت ہوئی کہ ہال میں بلیک آؤٹ تھا ورنہ سفت میں پٹ جاتا، "یہ لوگ جہنم میں کیوں نہیں گر پڑتے"

"وہ بولا خس کم جہاں پاک"

وہ گردن سہلاتے ہوئے کتابیں اُٹھانے کے لئے جھکا۔ پیچھے سے آواز آئی "بابوجی آپ کو چوٹ تو نہیں آئی"

وہ پلٹ کر بولا "آپ نے پتھر مارا ہے"

بڈھا ہمدردانہ لہجہ سے بولا "میں آپ کے کیوں مارتا ہماری چھوٹی بی بی نشانہ باندھ رہی تھیں، پستول ...."

"گولی چلائی تھی" وہ بات کاٹ کر بعجلت بولا۔

بڈھا ہنسی کو روک کر بولا "صاحب گولی نہیں تھی، نقلی پستول سے نشانہ بازی سیکھ رہی ہیں صبح سے آپ کو بے چین دیکھ کر بولیں"

چوٹ آگئی معلوم ہوتا ہے ——"

"اور آپ کو مزاج پرسی کے لئے بھیجا ہے" وہ منہ چڑا کر بولا۔ "اپنی چھوٹی بی بی سے کہدو کہ یہ نورجہاں کا زمانہ نہیں ہے"

"آپ سُن تو لیجئے" بڈھا مسکرا کر بولا "کالج میں کل رات ڈرامہ کھیلیں گی"

وہ چونک کر بولیں "کالج میں پڑھتی ہیں"

"ہاں صاحب وہی تو ہیں چھوٹی بی بی، ہم سب کو تعجب تھا کہ انہیں ہو کیا گیا ہے؟" اطمینان سے بولا۔

"چھوٹی بی بی کا کیا قصور، کالجوں میں تعلیم ہی ایسی دی جا رہی ہے کہ لڑکیاں لکھنے پڑھنے گانے بجانے کے ساتھ ساتھ پستول چلانا بھی سیکھیں"

"ہوں" کی آواز کے ساتھ وہ کتابوں کو جھاڑتا ہوا آگے بڑھ گیا، کئی بار جی میں آئی کہ پلٹ کر بڈھے سے کہدے کہ یہ اسی کی تحریک ہے۔ چھوٹی بی بی اس میں رول ادا کر رہی ہیں اور وہ خود بھی، پھر ڈرامے کا پلاٹ اُس کے ذہن میں امنڈ آیا، کہ آج کی جنگ میں مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی کھڑی ہیں۔ یہاں تک کہ بوقت ضرورت وہ اسلحہ کا استعمال بھی جانتی ہیں —— ! اور اس کی گردن میں درد کی ٹیس اٹھی وہ گردن سہلانے لگا اُس کے پاؤں کی رفتار نے اور تیزی پکڑ لی۔

گرمیوں کی رُت

عقیل احمد جعفری

اُجلے کنول کے پتے اور کالے کالے بھونرے
یہ سُرخ سرخ منقار اور سبز سبز طوطے
یہ غل مماکھیوں کا اور پھول یہ رسیلے
تربوز، خر بوزے، یہ شہتوت پکے پکے
ہاں فصل گرمیوں کی پھر آ گئی ہے شاید

انوار کا یہ عالم، یہ روشنی کی دُنیا
یہ رات خواب کی سی یہ دن خیال کا سا
یہ تارے چمکے چمکے یہ نیل گھرا گھرا
یہ چاندنی کا منظر یہ شام یہ سویرا
ہاں فصل گرمیوں کی پھر آ گئی ہے شاید

شفاف آسماں پر تاریکی ہلکی ہلکی
اُڑتے ہوئے پرندوں پر روشنی کرن کی
کمسن ہرن کی آنکھوں میں وحشت اچٹی اچٹی
تیری عقیل باتیں ان روز وں بہکی بہکی
ہاں فصل گرمیوں کی پھر آ گئی ہے شاید

حسنِ تخیل

حضرت صوفی دہلوی

آغوش نظر میں آسودہ جب اُن کی جوانی ہوتی ہے
ہر سانس میں عشقِ رنگیں کی منظوم کہانی ہوتی ہے

اِس تلخیٔ دوراں میں شیریں جب غم کی کہانی ہوتی ہے
تشریحِ محبت ہوتی ہے کہ تیشے کی زبانی ہوتی ہے

جب حُسن جواں ہو جاتا ہے جب شام جوانی ہوتی ہے
کچھ اشک عنایت ہوتے ہیں کچھ درد رسانی ہوتی ہے

لفظوں سے ٹپکتی ہے وحشت جملوں سے جنوں ہوتا ہے عیاں
روداد محبت کی لیکن لبریز معانی ہوتی ہے

وہ جس کے طلسمِ رنگیں پر بنیادِ زمانہ ہے قائم
کچھ میرا فسانہ ہوتا ہے کچھ ان کی کہانی ہوتی ہے

اِک بات زباں پر لاتے ہو کچھ ہم کو بتاتی ہیں نظریں
الفاظ سنائے جاتے ہیں تشریحِ معانی ہوتی ہے

اس کے لب نازک کی جنبش ہے خالقِ جذباتِ مستی
اِک موجِ تبسم لہرا کر طوفاں کی رَوانی ہوتی ہے

جب اپنی زباں پر ہنس ہنس کر لاتا ہوں وطن کا افسانہ
قدموں سے مرے غربت کی فضا کچھ اور سہانی ہوتی ہے

شیر محمد اختر

ذہنی الجھن

آدمی کی مثال موٹر کار کی ہے۔ اس کی جبلتیں اور جذبات کار کا انجن ہے۔ سوچ بچار اور عقل وہ کل پرزے ہیں جو ساری مشینری کو چلاتے ہیں۔ کار کو حرکت میں لانے کے لئے انجن سے طاقت پیدا ہوتی ہے۔ انجن جس قدر مضبوط اور طاقت ور ہوگا کار اسی قدر تیز دوڑے گی۔ لیکن کار کا تیز دوڑنا اسی حالت میں مفید ہوگا جب اسے اچھی طرح سنبھالا جائے ورنہ انجن کے پھٹ جانے کا خطرہ ہے۔ بالکل اسی طرح ہمارے رویئے اور برتاؤ کے پیچھے ہماری جبلت اور جذبہ کار فرما ہوتے ہیں۔ جس فرد میں جبلی اور جذباتی قوتیں زیادہ ہیں وہ زندگی میں بہت کچھ کر سکتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی تباہی کا بھی خطرہ رہتا ہے ہم طاقتور جبلت اور شدید جذبات کو نہ اچھا کہہ سکتے ہیں نہ برا۔ بلکہ یہ تو ان کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر عقل اور فکر کا قابو رہے تو یہی جذبات زندگی کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

ان اوراق میں ہم انھیں قوتوں پر روشنی ڈالیں گے۔ آپ ذرا پھر کار کی مثال کی طرف آئیں کسی رئیس کی کار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے آرام دہ بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے مخملی گدیاں خوبصورت رنگ و روغن، دیدہ زیب ڈیزائن کار سج دھج میں ایک دلہن سے بھی زیادہ حسین دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اگر اسی کار میں کچھ نقص واقع ہو جائے تو سب سے پہلا کام یہی کیا جاتا ہے کہ کار کا سب سے گندا حصّہ (انجن) کھول کر دیکھا جاتا ہے۔ شاید ایک نفیس الطبع انسان کے لئے اس حصے کا دیکھنا گراں گزرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کار کی رفتار اور حرکت کا سارا دارومدار اسی حصے پر ہے۔ بالکل اسی طرح جب ایک شخص کی زندگی میں کچھ خرابی واقع ہو جائے تو ہمیں سب سے پہلے اس کی جبلتوں اور جذبات کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ شاید یہ کام خوشگوار نہ ہو۔ اس کرید سے ناپسندیدہ مواد نکلے۔ لیکن خرابی کو معلوم کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہوگا۔

یہاں جبلت اور جذبہ کی تھوڑی سی تشریح ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جبلت اس فطری رجحان کا نام ہے جو ہم کسی ایک خاص امر کی طرف ظاہر کرتے ہیں اور پھر اس رجحان کے زیر اثر ہم سے خاص قسم کا فعل سرزد ہوتا ہے۔ اس فعل کے لئے ہمارے دل میں جو ردِ عمل ہوتا ہے، اس کا نام جذبہ ہے۔ جب کسی جبلت کو تحریک ملتی ہے تو ایک جذبہ بھی بیدار ہوتا ہے۔ جب ہم جبلی طور پر کوئی ردِ عمل کرتے ہیں تو اس وقت ہمارے جذبہ کی شدت بھی سکون پاتی ہے۔ ہمیں ایک تسکین محسوس ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر جبلی رجحان رک جائے تو ہمارے ذہن کے ایوانوں میں ایک ہل چل پیدا ہو کر ہمارے اعصابی نظام پر اثر انداز ہونے لگتی ہے۔ وہ جذبہ جو اس جبلت سے تعلق رکھتا ہے وہ پھر

دوسرے ذرائع سے اپنا اظہار کرنے لگتا ہے۔

آپ بازار میں سے گزر رہے ہیں کہ اچانک ایک شخص آپ سے الجھ پڑتا ہے۔ آپ کے اندر بھی جھگڑنے کی جبلت بیدار ہو کر غصّے کا اظہار کرتی ہے۔ اس اظہار کا صحیح مصرف تو یہ ہے آپ بھی اس شخص سے الجھیں۔ اگر آپ نے اس کو قرار واقعی سزا دے دی تو آپ کے غصّے کا جذبہ تسکین پا جائے گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور آپ کا غصہ دب گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ آپ اس کا اظہار کسی اور طریق سے کریں گے۔ آپ گھر پر جا کر بیوی بچوں یا نوکروں پر برسیں گے۔ یا کسی اور سے اُلجھ جائیں گے۔

اس مثال سے واضح ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات جب ہم ذرا ذرا سی بات پر خفا ہونے لگتے ہیں تو اس کا باعث وہ ذرا سی بات نہیں ہوتی۔ بلکہ ہمیں اپنے غصّے کے جذبے کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ جبلت اور جذبہ اظہار چاہتا ہے۔ اگر اس کا اظہار درست طور پر ہو گیا تو خیر، ورنہ رکاوٹ کی صورت میں اس جذبے کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ شاید وہ شخص جو اس شدت کا اظہار کسی اور طریق سے کر رہا ہے اپنے اس فعل سے واقف نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ ہے بھی یہ درست، کیونکہ افعال لاشعور کے تابع ہے۔ جذبات بھی لاشعور کی تہوں سے پیدا ہوتے ہیں۔

ہر ایک فرد میں مخالف رجحانات اُبھرتے رہتے ہیں۔ یہ رجحانات اکثر حالتوں میں اپنا اظہار صحیح طریق سے نہیں کر سکتے اور پھر بعض حالتوں میں یہ رجحانات متضاد بھی ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ذہنی الجھاؤ ہوتا ہے آج کل اسی ذہنی الجھاؤ پر کافی لکھا جا رہا ہے۔ بعض لوگ اسے غیر معمولی، غیر صحت مندانہ اور ناقابل قبول خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ذہنی الجھاؤ ایک فطری اور معمولی عمل ہے۔ انسان مجموعہ اضداد ہے۔ یہ ضدیں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں۔ پھر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی خاص الجھاؤ سے کچھ مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں جس ذہن میں یہ مشکلات پیدا ہوتی ہیں، اس کا مالک ان کو غیر صحت مندانہ طریق سے انھیں سلجھانا چاہتا ہے چند ایسے حالات دیکھ کر یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ ذہنی الجھن کا سلجھنا ممکن ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی الجھن اپنی ذات میں نہ ہی غیر معمولی ہوتی ہے اور نہ ناقابل قبول، کردار کی تشکیل کے لئے لازمی تو یہ ہے کہ ہم جذباتی زندگی پر قابو پا سکیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ہم ابتدا ہی سے جبلتوں اور جذبات پر بتدریج قابو حاصل کرنے کی سعی کرتے رہیں۔ زندگی کی کشمکش میں ہم اس وقت تک اپنے تئیں حالات کے ساتھ نہیں رکھ سکتے جب تک کہ ہم میں اپنے آپ پر قابو پانے کی کافی صلاحیت نہیں۔

ذہنی الجھن کا علاج کیا ہے —؟

سب سے پہلے ہمیں ذہنی الجھن کو دیکھنا ہوگا۔ اگر ایک جذبہ کمزور ہے اور دوسرا شدید تو اس سے الجھاؤ زیادہ نہ ہوگا۔ شدید جذبہ جیت جائے گا۔ اسکی مثال یوں ہے کہ مجھے راستہ چلتے چونی ملتی ہے میں نے ایک شخص کو ابھی دیکھا تھا کہ وہ کچھ جیب سے نکال رہا تھا۔ یہ چونی اسی کی ہوگی۔ میں فوراً اٹھا کر اسے دے دیتا ہوں۔ چونی اتنی چھوٹی رقم ہے کہ میں اس کے لئے بے ایمانی نہیں کر سکتا۔ اتنی حقیر سی چیز۔ پھر مجھے ڈر ہے کہ کسی نے مجھے دیکھ لیا تو —— میرے ذہن میں الجھن ہوگی۔ مگر معمولی اور ایک لمحے کے لئے میں چونی مالک کو دے دوں گا۔ بات ختم ہوئی لیکن اگر میں کسی ویران سی سڑک پر جا رہا ہوتا۔ مجھے وہاں نوٹوں کا بنڈل مل جاتا اور دیکھنے والا کوئی نہیں۔ اس صورت میں ذہنی الجھاؤ زیادہ ہوگا۔ اس دولت

کو اپنے پاس رکھنے کے لئے شدید جذبہ پیدا ہوگا۔ پہلی حالت میں تو چونی کی قیمت اتنی حقیر تھی کہ اُسے واپس کرنے کا جذبہ کامیاب رہا۔ لیکن یہاں رقم کی زیادتی، جذبے کی شدت دونوں شدید ہیں۔ اس لئے ذہن کی الجھن بھی زیادہ ہوگی اس پر فتح حاصل کرنا مشکل ہے۔

ذہنی الجھاؤ موجودہ تہذیب کا ایک جزو بن گیا ہے اس سلسلہ میں ماہرینِ نفسیات نے بڑی کاوش کی ہے۔ انسانیت کو اس الجھاؤ سے نکالنے کے لئے یہ لوگ بہت خدمت کر رہے ہیں۔ ان سب میں سے آخر اور زیادہ کام کرنے والے ڈاکٹر سگمنڈ فرائیڈ ہیں۔ انھوں نے لاشعور کے بارے جو تحقیقات کی ہے۔ اس کے ذریعے ہمارے ذہنی الجھاؤ کم ہو سکتے ہیں۔

ایک فرانسیسی طبیب (   ) ایک مریض کا حال بیان کرتا ہے ـــــ ایک غریب کسان لڑکی ایرین کو اپنی ماں سے بہت زیادہ محبت تھی ماں بیمار ہو گئی۔ لڑکی نے اس کی خدمت میں رات دن ایک کر دیا۔ لیکن ماں آخر مر گئی۔ ماں کی موت پر ایرین نے کوئی اظہارِ غم نہ کیا بلکہ حسبِ معمول کام میں مصروف رہی ایک عجیب بات یہ تھی کہ لڑکی کام کرتے کرتے رک جاتی پھر اس چارپائی کی طرف جاتی جہاں اس کی ماں بیماری کے ایام میں لیٹی رہی تھی۔ بستر کو درست کرتی اور بعض ایسی حرکات کرتی جو وہ ماں کی بیماری کے ایام میں کیا کرتی تھی۔ گویا وہ ابھی تک ماں کو زندہ سمجھ رہی تھی پھر وہ یہاں سے فارغ ہو کر اپنے کام میں لگ جاتی۔ اُسے یاد بھی نہ رہتا کہ وہ ابھی ابھی کیا کر رہی تھی۔

اس طبیب نے اس کا تجزیہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ لڑکی کو ماں کی موت کا اس قدر شدید صدمہ ہوا کہ وہ اُسے برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے اس نے اس صدمہ کو اپنے ذہن کے شعوری حصے سے ہی نکال دیا۔ اس نظریئے پر اس نے اور بہت سے تجربات کئے اور ذہنی الجھنوں کو سلجھایا۔

ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ نے ذہنی الجھن کا ایک باعث "دباؤ" کو بھی قرار دیا ہے
ایسے خیالات یا جذبات جنھیں ہم ناپسندیدہ سمجھتے ہیں وہ ہمارے شعور سے لاشعور میں جا کر دب جاتے ہیں۔ جب یہ جذبات یوں دبتے رہیں تو اس سے الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ یہ الجھن دور کرنا ہی اِن طبیبوں کا کام ہے ایسے تمام رجحانات اور جذبات جنھیں ہم اپنے شعور سے نکال دیتے ہیں وہ پھر بھی ہمارے افعال اور کردار پر اثر ڈالتے رہتے ہیں۔ بات یہ ہوتی ہے کہ جب ہم کسی جذبہ کا اظہار نہیں کر سکتے تو وہ جذبہ لاشعور ذہن میں دفن ہو جاتا ہے۔ اس جذبے نے اپنا اظہار تو ضرور کرنا ہوتا ہے۔ پھر وہ مختلف روپ دھارتا ہے۔ یہاں تک کہ خود شعور بھی اِن جذبات کی بدلی ہوئی صورت کو پہچان نہیں سکتا۔ ہر انسان اپنے بہت سے جذبات کو دباتا رہتا ہے اور پھر یہ دبے ہوئے جذبات کسی نہ کسی رنگ میں ہمارے کردار میں ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ اُن کی شکل مسخ شدہ ہوتی ہے اس لئے ہم اپنے افعال کی اصل وجہ کو نہیں جان سکتے۔

آپ نے بعض لوگوں کو دیکھا ہوگا۔ وہ جانوروں سے بیرحمی کا سلوک کرتے ہیں۔ انھیں ایسا کرنے میں ایک لطف آتا ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اُن کے اندر دُکھ دینے کا جذبہ ترقی کر گیا ہوتا ہے۔ سماجی قوانین انھیں اس جذبے کے اظہار سے روکتے ہیں۔ وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے جذبات کو دبائیں۔ یہ جذبات دب جاتے ہیں لیکن رکتے نہیں۔ بلکہ وہ دوسری شکل میں نمودار ہوتے ہیں وہی شخص اب جانوروں کو دُکھ دیکر راحت محسوس کرتا ہے۔

ذہنی الجھن دور کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ ناکامی کی تاویل کر لی جائے۔ اس کی بہترین مثال

لومڑی کا وہ قصہ ہے جس میں لومڑی نے اپنے دل کو یوں تسلی دے لی تھی کہ "انگور کھٹے ہیں"۔ زندگی کی تگ و دو میں جب کہیں الجھن پیدا ہو تو "تسلی" سے اس کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کافی حد تک اس ناکامی کے صدمہ میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

الجھن کے اظہار کا ایک اور طریق بھی ہے۔ وہ یوں کہ ہم اپنی الجھن کو دوسروں پر تھونپ دیں۔ ایک شخص کے دل میں بد دیانتی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ وہ خیال تقویت پکڑتا جاتا ہے۔ اب یہ شخص خیال کرنے لگے گا کہ ساری دنیا بد دیانت ہے۔ اس طرح وہ شخص اپنی عزت کو بچانے کے لئے دل کو تسلی دے گا۔ اس قسم کی الجھنوں والے لوگ دراصل بیماری کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ وہ بجائے اپنے اندر دیکھنے کے بیرونی دنیا میں اپنے مرض کو تلاش کرتے ہیں۔ اُن کے لئے سارا زمانہ برسرِ پیکار رہتا ہے۔ وہ چاروں طرف تباہیوں کو منڈلاتا دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب کیفیت اُن کے اپنے دل کی ہوتی ہے۔

ذہنی الجھن سے بچ نکلنے کا ایک اور بھی ذریعہ ہے اور وہ خیال کی دنیا ہے۔ جب کسی شخص کے لئے حقیقت کی دنیا ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ اپنے خیالوں کی دنیا آباد کر لیتا ہے۔ یہ دنیا کسی حد تک نہایت ضروری اور لازمی ہے۔ اس سے ذہنی الجھنوں کا مداوا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب زندگی کا سہارا صرف یہی خیالی دنیا بن جائے تو پھر ذہنی الجھن مرض کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے' والا قصہ بن جاتا ہے۔

ذہنی کشمکش میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے آپ کو سوچنا ہوگا۔ صرف فکر اور تدبر سے یہ الجھن دور ہو سکتی ہے۔ زندگی کے ہر فعل میں میانہ روی اس کا علاج ہے۔ اپنے آپ کو پہچاننا خود بخود الجھن دور کر سکتا ہے۔

تسنیم مینائی

دیہات کا ایک رخ

(۱)

شہرِ مستی کے زیادہ پُرخطر رستوں سے دُور — فرقہ واری کشمکش کے خوں بسر رستوں سے دور
کاروانِ صنعتیت کے معتبر رستوں سے دور — خودسری خود مطلبی کے کم نظر " "
بے بصر تقلید کے کورانہ تر " " — دہریت کے فتنہ زا و فتنہ گر " "
مکرِ ابلیسی کے پُراز مکر و شر " " — یعنی جلبِ سیم و زر کے مختصر " "
دورِ تہذیبِ نوی کے بیشتر رستوں سے دور

(۲)

صبح سے پہلے سحر کی رونمائی کا مقام — کاہلی و کید کی بے دست و پائی کا مقام
سادگی، اخلاص، ایماں آشنائی کا مقام — بے ریا انسانیت کی جلوہ زائی کا مقام
مسلکِ خدمت گزاری کی خدائی کا مقام — بے توقع بے صلہ حاجت روائی کا مقام
ہر تکلف، ہر تعیش کی گدائی کا مقام — ہر فلاطونی شغف کی جگ ہنسائی کا مقام
ہر بھلائی، ہر بُرائی، ہر اچھائی کا مقام

(۳)

دیت کی مصنوعیت سے نسبتاً کم آشنا — عفتِ دوشیزۂ فطرت کی محرم آشنا
انقلاباتِ جہاں کی زد سے پیہم آشنا — مہر کی کرنوں کے مرکز اور شبنم آشنا
زندگی کی راحتوں سے دائماً کم آشنا — شادمانی سے بہ مشکل خفتِ غم آشنا
سارے عالم سے الگ رہ کر بھی عالم آشنا

(۴)

بھائی چارے کے بنوالجمیل ملت کے حرم — خالص و بے لوث، بے پایاں محبت کے حرم
شوق کی آزردگی و حرماں نصیبی کے حرم — عشرتِ سرمایہ داری سے مصیبت کے حرم
شہرِ بے علمی و بے تقدیسِ عصمت کے حرم — جوہرِ پاکیزگی، شانِ شرافت کے حرم
یعنی اصنامِ عروجِ آدمیت کے حرم

(۵)

یاں کوئی تخصیصِ خاص و عام کی جاتی نہیں — قدرِ انساں باجلوسِ نام کی جاتی نہیں
صاف گوئی، موردِ الزام کی جاتی نہیں — گفتگو ابہام در ابہام کی جاتی نہیں
سرفرازی بر اصولِ عام کی جاتی نہیں — جائداد اس جا بڑے کے نام کی جاتی نہیں
ٹال کر کر سحر کو شام کی جاتی نہیں — چاکریِ گردشِ ایام کی جاتی نہیں
دشمنی سے شہرتِ الزام کی جاتی نہیں — یاں کبھی عورت یونہیں بدنام " "
کام ہوتے ہیں، نمودِ کام کی جاتی نہیں

(۶)

کچھ خبر بھی ہے تجھے اے گردشِ لیل و نہار
کون پلتا ہے بہ ایں گہوارہ ہائے روزگار
کس کے ارمانوں امیدوں کے ہیں یہ زندہ مزار
کس کی محنت خاک ہوتی ہے بہ ایں دشت و دیار
آفرینش سے ہیں جو سرمایہ داری کا شکار
ہاں مگر عہدِ عروجِ مذہبِ تقوے شعار
خلق کے جینے کا ہے جن کی ریاضت پر مدار
یاد کرتی ہے جنھیں دنیا بہ اسمِ کاشتکار
"ارتقا کے پیشوا" تہذیب کے پروردگار
رہ نہیں سکتے بہت دن چاکرِ سرمایہ دار
ہوشیار اے عہدِ موجودہ کے قارونو ہوشیار

"پاگل"

"دھوکا"

رفیق نے اپنا رنگین جام محمود کے جام سے ٹکراتے ہوئے "چیئرز"۔ کہا اور آدھا گلاس چڑھانے کے بعد اپنے سر کے پیچھے کے گھنے اور لانبے بالوں میں بائیں ہاتھ کی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب تک ہندوستان میں عورتوں کو مکمل آزادی نہ دی جائے۔ ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا"

محمود نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے نہایت ہی خطیبانہ انداز میں جواب دیا۔

دوست ہمارے بیوقوف لیڈروں نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ عورتوں کی آزادی سے ہندوستانی قومی تحریک کو کس درجہ تقویت پہنچ سکتی ہے؟ پردہ، برقعہ، مکان کی چار دیواری جہالت، توہم پرستی، اور معاشی غلامی نے عورتوں کو اس قدر نکما، بزدل، اور ناکارہ کر دیا ہے کہ قومی زندگی میں ان کا وجود ایک بارگراں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور

(شراب کے دو گھونٹ پی کر)

جب تک عورتوں کو عام انسان کی کاروباری سطح پر نہ لایا جائے جب تک عصمت و حیا کے قدیم اور فرسودہ تصوّرات کا خاتمہ نہ کیا جائے، معاشرہ کی تنظیم جدید ممکن نہیں"

محمود جس پر نشہ کی کیفیت آہستہ آہستہ طاری ہو رہی تھی، اپنے گلاس کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے کرسی سے کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔

ایمان کی بات تو یہ ہے ــــــ

رفیق نے فوراً محمود کا جملہ کاٹتے ہوئے کسیقدر برہمی کے انداز میں کہا "پھر وہی ایمان کی بات ــ ہزار بار کہہ چکا کہ ایسے فرسودہ اور مہمل الفاظ کو استعمال نہ کیا کرو مگر تم ہو کہ وہی ایمان کی بات ــــ وہی خدا کی قسم ــــ سن لو اور کان کھول کر سن لو کہ اگر تمہیں معاشرہ میں مکمل انقلاب پیدا کرنا ہے تو ان تمام الفاظ، خیالات اور روایات کو یک لخت ترک کر دینا پڑیگا جن سے قدامت اور جہالت کی بو آتی ہے"

"یار تم تو عجیب آدمی ہو" محمود نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا "بات بات پر بگڑ جاتے ہو۔ پرسوں ہی تو میں نے انقلاب پسند جماعت کا رکن ہوا ہوں۔ اور دو ہی دن میں تم چاہتے ہو کہ میں ترقی پسندی کے تمام مراحل طے کر لوں ــــــ

خیر چلو اٹھو بھی رات زیادہ ہو رہی ہے"

اس پر رفیق نے اٹھ کر شراب کا بل ادا کیا اور پھر اسی موضوع پر محمود سے گفتگو کرتے ہوئے

باہر کا رُخ کیا ——
"سچ کہتا ہوں محمود کہ میرا بس چلے تو
میں تمام دنیا کی عورتوں کو ہر قسم کی
آزادی عطا کر دوں، اور دنیا کو
بتا دوں کہ ایک آزاد عورت سوسائٹی
کی ترقی میں کتنا زبردست حصہ لے
سکتی ہے مگر ——"
ابھی یہ جملہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ
محمود نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھدیا
رفتار دھیمی کر دی اور آہستہ سے
کان میں کہا "دیکھنا رفیق وہ سامنے
ٹانگہ میں کیا قیامت ——"
رفیق "قیامت، کہاں، کیسی ——"
محمود۔ تم تو بالکل بیوقوف ہو یار —— ارے
وہ کیلہ ہے (ایک ٹانگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
جو پیکاجی ہوٹل سے کیقدر فاصلہ پر کھڑا تھا۔)
ٹانگے میں ایک ایرانی بھکارن پچھلی نشست
پر بیٹھی ہوئی تانگہ والے سے دبی زبان میں کچھ گفتگو
کر رہی تھی۔ ٹانگہ والا سیندھی کے نشہ میں چور تھا۔ ایک
نہایت ہی شریف وضع قطع کے نوجوان فٹ پاتھ پر
ٹہل رہے تھے۔ مگر ان کی نظریں ٹانگہ پر گڑی ہوئی تھیں
—— تھوڑی دیر کے بعد نوجوان بھکارن ہنستی ہوئی
ٹانگہ سے اُتر پڑی۔ ٹانگہ حامد شاپ کے چوراہے کی طرف
بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ شریف وضع
قطع کا نوجوان اس میں سوار ہوگیا اور ٹانگہ تیزی سے
ویران سڑک پر دوڑنے لگا۔
رفیق اور محمود جو پیکاجی ہوٹل کے گیٹ کے
پاس سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، اپنے چاروں طرف
نظریں دوڑا کر اور اس کا اطمینان کرکے کہ اب اُن کے
سوا سڑک پر اور کوئی نہیں ہے، بھکارن کی طرف بڑھنے لگے۔
بھکارن کے چلنے کا انداز بتلا رہا تھا کہ وہ خود چاہتی ہے کہ
کوئی اس کا تعاقب کرے۔ جب یہ دونوں اس سے
دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر رہ گئے تو رفیق نے کہا۔
خدا کی قسم دوست، اسوقت مزہ ہی آجائے
اگر یہ گھٹ جائے —— کہیں ایسا نہ ہو کہ دو کو دیکھکر
چمک جائے؟
"تم نسیم کے مکان پر میرا انتظار کرو۔
میں انشاء اللہ اس کو ابھی لے کر
وہیں آتا ہوں، مگر دیکھو بھئی میرے
پاس پیسے نہیں ہیں" محمود نے
اس کو سڑک پر روک کر کہا ——
اُنہہ، تم پیسوں کی فکر مت کرو ——
مگر ہاں جلدی کرو۔ یہ کہتے ہوئے
رفیق ایک گلی میں مڑ گیا۔

. . . .

کچھ عرصہ کے بعد محمود ایرانی بھکارن کو اپنے
ہمراہ لئے ہوئے اسی گلی میں جاتا ہوا دکھائی دیا جس
میں رفیق گیا تھا۔

(۲)

رات کے پانچ بجے جب کہ حامد شاپ کا سکوت
ایک آدھ موٹر کے گزرنے سے ٹوٹ جاتا تھا ——
محمود اور رفیق اسی گلی سے نکل خرامیہ ہوٹل کی طرف
جا رہے تھے۔ رفیق محمود سے کہہ رہا تھا کہ
"جب تک عورتوں کو آزادی
نہ دیجائے ہندوستان آزاد
نہیں ہو سکتا"

خلیل الرحمان قمر نعمانی کلیانوی

"عشق کیا ہے؟"

باوجودیکہ ہر صغیر و کبیر۔ عالم و جاہل۔ الفاظ عشق محبت، الفت، کا استعمال کرتا ہے! لیکن حقیقت سے کوئی باخبر نہیں! عشق ایک ایسا معمہ لاینحل ہے کہ گو اس کے کشتہ ہر قرن اور ہر دور میں ملیں گے! مگر سلف سے خلف تک کوئی اس کی حقیقی تعریف نہیں کر سکا! علماء! حکماء! عقلاء! شعراء! مرد! عورت! ہر ایک نے اس کی تعریف کی ہے! مگر حقیقت کو کوئی واضح نہ کر سکا! اور نہ امید ہے کہ آئندہ اس کی حقیقی تعریف ہو سکے! گو "عشق" کا لفظ قرآن و حدیث مین ذکر نہیں آیا مگر محبت! اور تالیف! کا ذکر قرآن شریف! میں بھی ہے! اور احادیث مقدسہ میں بھی! اور میرا خیال ہے کہ محبت و الفت کی زیادتی ہی کا دوسرا نام "عشق" ہے! جب انسان اول اول کسی ایسی چیز کو دیکھتا ہے جو اس کی نظر میں خوبصورت اور حسین ہو تو اس وقت اس کے دل میں اس حسین شئے کی پسندیدگی کے ساتھ دلداری۔ و حفاظت کا خیال پیدا ہوتا ہے! میں اس کو "الفت" کہتا ہوں! کچھ دنوں بعد حفاظت و دلداری سے بڑھکر جذبہ فداکاری پیدا ہو جاتا ہے انسان چاہتا ہے کہ اسکا محبوب! اس پر حکمرانی کرے! اور وہ چاکروں کی طرح تعمیل! وہ محبوب کی آنکھ میں آنسو! چہرے پر آثار غم! اور کبیدہ خاطری! نہیں دیکھ سکتا! خوشنودی محبوب کے سوا اس کی کوئی خواہش ہی نہیں ہوتی! بشرطیکہ وہ "بوالہوس" نہو! اس سب کے باوجود اسے احساس رنج و غم! مسرت و شادمانی! رہتا ہے! یہ دور "محبت" ہے (میرے نزدیک) اور جب انسان کسی شئے کی محبت میں احساس رنج و مسرت سے بھی بیگانہ ہو جائے! کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسے جلوۂ محبوب نظر آئے! اور اک جلوہ محبوب کے سوا۔ دنیا بھر سے بیگانہ ہو جائے! یہانتک کہ اپنی ہستی تک فراموش کر دے۔

میں سمجھتا ہوں یہ "عشق" ہے!

بہت ممکن ہے میرے اس نظریہ کا کوئی جز غلط ہو! یا سارا نظریہ ہی غلط ہو! مگر اس غلطی کے جانچنے کا معیار کیا ہوگا؟ عشق کی صحیح تعریف! اور یہ محال ہے!

عاشق کا دل معشوق کی مٹھی میں! اس طرح ہوتا ہے جس طرح موٹر ڈرائیور کے ہاتھ میں اسٹیرنگ! موٹر کا آہستہ چلانا تیز کرنا! موڑنا۔ سیدھا چلانا۔ سب اسٹیرنگ پر موقوف ہے اور اسٹیرنگ ڈرائیور کے قابو میں! اسٹیرنگ ایک جماد محض ہونے کی وجہ سے از خود حرکت سے مجبور ہے مگر عاشق کا دل باوجودیکہ وہ جماد نہیں! خود متحرک ہو سکتا ہے! مگر پھر بھی جماد محض کی طرح دوسرے کا محتاج! اب یہ سوال کہ عشق محمود ہے یا مذموم! تو جن کی نظروں میں عشق و محبت غیر اختیاری ہے ان کے لئے تو محمود و مذموم کی

تفصیل ہی فضول ہے! جیسے غالب کا نظریہ کہ:۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے!

لیکن جن حضرات کا نظریہ یہ ہے کہ عشق و محبت دوسرے تمام اُمور کی طرح اختیاری ہیں اُن کے لیے یہ تفصیل ہو سکتی ہے کہ عشق و محبت! اگر اپنے محل کے ساتھ ہے تو وہ محمود ہے! بے محل ہے تو مذموم!

عشق و محبت کا اصلی محل میرے نزدیک ذات باری تعالیٰ جل مجدہٗ ہے! خدا کے عاشق کا عشق سچا اور کامیاب ہے! غیر خدا کا عشق اصلی نہیں ہو سکتا! زیادہ سے زیادہ اس کو "نقل مطابق اصل" کہہ سکتے ہیں! عین اصل نہیں کہہ سکتے!

بہت ممکن ہے کہ بعض معزز ناظرین یہ اعتراض فرمائیں کہ بعض اوقات عشق مذموم ہی عشق محمود بن گیا ہے! اور عاشق مجازی! عاشق حقیقی ہو گئے! تو میں عرض کرونگا! کہ اس قسم کی مثالوں کا وجود اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ان کو مستثنیات میں شمار کیا جا سکتا ہے! اور ایسے واقعات بہت ہی شاذ گویا کالمعدوم! اور پھر یہ تبدیلی بھی بہ مشیت ایزدی ہوئی! نہ کہ عشق مجازی کا عشق حقیقی کا زینہ ثابت ہوتا! اگر بعض حضرات کے اس نظریہ کو مان لیا جائے کہ عشق مجازی ہی ترقی پا کر عشق حقیقی بن جاتا ہے! تو یہ ایسا دعویٰ ہوگا جس کی کوئی دلیل نہیں! اور اس کے خلاف بہت سے شواہد پیش کئے جا سکتے ہیں!

مثلاً! لیلیٰ مجنوں! شیریں! فرہاد! نل! ودمن! ہیر! رانجھا! کہا جاتا ہے کہ ان کا عشق حد کمال کو پہنچا ہوا تھا! لیکن باوجود اس کمال عشق کے انہیں عشق معبود حاصل نہ ہو سکا! وہ عاشق لیلیٰ وغیرہ کہلائے مگر انہیں "عاشق رب" کوئی نہ کہہ سکا! وہ "عاشق کامل" کہے جا سکتے ہیں "عاشق حقیقی" نہیں کہہ سکتے! مجنوں کا عشق اگر عشق حقیقی ہوتا تو جب لیلیٰ کی شادی غیر سے کر دی گئی۔ تو وہ موقعہ تھا کہ عشق مجازی آخری زینہ پھاند کر عشق حقیقی کا قالب اختیار کر لیتا! مگر ایسا نہ ہوا! اِس لئے قطعی طور پر بطور قاعدہ کلیہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عشق مجازی انجام کے اعتبار سے عشق حقیقی ہوتا ہے! اور جب تک عشق مجازی! اور عشق حقیقی دو جدا جدا عشق تسلیم کئے جائیں گے۔ محمود و مذموم کی تفصیل بھی جاری رہے گی! اور یہ تفصیل صحیح سمجھی جائے گی!

مسلمان عاشق کے لئے: خدا۔ رسول۔ مذہب! یہ تین محبوب ہیں! ان سے محبت! محبت محمود کہلائیگی! اور ان کی محبت کے ماتحت! لوازم زندگی سے محبت مباح! مثلاً اولاد! حلال طریقہ پر پیدا کیا ہوا مال و دولت! لیکن اگر اسی مال و اولاد کی محبت میں اِس قدر غلو کیا جائے! کہ خدا۔ رسول۔ مذہب کی محبت بجائے تابع کے متبوع ہو جائے! تو یہی محبت مذموم ہو سکتی ہے! اور ہر وہ محبت جو حکم خدا۔ رسول۔ مذہب کے خلاف ہو مذموم ہوگی!

میں ایسی تفصیلات میں گھس آیا ہوں جن کو واضح طور پر سلجھانے کی اپنے اندر اہلیت نہیں رکھتا اس لئے میں اپنے مقصد کی طرف لوٹتا ہوں! میرا مقصد یہ تھا کہ عنوان مضمون ہذا پر علماء، حکماء، صوفیاء، شعراء کے نظریات پیش کروں! اسی سلسلہ میں میں نے اپنا نظریہ بھی گو وہ کوئی وقعت نہیں رکھتا پیش کر دیا! اگرچہ وہ ذرا طویل ہو گیا!

ارشاد نبوی ﷺ سے واضح ہوتا ہے کہ عشق و محبت کی اصل وہ روحانی تعلق ہے جو روز ازل ارواح کے اندر کھد یا گیا۔ (مشکوۃ شریف)

فاروق اعظمؓ۔ عشق عذاب کی ایک قسم ہے اور کوئی عقلمند بلا کو اپنے اوپر مسلط کرنے کے واسطے تیار نہیں ہوتا عشق غیر اختیاری چیزوں میں سے نہیں! (حضرت عمرؓ)

آپ کے ارشاد سے واضح ہوا کہ عشق اختیاری ہے! اور جب وہ غیر محل ہو تو عذاب کی ایک قسم ہے! یعنے مذموم! ورنہ خدا۔ رسول۔ مذہب، کا عاشق حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ سے بڑھکر کون ہو سکتا ہے!

لغت میں عشق کے معنے ہیں "بسیار دوست داشتن چیزے" (کسی چیز کو بہت دوست رکھنا!) اور عشق ماخوذ ہے "عشقۃ" سے اور "عشقۃ" ایک بیل کا نام ہے وہ جس درخت کو لپٹتی ہے اُسے خشک کر دیتی ہے! یہی حالت عاشق کی ہے وہ جس کے دل پر قابو پاتا ہے صاحبدل کو خشک و زرد کر دیتا ہے!

بقراط:۔ عشق ایک طمع کا نام ہے جو قلب میں پیدا ہوتی ہے اور اس میں ایک حصہ حرص کا جمع ہو جاتا ہے!

:۔ عشق کسی ذات کے خیال وصال پر خوش ہونیکا نام ہے اور شوق اس کی حرکت ہے۔

ارسطو:۔ محبوب کے عیوب سے اندھا ہونے کا نام عشق ہے!

غیر معلوم حکیم:۔ عشق اس خواہش کا نام ہے جو دل میں پیدا ہوکر اور پرورش پاکر قلب میں حرص کا بہت سا مواد جمع کر دیتی ہے اور جب کبھی یہ خواہش زیادہ ہو جاتی ہے تو عاشق اضطراب و حرص اور لالچ کے ہاتھوں بہت پریشان ہو جاتا ہے۔ یہانتک کہ یہ پریشانی رنج و قلق میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس وقت سودا کی زیادتی یا صفرا کی شعلہ انگیزی سے خون کھولنے لگتا ہے چونکہ سودا کی طبیعت میں یہ بات داخل ہے کہ قوت متفکرہ کو خراب کر دے اور قوت متفکرہ کی خرابی عقل کو ضائع کر دیتی ہے! اس لئے آخرکار فضول تمنائیں عاشق کو مجنون بنا کر چھوڑتی ہیں جب عاشق اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو کبھی خودکشی کر لیتا ہے کبھی رنج میں جان کھو دیتا ہے کبھی حسن جاناں کی نظارہ بازی کرتے ہوئے خوشی کے مارے مر جاتا ہے کبھی اس طرح درد سے کراہتا ہے کہ رُوح سینہ میں گھٹ جاتی ہے۔

افلاطون:۔ عشق حرارت غریزیہ کی اس قوت کا نام ہے جو شہوانی تخیل آفرینیوں اور خیالی تصویروں سے پیدا ہوتی ہے اس کا نشو و نما فطری قویٰ کے سانچے پر ہوتا ہے اور ہر ایک کو اس کی فطرت کے خلاف دوسرے رنگ کا لباس پہنا دیتا ہے یہانتک کہ یہ نفسانی مرض اور جنون شوق ہوکر اتنا سخت بیمار کر دیتا ہے کہ اس کی دوا صرف موت رہ جاتی ہے اور کچھ نہیں!

جالینوس:۔ محبت روح کا ایک فعل ہے اور یہ روح اعضاء رئیسہ میں چھپی ہوئی ہے جب یہ فعل قوت اور کافی اثر پیدا کر لیتا ہے تو دل و دماغ اور جگر خراب ہو جاتے ہیں۔

(جالینوس)

فارابی:۔ عشق نصف، بیماریوں کا مجموعہ ہے اور نصف جنونوں کا! اور وہ سب رنجوں سے بڑا رنج ہے۔ عشق بہ نسبت تمام امراض کے نصف کی حیثیت رکھتا ہے! اور یہ بالکل کھلی بات ہے اس لئے کہ روح لطیف ہے اور جسم کثیف۔ تمام بیماریاں جسم میں پیدا ہوتی ہیں اور محبت روح سے! اور اس میں شک نہیں کہ لطیف کا لطیف میں پیوست ہو جانا جلد اور طاقت کے ساتھ اثر جما لیتا ہے! اور اسی کے قریب قریب لطیف کا کثیف میں سرایت کرنا ہے جیسے کہ بخار کا ہڈیوں میں بیٹھ جانا۔ اس کے بعد کثیف کا کثیف میں

اثر کرنے کا نمبر ہے ! مثلاً فالج کا کسی عضو پر گرنا!

ابن خلکان مورخ :- عشق موت کا ایک گھونٹ ہے اور بربادی کے باغوں میں ایک چھوٹا سا باغیچہ !
محبت نظر آنے اور نہ آنے دونوں سے کہیں دُور ہے ! محبت چقماق جیسی چنگاری ہے جو سینوں میں پوشیدہ ہے۔ اگر چوٹ لگے تو چمک اُٹھے اور اگر نہ لگے تو چھپ جاتی ہے !

عرب کی ایک خاتون :- مسکین عاشق ہر چیز اس کی دشمن ہے ! ٹھنڈی ہوائیں اُس کو بے چین کرتی ہیں بجلی کی چمک اس کی نیند اڑا دیتی ہے ! آثار دیار اس کے قلب میں آگ بھڑکاتے ہیں۔ لوگوں کی ملامت اس کو ایذا پہنچاتی ہے ! یادِ محبوب اس کو بیمار کر دیتی ہے۔!

ایک بدوی عورت :- محبت میں عقل جاتی رہتی ہے جسم گھٹنے لگتا ہے آنسو خاموشی کے ساتھ بہنے لگتے ہیں ہر نیا دن محبت میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے ! اور محبت معشوق کی بے رُخی سے نہ بالکل ختم ہے نہ کم !

تمیمی :- عشق نہ عاشقوں کے اختیار سے ہوتا ہے اور نہ اُن کی خواہش سے ! بلکہ عاشق ہونا ایسا ہی ہے جیسے مہلک بیماریوں میں گرفتار ہو جانا۔ اِس میں اور اِس میں رتی برابر فرق نہیں !

ابو وائل :- محبت اگر انتہائے دیوانگی یا اس کی قسم سے نہیں تو جادو کا نچوڑ تو یقینی ہے ! محبت نام ہے معشوق کے ساتھ دل کے بلا واسطہ متعلق ہو جانے کا !

صوفیائے کرام

شہاب الدین نوری رح :- سب سے پہلے جذبۂ پسندیدگی پیدا ہوتا ہے اُس کے بعد قرب و نزدیکی کی خواہش پیدا ہوتی ہے جو صحبت میں تبدیل ہو جاتی ہے اِس کے بعد محبت ہوتی ہے پھر درجۂ ہوتی ہے اور اُس کے بعد عشق کا !
لیکن عشق آخری منزل نہیں ہے کیونکہ عشق بڑھ جانے کے بعد "تیتّم" ہو جاتا ہے اور "تیتّم" میں زیادتی ہونے سے والہ کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور جنون کا درجہ غالباً "والہ" کے بعد ہے !

جنید بغدادی رح :- عشق محبت سرمدی ہے جسے خدا کی مہربانیاں ہر جاندار کو عطا کیا کرتی ہیں !

شعراء

جامی رح :- گہے فرزانہ را دیوانہ سازی
گہے دیوانہ را فرزانہ سازی

نامعلوم الاسم :- بہ نازم بہ بزم محبت کہ آنجا
گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

" " :- عاشقی چیست؟ بگو بندۂ جاناں بودن
دل بدستِ دگرے دادن و حیراں بودن

" " محبت جادۂ دارد دروں خانہ دلہا
چو تار سبحہ گم گردیدایں رہ زیر منزلہا

" " من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانم
کہ عشق از پردۂ عصمت بروں آرد زلیخا را

" " عشق آں خانماں خرابے ہست
کہ ترا آورد بخانۂ ما

نا معلوم الاسم :- اگر دانستم از روز ازل داغ جدائی را
نمی کردم بدل روشن چراغ آشنائی را

حافظ :- ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عراقی :- بہ عالم ہر کجا درد و غمے بود
بہم کردند و عشقش نام کردند

طالب :- عشق در اول و آخر ہمہ درد است و بلا
ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

ناصر علی :- عشق عالم سوز را با کفر و ایماں کار نیست
گردن ما در تمیز سبحہ و زنار نیست

حیدر تبریزی :- چو ایزد اشک از دل آہ درد آلود می خیزد
بلے چوں آب بر آتش بریزد دود می خیزد

غنی :- جنونے کہ از قید خرد بیروں کشم پا را
کشم زنجیر پائے خویشتن دامان صحرا را

غالب :- عشق بے ربطی شیرازۂ اجزائے حواس
وصل زنگار رخ آئنہ حسن یقین

سر اقبال :- نہ ہر کس را محبت مایہ دار است
نہ با ہر کس محبت سازگار است
بروید لالہ با داغ جگر تاب
دل لعل بدخشانے شرار است

غالب :- عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

داغ :- رہ رو راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

آتش :- جام شراب عشق سے دونوں ہیں بے خبر
بلبل چمن میں مست ہے ہم کوئے یار میں

" یہ کیفیت اسے ملتی ہے ہو جس کے مقدر میں
مئے الفت نہ خم میں ہے نہ شیشے میں نہ ساغر میں

میر :- چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے
اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

شیفتہ :- شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

یقین :- روداد محبت کی مت پوچھو یقین مجھ سے
کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ!

خلیل :- اک نازک ہو رشتۂ الفت
ٹوٹتا ہے یہ تار مشکل سے

مفتی صدرالدین :- اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

اصغر:۔ میں کیا کہوں کہاں ہے محبت کہاں نہیں
رگ رگ میں دوڑی پھرتی ہے نشتر لئے ہوئے

جگر:۔ یاد ہے آجتک مجھے پہلے پہل کی رسم و راہ
کچھ اُنہیں اجتناب سا کچھ مجھے اِحتمال سا

جگر:۔ شروع راہ محبت اَرے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

احسن:۔ یہ دو رنگی تیری عشق فتنہ زا اچھی نہیں
ابتدا اچھی ہے کہیں اِنتہا اچھی نہیں

سیماب:۔ دیوانگی عشق بڑی چیز ہے سیماب
یہ اس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

جوشش:۔ موت ہے دلگی اور تنگا ہوں کی
عشق پاداش ہے گنا ہوں کی

احسان:۔ وہ درد ہوں کہ جس کی میسر دوا نہیں
وہ حال ہوں جو قابل شرح بیان نہیں

آفت:۔ اہل ظاہر کہتے ہیں جس عشق کو آزار جاں
فی الحقیقت ہے وہی آرام جانِ اہلِ دل

نسیم:۔ اَشک آنکھوں میں، جگر میں درد، سوزش دل میں ہے
اِک محبت کی بدولت گھر کا گھر مشکل میں ہے

ماہرالقادری:۔ دریائے محبت میں وہ کشتی ہے نہ ساحل
اسے جرأت ناشاد کسے ڈھونڈ رہی ہے

ماہرالقادری:۔ وہ ابتدائے عشق بھی کیا دلفریب تھی
جس نے آل کار سے غافل بنا دیا

〃 تم کو رسوا کر نہ دیں ماہر کہیں
چاندنی راتوں کی یہ تنہائیاں

ماہرالقادری:۔ شایان مقام رہن و دار ہمیں تھے
معراج محبت کے طلبگار ہمیں تھے

نامعلوم:۔ لوگ کہتے ہیں محبت میں اثر ہوتا ہے
کون سے شہر میں ہوتا ہے کدھر ہوتا ہے

نامعلوم:۔ عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

نامعلوم:۔ یہ دونوں ایک ہی ترکش کے ہیں تیر
محبت اور مرگ ناگہانی

نامعلوم:۔ کیا بری چیز ہے محبت بھی
بات کرنے میں آنکھ بھر آئی

〃 گرفتار محبت بھی کہیں آزاد ہوتے ہیں
محبت جس کو کہتے ہیں وہ اِک زنجیر ہوتی ہے

نامعلوم:۔ اَب یہ جانا کہ اِسے کہتے ہیں آنا دِل کا
ہم ہنسی کھیل سمجھتے تھے لگانا دل کا

〃 کبھی رونا کبھی ہنسنا کبھی حیران رہنا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

نا معلوم الاسم:- بچتا نہیں ہے جو کہ ہے بیمار عشق کا
یا رب نہ ہو کسی کو یہ آزار عشق کا

" جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

نا معلوم:- دیکھئے کیا ہو مآل عاشقی
اِنتہائے سوز سے آغاز ہے!

نا معلوم الاسم:- معلوم جو ہوتا ہمیں انجام محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نام محبت

" ہم نے پالا مدتوں پہلو میں ہم کچھ بھی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر اور دل تمہارا ہو گیا

" عشق کیا ہے؟ خیال کی معراج!
حسن کیا ہے؟ نظر کی پستی ہے!

ماہر القادری

شہیدِ کربلا

رسول اللہؐ نے حضرت حسینؓ کو بارہا "میرا حسینؑ" فرمایا ہے اِس نسبت خاص کے پیش نظر نعتِ رسولؐ اور منقبتِ امام کی یکجائی حسنِ موضوع سمجھی جائے گی ——— عقیدت کے اُن گلدستوں کے ساتھ خونِ دل کے چند قطروں کی بھی ضرورت تھی؟
زچشم آستیں بردار و گوہر زا تماشا کن

اَجل کو دیکھ کے جب مُسکرا دیا تو[1] نے
حنین و بدر کا منظر دِکھا دِیا تو نے

ہے زِیبِ صفحۂ تاریخ تیری قربانی
خدا کی راہ میں سب کچھ لٹا دیا تو نے

فرات دے نہ سکی گرچہ دادِ تشنہ لبی
مگر خلوص کا دَریا بہا دیا تو نے

ترے نثار کہ شہ رگ کا خون ٹپکا کر
خدا کے دیں کا چمن لہلہا دیا تو نے

رہیگا یاد جہاں کو ثباتِ عزم ترا
ملوکیّت کا قدم ڈگمگا دیا تو نے

جنابِ حرؓ کے مقدر کا اَوج کیا کہنا
حقیر ذرّہ کو سُورج بنا دیا تو نے

وہ بھید جس کو نہ سمجھی کبھی نگاہِ خرد
شہید ہو کے جہاں کو بتا دیا تو نے

مِری نِگاہ میں جچتی نہیں شہنشاہی
نہ جانے کونسا عالم دکھا دیا تو نے

عیاں زمانہ میں پھر کربلا کی صُورت ہے،
خُدا کے واسطے پھر آ تری ضرورت ہے

---

[1] زبان کے اِس تصرف پر مجھے معاف فرمایا جائے۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

ڈائری

پندرہ دسمبر ۱۹۴۳ء کی رات کو کلکتہ اکسپریس کیول جنکشن میں ٹھیری۔ جلد کو چھید کر ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سرد ہوا چل رہی تھی میں لوپ کی گاڑی سے اُتر کر اکسپریس میں سوار ہوا۔ مجھے دہلی جانا تھا۔ اِسٹیشن میں گرم چاء کی بڑی مانگ تھی اور یہ مانگ اِس قدر بڑھ گئی تھی کہ چاء والا اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا اور یہ فیصلہ نہ کر سکتا تھا کہ کس کو چاء دے اور کس کو نہ دے۔ وہ گھبراہٹ میں کسی کو بغیر شکر کی چاء دے رہا تھا اور کسی کو بغیر دودھ کے۔ سردی سے پریشان اور ٹھٹھرے ہوئے مسافر چاء والے کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور اس کی چاء کو زمین پر پھینک کر اسٹیشن ماسٹر کو آواز دے رہے تھے۔ میں نے بھی ٹھنڈی اور پھیکی چاء کی ایک پیالی پی کر بادل نخواستہ چاء والے کو پیسے دیئے اور اپنے ڈبہ میں آکر بیٹھ گیا۔

میرے ڈبہ میں اور تین صاحبان تھے ایک مارواڑی، نہایت لحیم و شحیم اور بڑی بڑی مونچھوں والا۔ یہ پوریاں لیکر کھا رہا تھا اور رہ رہ کر ڈکار رہا تھا۔ دوسرے صاحب بنگالی بابو مع اپنی اہلیہ اور پانچ بچوں کے تھے۔ سب سے چھوٹا بچہ ماں کے کھلے ہوئے پستان سے لپٹا ہوا دودھ بہ آواز بلند پی رہا تھا باقی بچے یا سو رہے تھے یا رو رہے تھے۔ بنگالی پستہ قد اور دبلا تھا۔ اس کے چہرہ کی تمام ہڈیاں نوکیلی اور اُبھری ہوئی تھیں اس کے سر کے بال گر کر قریب قریب ختم ہو چکے تھے۔ اس کے چہرہ پیشانی، اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور جھریاں تھیں، یہ شاید کسی دفتر کا کلرک تھا۔

تیسرے صاحب جو مجھ سے بہت قریب تھے میانہ قد کے سانولے آدمی تھے۔ اُن کی مونچھیں نہ اتنی بڑی اور نہ چھوٹی تھیں اور داڑھی کے بال گھنے اور موٹے تھے جو کئی دن سے مونڈے نہ گئے تھے۔ سر کے بال اُلجھے ہوئے تھے اور اُن کا کافی حصہ سفید ہو چکا تھا۔ اُن کی آنکھیں غیر معمولی حد تک بڑی تھیں اور اُن کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی گہرے خیال میں کھوئی ہوئی ہیں۔ اُن کے کپڑے قیمتی سرج کے تھے مگر ان کو گرم لوہے کی سخت ضرورت تھی اس لئے کہ ان پر گہری شکنیں اور سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ یہ حضرت اپنے لباس کی طرف سے بہت زیادہ غافل نظر آ رہے تھے ان کی ٹائی کی گرہ بھی ڈھیلی پڑی تھی۔ یہ آرام سے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور کوئی کتاب غور سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے پاس ہی ایک سرخ رنگ کی کتاب رکھی ہوئی تھی۔ جس کو وہ اکثر کھولکر دیکھتے تھے اور کچھ نوٹ کر لیتے تھے۔

گاڑی چلی، میں نے اپنا بستر درست کیا اور لیٹ کر ایک ناول پڑھنے لگا۔ کیے بعد دیگرے اِسٹیشنوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا کہیں ہماری

گاڑی رکی اور کہیں نہ رکی۔ مجھے خبر نہیں کب مگر تھوڑی دیر بعد ہی نیند آگئی۔ صبح لوگوں کے اژدحام سے اور سودے والوں کی چیخ پکار سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ دیکھا مارواڑی پڑا سو رہا ہے، بنگالن کا بچہ اس کی کھلی ہوئی چھاتی سے بدستور بہ آواز بلند دودھ پی رہا ہے اور وہ خود اِس طرح نیند میں مدہوش پڑی ہے کہ اس کی ٹانگیں آدھی سے زیادہ ننگی ہیں۔ وہ تیسرے صاحب جو مجھ سے قریب بیٹھے تھے اُن کا کوئی پتہ نہ تھا۔

اُن کی خالی نشست پر وہ سرخ کتاب اَب تک رکھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے خیال کیا کہ وہ شاید غسل خانہ میں ہیں۔ میں نے کوئی ایک گھنٹہ تک ان کا انتظار کیا، جب وہ نہ آئے تو ان کو غسل خانہ میں جاکر دیکھا۔ وہ وہاں بھی نہ تھے۔ وہ غالباً رات ہی کو کسی درمیانی اسٹیشن پر اتر چکے تھے۔ اَب مجھے خیال ہوا کہ ان کی اِس سرخ کتاب کو دیکھوں یہ ۱۹۳۵ء کی ڈائری تھی جس پر نام و پتہ کچھ بھی نہ تھا۔

کسی کی ڈائری اس کی اجازت کے بغیر پڑھنا نہایت بدتمیز حرکت ہے مگر اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں اس کو پڑھوں اور اس کے مضامین سے اگر ہو سکے تو ان کا پتہ چلاکر یہ ڈائری اُن کے پاس بھیج دوں۔ ڈائری کے مضامین سے اُن کا کوئی پتہ نہ چلا البتہ اُس کی ڈائری کے یہ تین خواب مجھے بڑے انوکھے معلوم ہوئے جن کو میں اِس لئے شائع کر رہا ہوں کہ اگر وہ صاحب کی نگاہ ان خوابوں پر پڑ جائے تو وہ مہربانی فرماکر اپنی ڈائری میرے پاس سے منگوالیں۔

۳ مارچ ۱۹۳۶ء بمبئی

کل کی رات بڑی تکلیف دہ رات تھی۔ تین بجے مسلسل کروٹیں بدلنے کے بعد محض تھوڑی دیر کے لئے آنکھ لگ گئی ایک عجیب خواب دیکھا وہ یہ کہ تاریک رات ہے اور آسمان سڑکر متعفن اور زردی مائل سبز ہوگیا جس میں بھدے چپٹے اور بغیر کرنوں والے تارے آویزاں ہیں۔ ہر تارہ سیاہ دھبے کی طرح دکھائی دے رہا ہے جیسے چیچک کے مرجھائے ہوئے سوکھے دانے ہوں۔ اِتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان کے ایک کونے سے سرخ بجلی کی چنگاریاں آہستہ آہستہ سانپ کی طرح بل کھاکر بڑھنے لگیں اور بھدے اور بھدے تارہ کو ایک ایک کرکے ڈسنے لگیں۔ یہ چنگاریاں جس تارے کو چھولیتیں وہ بغیر کسی آواز کے پھول کر پھٹ جاتا تھا اور شق شدہ ستارہ کی جگہ پر سیاہ دھواں کی چھوٹی سی گیند بن جاتی جو بتدریج ہوا میں مل کر غائب ہو جاتی۔

اِس طرح آسمان کے تمام تارے یکے بعد پھٹ کر گل ہوگئے اور بلا کی تاریکی ارض و سما میں چھاگئی اس کے بعد فوراً آسمان بلند ہوکر پھول گیا اور بڑی کرخت آواز سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ اس کے ریزے روئی کے گالوں کی طرح مجھ پر گرنے لگے۔ اِن ریزوں میں شاید کچھ لوہے کے چورے بھی ملے تھے جو میرے جسم پر گر کر چبھنے لگے۔ میری نیند کھل گئی، میں درود پڑھتا اٹھ بیٹھا۔

۲۷ اگست ۱۹۳۸ء

تمام دن کی مصروفیتوں سے سارا جسم تھک کے چور ہوگیا تھا۔ کھانا کھاکر دس بجے سوگیا۔ خواب دیکھا کہ لق و دق میدان ہے جو سفید چمکیلی برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ منتہائے نظر تک چٹیل میدان ہے جس میں درخت، انسان یا جانور کا نام و نشان تک نہیں میدان میں کہیں کہیں لکڑی کا کوئی کھمبا برف سے باہر نکلا ہوا ہے اور یہ ابھرے کھمبے اس میدان کی اُس زردی سے پگڈنڈی کو واضح کر رہے ہیں جو پیچ و خم کھاتی دور تک چلی گئی ہے۔ اِس پگڈنڈی پر سیاہ بوٹوں کا ایک جوڑا خراماں خراماں چلا جا رہا ہے۔

۱۹ اکتوبر ۱۹۴۲ء

کل کی رات میری زندگی کی ایسی رات تھی جسکے

خیال سے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں اور بڑی مشکلوں کے بعد جنگل سے باہر نکلا تو ایک کشادہ دامن کوہ نظر آیا۔ اس میں کچھ دور چل کر دو ٹیلے نظر آئے۔ میں اُن ٹیلوں کے قریب پہونچا تو یہ دفعتاً عورت کے دو پستان بن گئے اور اُن کے درمیان ایک سیاہ چہرہ نمودار ہوا جس میں آنکھوں کے بدلے دو چاند تھے، سفید اور تاریک۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اس عورت کے دونوں رانوں کے بیچ ہوں اور میرے سامنے ایک نہایت گہری وادی ہے جو بڑی قوت سے مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے ....

میری آنکھیں کھل گئیں، میں درود پڑھتا اٹھ بیٹھا ایک نامعلوم خوف سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔

۲۰ر نومبر ۱۹۴۲ء

۱۹ر اکتوبر کے خواب کے بعد سے میرے بال قبل از وقت بڑی تیزی سے سفید ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر چند دعا، تعویذ علاج معالجہ کیا مگر نہ تو وحشت میں کمی ہوتی ہے اور نہ بالوں کا سفید ہونا بند ہوتا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

جمیل کلیمی احمد آباد

عرفانِ انسانیت

آلامِ زندگی سے گریزاں نہیں ہوں میں
ہمت ہو جسکی پست وہ اِنساں نہیں ہوں میں

معراجِ اِرتقائے بشر پوچھتے ہو کیا
نا آشنائے منزلِ عرفاں نہیں ہوں میں

معلوم ہے سب حقیقتِ انسانیت مجھے
یہ کیا کہا کہ محرمِ اِنساں نہیں ہوں میں

جبریل جانتے ہیں مری عظمتوں کا راز
لیکن یہ بات ہے کہ نمایاں نہیں ہوں میں

سالک ہوں راہِ عشق کا عارف ہوں حسن کا
نظارۂ جمال سے حیراں نہیں ہوں میں

کیوں چھپ رہے ہو لالہ و گل کے حجاب میں
کیا رازدارِ اہلِ گلستاں نہیں ہوں میں

گو بڑھ گئیں حیاتِ غمِ دل کی الجھنیں
پھر بھی اِن الجھنوں سے ہراساں نہیں ہوں میں

ہے یاد مجھکو اوّل و آخر کی داستاں
آئینہ دارِ خوابِ پریشاں نہیں ہوں میں

آئے بہار کیفِ بہاراں لئے ہوئے
آزاد ہوں مقیدِ زنداں نہیں ہوں میں

آ ہی گیا جمیل مری زندگی کا چاند
تاریکیوں سے کہدو ہراساں نہیں ہوں میں

آغا سرخوش قزلباش

غزل

سکونِ مستقل اک سعیِ لاحاصل نہ بن جائے
تری قربت بھی اب وجہِ شکستِ دل نہ بن جائے

یہ دردِ عشق بڑھتے بڑھتے روحِ دل نہ بن جائے
مآلِ آرزو، تقدیرِ مستقبل نہ بن جائے

لرز اٹھتا ہوں یوں اکثر ترے الطافِ پیہم پر
کہیں اب یہ نظر میرے لئے قاتل نہ بن جائے

شکستہ خاطروں پر اب نہ فرما لطف کی نظریں
یہ ویرانی کہیں امید کی محفل نہ بن جائے

مری مجبوریوں پر ہنسنے والے کیا تعجب ہے
تری حالت بھی اک دن عبرتِ محفل نہ بن جائے

اجیرن ہو نہ جائے سانس بھی لینا کہیں سرخوش
یہ ان سے سرسری ملنا مذاقِ دل نہ بن جائے

آدیب مالیگانوی

کیفیات

نگاہیں چرانے کو جی چاہتا ہے
کسی کے ستانے کو جی چاہتا ہے

رہے یوں تو کھلنے سے اسرارِ ہستی
کہیں دل لگانے کو جی چاہتا ہے

ابھی آس ٹوٹی نہیں ہے خوشی کی
ابھی غم اٹھانے کو جی چاہتا ہے

تبسم ہو جس میں "نئی زندگی" کا
وہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

یہ کیا انقلابِ طبیعت ہے یارب
کہ ہر شئے پہ چھانے کو جی چاہتا ہے

نہ شک ان کی محبت میں کافر کو لیکن
ذرا آزمانے کو جی چاہتا ہے

جسے اپنے ہاتھوں سے پھونکا تھا ہم نے
اسی آشیانے کو جی چاہتا ہے

تمنا کسی طرح تو سرخرو ہو
لہو میں نہانے کو جی چاہتا ہے

جہاں تک نہ پہنچے ہوائے زمانہ
آدیب اس زمانے کو جی چاہتا ہے

اصغر حسین خاں
نظیر لودھیانوی

ہمالہ

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
عرصۂ آفاق میں ہے تو ستونِ آسماں
عالمِ امکاں میں روشن ہے ترا نام بلند
ہے دیارِ ماہ تک بالا تری بام بلند
کس سے مخفی ہے فلک پر شانِ سلطانی تری
چوم لیتے ہیں فرشتے جھک کے پیشانی تری
دوش پر تھامے ہوئے ہو ایک بحرِ بے خروش
سینکڑوں صدیوں سے تیری چوٹیاں ہیں برف پوش
خوب ازبر ہے تجھے عہدِ کہن کی داستاں
ہو ہزاروں سال سے تو اس زمیں کا پاسباں
تیرے پربت پر ابھی تک صد جہاں خوابیدہ ہیں
تیرے دامن میں ہزاروں جنتیں پوشیدہ ہیں
تیری گنگا سے ہمارا گلستاں جانِ بہار
تیری جمنا سے بہشتِ آرا ہمارا لالہ زار
لعل و مروارید کے مخزن ترے سینے میں ہیں
کتنے حیرت ناک جلوے تیرے آئینے میں ہیں
گردشِ گردوں سے چھن سکتا نہیں تیرا جلال
آ نہیں سکتا تری دولت کو صدیوں تک زوال
کانِ پُر زر ہے حرم ہے آئینہ رحمت ہے تو
ہاں ہمارے واسطے سب سے بڑی دولت ہے تو

ارشد تھانوی

غزل

ویراں ہی تھا گھر میرا جو ویراں نہ ہوا تھا
میں معتکفِ گوشۂ زنداں نہ ہوا تھا
اب دل میں کھٹکتا ہے باندازۂ حسرت
وہ تیر جو پیوستِ رگِ جاں نہ ہوا تھا
وہ میری گرانمایگیِ عشق کی نازش
اے حسن ترا جلوہ جب ارزاں نہ ہوا تھا
یک قطرۂ خوں ختم ہوئی دل کی بضاعت
دامن ابھی ہم رنگِ گلستاں نہ ہوا تھا
خوش ہو نہ سکا شکرِ جفا پر وہ ستمگر
میں اپنی وفاؤں سے پشیماں نہ ہوا تھا
دل پر ترا احسان ہے اے داغِ محبت
روشن یہ چراغ تہِ داماں نہ ہوا تھا
میرے دلِ خوں گشتہ کی وہ جنس نہ ٹھہرا
قطرہ جو متاعِ سرِ مژگاں نہ ہوا تھا
کانٹوں سے بنا تار رہا دامن کو گریباں
دیوانہ رقیبِ سروساماں نہ ہوا تھا
وہ شکوۂ بیجا میرے ہر شکوے کو سمجھے
چہرہ سے نمایاں غمِ پنہاں نہ ہوا تھا
دل میں ابھر آیا ہے وہی بن کے سویدا
جو شعلۂ محبت کا فروزاں نہ ہوا تھا
دشمن بھی میرے عشق کی غیرت کا ہے شاہد
میں دوست کا شرمندۂ احساں نہ ہوا تھا
میرے لئے محفوظ کیا کلکِ قضا نے
وہ عقدۂ دشوار جو آساں نہ ہوا تھا
تھی صبحِ قیامت کی تمنا مجھے ارشد
اندازۂ طولِ شبِ ہجراں نہ ہوا تھا

اِدارۂ اِشاعت اُردو کی کتابیں

کتاب	مصنف	روپیہ	آنے	پائی
کروٹیں	قدوس صہبائی	۲	۱۲	۰
قِصص و مسائل	مولانا عبدالماجد دریا بادی	۱	۸	۰
ضربیں	قیسی رام پُوری	۳	۰	۰
زَلزلے	قدوس صہبائی	۲	۱۲	۰
انگڑائیاں	احمد ندیم قاسمی	۳	۴	۰
سَیلاب	احمد ندیم قاسمی	۳	۸	۰
زندگی کی ٹھوکریں	رئیس احمد جعفری	۳	۴	۰
کردار	ماہر القادری	۲	۴	۰
رنگین سُپنے	کوثر چاندپوری	۲	۱۲	۰
تقدیریں	منظور بخاری	۱	۰	۰
ہٹلر کا نیا نظام	اِمتیاز حسین۔ بی۔ کام	۰	۱۰	۰
خدا اور کائنات	ماہر القادری	۰	۹	۰
شادی و محبت	مقصودہ فرحت	۰	۱۲	۰
تذکرۂ یورپ میں شعرا، اُردو	محمد سردار علی	۰	۱۲	۰
پریم پجارن	قدوس صہبائی	۰	۱۴	۰
سیاروں پر زندگی کے اِمکانات	محمد عبدالرحمٰن	۰	۹	۰
بخارا کا جمہوری انقلاب		۰	۹	۰
ترکستانی خاتون شاہراہِ انقلاب پر		۰	۹	۰
مَرد اِنقلاب (شہزادہ کروپاٹکن کے حالات)		۰	۱۲	۰



پولیٹیکل ڈکشنری

مرتبہ

جناب سید عبدالقدوس ہاشمی

عظیم الشان سیاسی لغت جدید ترین معلومات کا مخزن

جس میں

سیاسی اصطلاحات، سیاسی معاہدات، سیاسی اشخاص، سیاسی مقامات
بین الاقوامی معاملات، اور چھوٹی بڑی تمام حکومتوں کے حالات، انکی تاریخ
اور اُن کے سیاسی موقف کو عام فہم اور دلکش انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔

کتاب حروف تہجی پر مرتب ہے اور مشہور سیاسی عالم مولٰنا

عبدالقدوس ہاشمی

کی ڈیڑھ سالہ محنت شاقہ کا نتیجہ ہے

مجلد قیمت (عہ)

سید عبدالرزاق پروپرائٹر اعظم اسٹیم پریس
اعظم بلڈنگ حیدرآباد دکن